"ادبیات پونچھ"
نقشہ ریاست پونچھ
گنگا چوٹی
تحصیل باغ
نالہ ماہل
حویلی
تحصیل پونچھ
ریاست کشمیر
تحصیل مینڈر
تحصیل سدھنی
تھکیالہ
پراوہ
راجوری
دریائے پونچھ
ضلع ہزارہ
دریائے جہلم
کوہ مری
محمد ایوب شبنم

Ghulam Nabi Azad
Chief Minister
Jammu & Kashmir

پیغام

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ ضلع پونچھ کی ادبی تنظیم "کرشن چندر میموریل بزمِ ادب" اپنے زیرِ اہتمام "ادبیاتِ پونچھ" کی تاریخی دستاویز شائع کرا رہی ہے۔

پونچھ کی مردم خیز سرزمین سے بہت سارے عالموں، عابدوں، ادیبوں اور شاعروں نے جنم لیا ہے۔ ادیبوں میں سرِفہرست برصغیر کے نامور افسانہ نگار آنجہانی کرشن چندر ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ پونچھ کے اُدبا کی تخلیقات کو یکجا کر کے طبع کرانے کی یہ کاوش ہماری آئندہ نسلوں کے لئے ایک بیش قیمت ورثہ بھی ہوگی اور مشعلِ راہ بھی۔

میں اِس کوشش کی کامیابی کیلئے دُعاگو ہوں۔

غلام نبی آزاد

(غلام نبی آزاد)

تاثرات

مجھے یہ جان کر نہایت ہی مسرت ہوئی کہ جناب محمد ایوب شبنمؔ، سیاسی و سماجی خدمات کرنے کے علاوہ، ادبی کام میں بھی مصروف رہے ہیں۔ قبل ازیں انہوں نے ہفت روزہ ''ستاروں سے آگے'' کا اجرا کر کے عوام الناس کی بے حد خدمت کی ہے۔ اب ان کی عرصہ طویل کی محنتِ شاقہ کا ثمرہ ''ادبیاتِ پونچھ'' کے روپ میں منظرِ عام پر آرہا ہے۔ جو کہ پونچھ کے ادب و ثقافت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ شبنمؔ صاحب نے پونچھ کے ہر طبقہ کی زبان و ادب کو ملحوظِ خاطر رکھ کر اس کی آبیاری کی ہے۔ ان کا یہ ادبی کارنامہ جہاں ادب کی دنیا میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں پر اُمیدِ واثق ہے کہ آنے والی نسلوں کو نئی جہتوں کا سُراغ بھی مہیا کرے گا۔

؎ بارہا سُورج پہ ہوتا ہے گھٹاؤں کا ہجوم
اور پھر بھی دِن کی تابانی فنا ہوتی نہیں

میں اُمید کرتا ہوں کہ شبنمؔ صاحب اپنے دائرۂ تصنیف کو وسعت دے کر مقامی زبانوں کو بھی شامل کر کے اپنا نام ادبی دنیا میں روشن کریں گے۔ کیونکہ ان کے پاس قدرت کی دی ہوئی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ شبنمؔ صاحب کا یہ ادبی کارنامہ قابلِ تحسین بھی ہے اور قابلِ فخر بھی۔

میں اِن کو اپنے دل کی عمیق گہرائیوں سے مُبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فنِ ادب کی طرف مزید توجہ دینے کی صلاحیت عطا فرمائے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

چودھری محمد اسلم لسانوی

(ممبر پارلیمنٹ، راجیہ سبھا)

تاثرات

یہ جان کر نہایت مسرت ہوئی کہ آپ ''ادبیاتِ پونچھ'' سے متعلق ایک مکمل جائزہ کتابی صورت میں منظرِ عام پر لانے جا رہے ہیں۔

آپ نے پہلے بھی ''ستاروں سے آگے'' کی وساطت سے اپنے علاقے کی ادبی وسماجی خدمات تہہِ دل سے سرانجام دی ہیں۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ آپ کی اس کاوش کی بھی پوری پوری پذیرائی ہوگی۔

علاقہ پونچھ اُردو کے ادبی منظرنامے پر ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ کرشن چندر، ٹھاکر پونچھی، مہندر ناتھ اور چراغ حسن حسرتؔ، جیسے نام پونچھ سے جُڑے ہوئے ہیں۔ موجودہ دور میں بھی پونچھ سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ زبان وادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

آپ اس مبارک کام کے لئے ڈھیر ساری دعاؤں کے حقدار ہیں۔

''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ''

پرتپال سنگھ بیتابؔ
(آئی اے ایس)

نقشہ سابقہ ریاست پونچھ
گنگا چوٹی
کویٹر گلی
ضلع ہزارہ
تحصیل باغ
نالہ ماہل
دریائے جہلم
کوہ مری
تحصیل سدھنی
حویلی
تحصیل پونچھ
ریاست کشمیر
تحصیل مینڈر
تھکیالہ پڑاوہ
راجوری
دریائے پونچھ
تحصیل کوٹلی
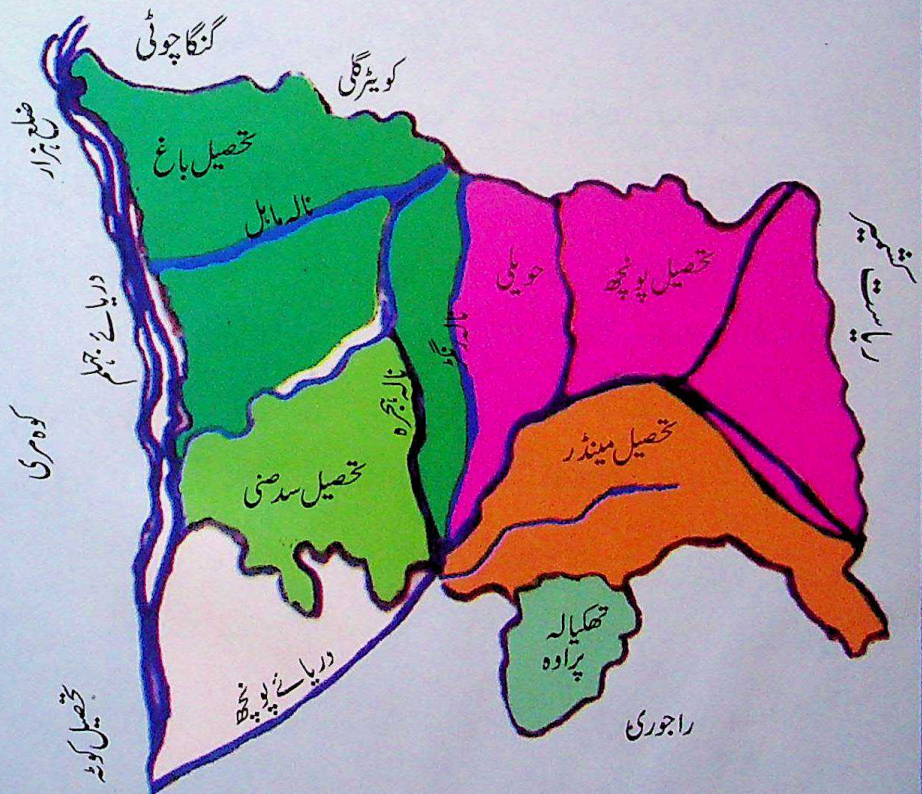
وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

ٹھاکر پونچھی

کرشن چندر

چراغ حسن حسرت

مہندر ناتھ

دیانند کپور

مالک رام آنند
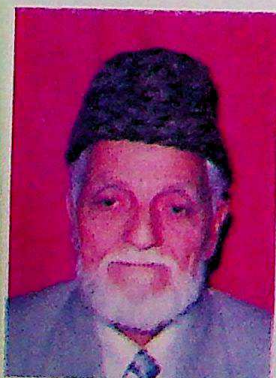
بشارت جاذب

سرون ناتھ آفتاب

محمد دین باڈے

عنایت تنویر

دینا ناتھ رفیق

سرلا دیوی

مسعود الحسن مسعود

کہکشان پونچھ

پرتپال سنگھ بیتاب

ڈاکٹر لیاقت جعفری

شیخ خالد کرار

آنند لہر
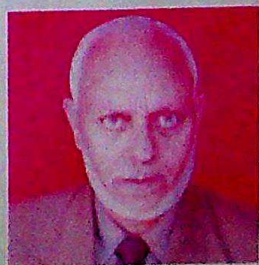
محمد ایوب شبنم

ڈاکٹر جاوید راہی

کے ڈی مینی

عبدالغنی جاگل

ایم۔ این قریشی

بلراج کمار بخشی | ڈاکٹر فاروق مغل پرواز | محمود الحسن محمود

غلام نبی شہبازؔ | امتیاز نسیم ھاشمی | حسام الدین بیتاب

رشید فداؔ | نذیر قریشی | خورشید کرمانی

لیاقت نیّرؔ | علمدار حسین عدمؔ | انور خان

مختار الدین ظہیر

پردیپ کھنہ

ٹھاکر مدن سنگھ

احتشام بٹ

مستور شاد

پرویز مانوس
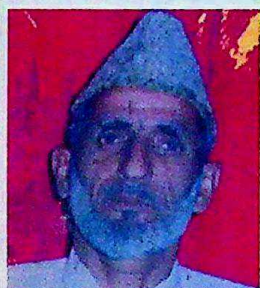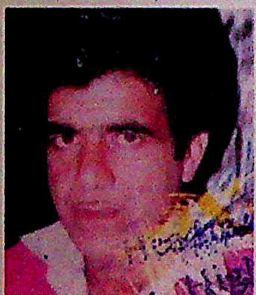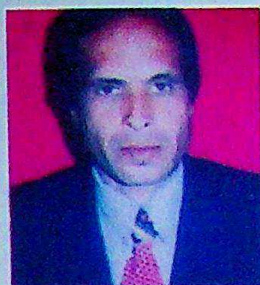
بشیر بٹ

راجگانِ ریاست پونچھ

حصہ اوّل

ادبیاتِ پونچھ

ترتیب و تدوین

محمد ایوب شبنم

Adabiyaat-e-Poonch

(Part one)

By:

Mohammed Ayoub Shabnam

نام کتاب : ''ادبیات پونچھ''

مرتب : محمد ایوب شبنم

کمپیوٹر کمپوزنگ : الحمراء گرافکس اینڈ پبلی کیشنز، اقبال نگر، سرنکوٹ

سنہ اشاعت : ۲۰۰۶ء

قیمت : چار صد روپے (-/400)

سرورق : الحمراء گرافکس

طباعت : جے کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی

ناشر : کرشن چندر میموریل بزم ادب (رجسٹرڈ)

(رجسٹریشن نمبر 396/S/1978)

صدر دفتر نزد جامع

مسجد، سرنکوٹ 185121 پونچھ (جموں و کشمیر)

Published By:

KRISHAN CHANDER MEMORIAL

BAZAM-E-ADABM (Regd)

Regd,office,Near Jamia Masjid,Surankote-185121,Poonch(J&K)

Ph:01965/230044.Mobile:9419675572

☆ بیٹی

شبانہ کے نام

جو میرے ادبی اثاثے کی وارث و امین ہے

☆ عظیم اُردو' زبان

اور

☆ سرزمین پونچھ کے سرمایۂ افتخار

ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں

کے نام!!

☆ محمد ایوب شبنم

"اِنَّ من البیان سحراً و اِنَّ من الشعرِ حکماً"

بعض اسلوب جادو بیانی اور بعض اشعار حکمت ودانائی کا خزانہ ہوتے ہیں......(بخاری)

فہرس

☆☆☆

حمد باری تعالیٰ

تحسین جعفری

تری ذات پاک ہے اے خدا، تری شان جل جلالہٗ
ترا نام خالقِ دوسرا، تیری شان جل جلالہٗ
تو رحیم ہے، تو کریم ہے، تو علیم ہے، تو عظیم ہے
تری ذات فہم سے ماوریٰ تری شان جل جلالہٗ
ترے جلوے عرش سے فرش تک، مہ و مہر میں ہے تری جھلک
تری، ابتدا ہے، نہ انتہا، تری شان جل جلالہٗ
ترا چرچا دہر میں چار سُو، ترا ذکر شہر میں کُو بہ کُو
ہو بیان کس سے تری ثنا، تری شان جل جلالہٗ
ترا خوان نعمتِ عام ہے، ترا فیض فیضِ دوام ہے
ترا شکر ہم سے ہو کیا ادا، تری شان جل جلالہٗ
تری نعمتوں کا شمار کیا، تو ہے بے نیاز اے کبریا
ترا جود، تیرا کرم، عطا، تری شان جل جلالہٗ
تو علیم ہے، خبیر ہے، تو سمیع ہے، تو بصیر ہے
تو ہے بے نواؤں کا آسرا، تری شان جل جلالہٗ
تری ذات ہی کو ثبات ہے، تری ذات عین حیات ہے
تو ہے عقل و فہم سے ماوریٰ، تری شان جل جلالہٗ

نعت سرورِ کائناتؐ

عبدالغنی جاگل

اُنہیں خورشید میں تنویر تاروں میں ضیا لکھوں
حسین و شوخ ہفت اقلیم کی اُجلی قبا لکھوں
کبھی تو مہر و ماہ لکھوں، کبھی ارض و سما لکھوں
اُنہیں کو نو بہارِ حُسن کی مہکی فضا لکھوں
میں بحرِ نور و عنبر میں ڈبو کر یہ قلم اپنا
شمیمِ جانفزا کی موج پر صلِ علیٰ لکھوں
زباں خاموش ہے میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا
اُنہی کو ابتدا لکھوں، اُنہی کو انتہا لکھوں
اُنہیں سے پاک تشکیلیں اُنہیں پہ نیک تکمیلیں
اُنہیں عالی علا لکھوں اُنہیں باقی بقا لکھوں
غنیؔ تنہائیوں میں جب تصور باندھتا ہوں میں
محمدؐ کے سوا ہرگز نہ کوئی دوسرا لکھوں

(۲) تاثرات

شبنم اور میں ہم عمر ہیں اور تعلیمی سفر بھی ہم نے ایک ساتھ شروع کیا۔ میں طبعاً نرم اور صلح کن نظریات میں یقین رکھتا تھا، جبکہ شبنم اپنے تخلص کے برعکس تیز وطرار، تند مزاج اور تلخ گفتار تھا۔ متضاد تشخص اور نظریات کے باوجود بھی ہم میں گہری چھنتی تھی۔ ایک اور متضاد پہلو ہماری شخصیات کا یہ بھی تھا کہ مجھے ادب سے لگاؤ اور 'ہاؤ' یا سیاست سے چڑ سی تھی جبکہ شبنم کو ادب سے زیادہ گپ شپ، بحث وتکرار اور سیاسی اُچھل کُود میں دلچسپی رہتی تھی۔ قدرت نے یا پھر حالات نے ہم دونوں کو مخالف سمتوں پر گامزن کر دیا۔ میں ایک اچھا ادیب اور شبنم ایک کامیاب سیاست دان بنتے بنتے رہ گئے۔ لیکن قدرت کو جو منظور ہو وہی دُرست ہوتا ہے۔ میں اپنی تساہل پسندانہ طبیعت کے باعث کبھی بھی کامیاب ادیب بن کر وہ سب کچھ نہ دے سکتا جو شبنم اپنی لگن اور محنت سے ادبیاتِ پونچھ کی شکل میں آپ کو دے رہا ہے۔

یہ تو مورخ ہی بتائے گا کہ میں بہ حیثیت سیاست دان کتنا کامیاب رہا لیکن شبنم کے لئے آج برملا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے قلم کی پختگی نے اُسے ریاست کے نامور ادیبوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

ادبیاتِ پونچھ کے حوالے سے میں صرف اتنا کہوں گا کہ ادبی شخصیات اور ادب قومی سرمایہ ہوتا ہے اس کے ساتھ سب سے بڑا انصاف اس کو منظرِ عام پر لانا ہے۔ تاکہ آنے والی نسلوں کا اپنے اجداد اور ان کے کام سے سلسلہ منقطع نہ ہو۔

میں ہر اُس شخص کو سلام کرتا ہوں جو اپنے بزرگوں کے کام اور نام کو محفوظ کرتا ہے۔ شبنم ادبیاتِ پونچھ کو مرتب کر کے بلاشبہ اس سلام کا حقدار ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

سید مشتاق احمد شاہ بخاری

ایم ایل اے، سرنکوٹ، پُونچھ

(٤) تاثرات

ایوب شبنم صاحب سے جب بھی ملاقات ہوئی کسی نہ کسی علمی یا ادبی موضوع پر بات چیت ہوئی۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ ادھر اُدھر کی بے مقصد بات چیت میں اپنا وقت ضائع کرتے ہوں۔ انہیں علمی اور ادبی مضامین لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ اُردو ہفت روزہ ''ستاروں سے آگے'' کے ایڈیٹر بھی ہیں۔

انسانی تاریخ میں بڑے بڑے نام یکمشت گُم ہو گئے، کہیں کھنڈر باقی ہیں اور کہیں نشان بھی نہیں ملتے۔ پونچھ میں ہزار ہا شعراء، اور ادیب پیدا ہوئے جن کا اب نہ کوئی نام جانتا ہے اور نہ ان کے کلام کا نمونہ ملتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایوب شبنم صاحب کی تصنیف ''ادبیاتِ پونچھ''، پونچھ کے ان عظیم ادیبوں کے ساتھ انصاف کرے گی جنہوں نے ادب کے لئے ایک زمانہ وقف کیا، ادب کی خدمت کی مگر کوئی ان کا نام لیوا نہیں رہا۔ اصل میں کسی بھی ادب کی جڑ اس کے لوک ادب میں ہوتی ہے۔ لوک ادب جتنا گہرا ہوتا ہے اس کا ادب اتنا ہی وسیع ہوتا ہے۔ اور یہی ادب اس کے تمدن کی صحیح تاریخ مرتب کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

ایوب شبنم صاحب کی کتاب ''ادبیاتِ پونچھ'' اصل میں پونچھ کی ادبی تاریخ میں ایک نیا شاہکار ثابت ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ سرزمینِ پونچھ نے بہت ہی عظیم شخصیات کو جنم دیا۔ جن کو تاریخ کے حوالے سے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

ؔسب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں (غالبؔ)

جو قوم اپنا ماضی بھول جاتی ہے وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ زندہ قومیں اپنے بزرگوں کو کبھی نہیں بھولتیں۔ ایوب شبنم صاحب یہی مشن لے کر چل رہے ہیں۔ اللہ کرے سرزمین پونچھ میں بہت سے ایوب شبنم پیدا ہوں جو اس نیک فریضہ کو سرانجام دیں۔

جاوید احمد رانا

ایم ایل اے، مہنڈر، پونچھ

(۳) تاثرات

پونچھ کے ادبی منظرنامے میں ایوب شبنم کا نام ایک ایسے درخشندہ ستارے کی مانند ہے۔ جس کی لو سے آس پاس کے راستوں کی شناخت ہوتی ہے۔ شبنم ایک ہمہ گیر اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت ادیب، سیاست کار، سماجی کارکن، مفکر اور شعلہ بیان مقرر ہیں۔ اُن کی پرت پرت شخصیت کے اندر کئی شبنمی قطاریں ہیں۔ لیکن اُن کا ادبی رجحان اُنہیں ایک ایسے راستے پر لے آیا ہے جو تصنع، فریب کاری اور جھوٹ سے پاک ہے۔ جہاں صرف تفکر، ایمانداری اور دیانت داری ہے۔ انہوں نے کرشن چندر، چراغ حسن حسرتؔ سے لے کر آج تک کے، بھولے، بسرے اور بکھرے ہوئے پونچھ کے فنکاروں اور ادیبوں کو ورق ورق تلاش کر کے ایک عظیم، متبرک اور ناقابل فراموش کام کیا ہے۔

ادبیاتِ پونچھ ایوب شبنم صاحب کی ادبی زندگی میں ایک بڑا کام ہوگا۔ میں اپنی نیک تمناؤں کے ساتھ انہیں دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

غلام محمد جان

ایم۔ ایل اے، حویلی۔ پونچھ

(۵) تاثرات

افلاطون نے ایک رہنما کے لئے جو اوصاف طے کیے ہیں۔ اُن میں اُس کا فلسفی اور مفکر ہونا بنیادی صفات ہیں۔ جناب محمد ایوب شبنم ،جنہیں میں جانتا ہوں ، افلاطون کے فرمودات کے عین مطابق ، بیک وقت ایک نیک دل رہنما، ایک زندہ دل فلسفی اور ایک سنجیدہ مفکر ہیں۔ میری ملاقات اُن سے ۱۹۸۷ء میں ہوئی تھی ،تب میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا اور ان ہی کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبار ''ستاروں سے آگے'' میں میری پہلی تخلیق شائع ہوئی تھی۔

میں محترم شبنم صاحب کو نہ صرف ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے جانتا ہوں بلکہ حقیقت میں وہ علم و ادب کی راہ پر چلنے والے ہزاروں راہرروؤں کے لئے ایک مینارۂ نُور ہیں۔ جس کی روشنی نے ہزاروں سینوں کو منور اور ہزاروں دلوں میں محبت کی شمعیں ضوفشاں کی ہیں۔

زیرِنظر کتاب **ادبیاتِ پونچھ** شبنم صاحب کی علم دوستی کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ کتاب پُونچھ کی علمی اور ادبی تاریخ کو محفوظ کرنے میں سنگِ میل ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر جاوید راہی

کلچرل آفیسر ،ایڈیٹر شیرازہ (گوجری)

جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

کنال روڈ جموں/ لال منڈی سرینگر

(٦) تاثرات

ادبیاتِ پونچھ کے مسودے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یقین مانئے میں دیکھتا ہی رہ گیا، سرنکوٹ میں اُردو ادب کے لئے اتنا معیاری کام کرنا اور پونچھ میں اُردو کے فروغ اور ارتقاء کے نئے سراغ ڈھونڈنا۔ ایل او سی کے آر پار بٹی ہوئی ریاست پونچھ میں اُردو ادیبوں کی نایاب تخلیقات کی بازیافت، پونچھ کو اُردو کے تناظر میں ایک تشخص عطا کرنا، شبنمؔ کا ہی خاصہ ہے، یہ کتاب آنے والی نسلوں کے لئے ایک مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ اور پونچھ میں اُردو کی جڑوں کو اور زیادہ مضبوط کرے گی۔ آج کے دور میں جب لوگ مادیّت کی نذر ہو چکے ہیں۔ یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوتی ہے۔ کہ محمد ایوب شبنمؔ جیسے لوگ بھی ہیں جو اقدار کی پاسبانی کر رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ یہ کتاب جلد منظرِ عام پر آئے تا کہ پونچھ کے گم گشتہ ادیبوں کی تخلیقات منظرِ عام پر آسکیں۔

کے ڈی مینی

(کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروسز، ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ انڈسٹریل آفیسر، پونچھ)

(۷) تاثرات

میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کا اور کون سا مقام ہو سکتا ہے کہ آپ میرے اُن عزیز دانشور، اہلِ قلم اور صاحب الرائے شاگردوں میں سے ہیں جنھوں نے کرشن چندر، چراغ الحسن حسرتؔ، دیانند کپور، اور ٹھاکر پونچھی جیسے عالمی شہرت یافتہ ادیبوں اور قلم کاروں کے ورثے کو سنبھالنے کی جسارت کی ہے۔ ایک زندہ دل افسانہ نگار، اور ایک صحافی کے طور تو آپ اپنا نام پہلے ہی پیدا کر چکے ہیں۔ ادبیاتِ پونچھ کے عنوان سے آپ نے جو ایک تحقیقی مجموعہ مرتب کیا ہے۔ وہ صرف آپ جیسے ہی ایک حوصلہ منداور ایک اہل الرائے کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ جبکہ سرنکوٹ جیسے مرکز سے دور علاقہ میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ کسی بھی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اور یہ کام کسی تیشۂ فرہاد کی مسلسل اور کارگر ضربات کی مجنونانہ کاوش سے کوئی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

بہر حال ضلع پونچھ کی ایک کامیاب ادبی تاریخ ترتیب دینے اور اسے اس اہتمام سے شائع کرنے کی سعی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ

''خدا کرے یہ زورِ قلم اور زیادہ''۔

حسام الدین بیتابؔ

(ایوارڈ یافتہ امتیازی اُستاد حکومتِ جموں و کشمیر)

۸) تاثرات

میرے لئے یہ خبر باعثِ صد افتخار ہے کہ آپ، میرے شاگردِ عزیز، ''کرشن چندر میموریل بزمِ ادب'' کے اہتمام سے ''ادبیاتِ پونچھ'' نکال کر تاریخ ادبیاتِ پونچھ مرتب کرنے کی کاوش کر رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کی ہمتوں میں اضافہ اور آپ کے جذبوں میں اخلاص پیدا کرے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ آپ کے پہلے افسانوی مجموعہ ''شاہین'' نے آپ کو بحیثیت ایک ادیب اور پچھلے تیس سال میں ''ستاروں سے آگے'' کے محض زندہ رہنے نے آپ کو ایک سخت جان۔ جگر سوز اور خود افروز صحافی کے طور پر متعارف کرادیا ہے۔ ادب سے آپ کے شغف اور کچھ کر گزرنے کے جذبۂ جنوں خیز سے قریبی واقفیت رکھنے کی بنا پر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ادب کے مورخ کے طور پر آپ، ورق ورق بکھری ہوئی تحریروں کی ترتیب۔ تدوین اور اشاعت سے نہ صرف متعارف کرانے کا کارنامہ انجام دیں گے بلکہ ان کو بقائے دوام بھی بخشیں گے۔

تاریخ ادبیات ہو کہ تاریخ ارتقائے انسانی' ایک مورخ جب پتھر کی سلوں اور کاغذ کے ٹکڑوں سے استفادہ کر کے حقائق کو یکجا کرتا ہے تو آنے والی نسلوں کے لئے متاعِ گراں مایہ کا اہتمام ہو جاتا ہے۔۔ لہذا ان کو یکجا کرنے کا یہ کارنامہ ملکی، ملی بلکہ بین الاقوامی سطح کی عظیم سعی ہوگی۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ سیاست کے غلاظت بھرے تالاب سے دور ہی رہیے۔ اسلئے کہ سیاست کے تالاب میں ریاکاری، حیلہ سازی اور شعبدہ بازی کا جال پھینکے بغیر مچھلی ہاتھ نہیں آتی۔ اور ایسا کرنا ایک خوددار انسان کا خاصا نہیں ہو سکتا۔ اس کیلئے چہرہ نوچنے اور دُم چاٹنے کی خوخصلت پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جس سے الاماں اور الحذر اس دعا کے ساتھ کہ آپ کو اللہ قدم قدم کامیابی اور کامرانی بخشے۔

نذیر قریشی

(ضلع ایجوکیشن پلاننگ آفیسر پونچھ، ریٹائرڈ)

''ادبیاتِ پونچھ'' مئولفہ: محمد ایوب شبنم ایک مثالیہ

ڈاکٹر لیاقت جعفری

ہمارے اس زرخیز ادبی علاقے میں ایک مُدت سے اس طرح کی کسی بھی عملی پیش رفت یا کوشش کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی، اگرچہ شعروادب کے تحرک کے پیش نظر ادبی گہما گہمی کی ہنگامہ خیزیاں گزرے کئی دہاکوں سے خطۂ پونچھ میں بالخصوص اور باقی قصبات میں بالعموم وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں۔ زیادہ شاعری کی صورت میں اور کبھی کبھی محافلِ غزل اور موسیقی کے حوالے سے لیکن ان تحاریک کی ایکReservation کی کسی بھی منصوبہ بند کاوش کا حوالہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا ہے۔

پُونچھ اور راجوری میں لکھے جارہے ادب کے حوالے سے میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وادی کے فوراً بعد ریاست کے صرف اسی خطے میں ایسی صحت مند روایت زندہ و تابندہ اسطور پر قائم و دائم ہے۔ خصوصاً پُونچھ شہر کا وسطی علاقہ اور راجوری کا بھروٹ تھنہ منڈی کا ایک مخصوص جغرافیائی خطہ حیرانگی کی حدوں تک مدتوں سے ایک تسلسل کے ساتھ صحت مند ادب کی تخلیق کا مرکز و منبع بنا ہوا ہے۔

ادھر چراغ حسن حسرتؔ، کرشن چندر اور ٹھا کر پونچھی کے فوراً بعد مدتوں تک علاقے کا ادبی اُفق، خصوصاً شعر کے حوالے سے جمود کا شکار نظر آتا ہے۔ لیکن تقریباً ہر ایک دہاکے کے بعد دینا ناتھ رفیقؔ، محمود الحسن محمودؔ، ومسعود الحسن مسعودؔ، شہبازؔ راجوروی، فاروق مضطرؔ، پرتپال سنگھ بیتابؔ، اور شیخ خالد کرارؔ کی صورت میں شعر کے حوالے سے پُر مغز تخلیقیت کا حوالہ بننے والے نام اُبھر کر سامنے آتے رہے ہیں۔ اگرچہ ان افراد میں بھی سوائے پرتپال سنگھ

بیتابؔ کے غالباً کسی شاعر نے اپنے فن کو کمالِ سنجیدگی کے ساتھ قبولنے اور برتنے میں تقریباً ہمیشہ ہی تساہل کا مظاہرہ کیا ہے۔

ادھر گزرے ایک دہاکے یا پانچ آٹھ برس کی بات کریں تو معجزاً اچانک، نہایت تیزی کے ساتھ پُونچھ اور راجوری کے تقریباً ہر خطے میں اچھی اور صحت مند شاعری کا ایک نیا دبستان کھلتا ہوا نظر آرہا ہے۔ پُونچھ، سرنکوٹ، منڈی، مہنڈر، بھروٹ، تھنہ منڈی، راجوری وغیرہ میں یکسر نئے لکھنے والوں کی ایک ایسی نسل منظر عام پر آنے لگی ہے جو اس بات کا پتہ دے رہی ہے کہ اگر اس عہد اور زمانے کو مناسب اور صحیح نمائندگی ملے تو مدتوں سے ٹھہری ہوئی اس جھیل کے پانی میں ارتعاش پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بقول شاہد کبیر۔

ہُنر نہ آیا ہمیں خود کو پیش کرنے کا

شمار ہو نہ سکے وقت کے ذہنوں میں

جناب محمد ایوب شبنم کی اس گراں قدر کوشش کو میں اس سلسلے میں اسی صورت دیکھتا ہوں، اُمید رکھتا ہوں کہ کائی سے اٹی اس جھیل میں اُن کی یہ کتاب ایک کنکر ہی ثابت نہ ہوگی بلکہ وہ آئندہ بھی اس تسلسل کو قائم رکھنے میں نہایت نیک نیتی اور سنجیدگی سے کام لیں گے انشاء اللہ۔

یہ ایک ابر کا ٹکرا کہاں کہاں برسے

تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

☆☆☆

محمد ایوب شبنم میری نظر میں

عبدالغنی جاگل

شبنم صاحب مجھ سے قریب ایک دہائی عمر میں بڑے ہیں۔ابھی تک نہ تو میں انہیں دوست کہنے کی جسارت کر سکا ہوں اور نہ ہی بزرگ البتہ میں انہیں اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں۔ بقول مرحوم جناب محمد دین بانڈے کیا وجہ تھی کہ جس نے انہیں شبنم تخلص کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں بھی قیاس ہی کرتا ہوں کہ انکا مزاج شریف گاہے شعلہ اور گاہے شبنم رہا ہوگا اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ شعلے کی گرمی کو وہ شبنم کی ٹھنڈک سے کم کرنے کی سعی کرتے ہوں، جوانی میں یہ جو بھی تھے بہر حال آج کل وہ شبنم زیادہ ہیں اور شعلہ کم۔

شبنم صاحب کی ذات سے متعلق کچھ عرصہ قبل میں نے ایک قطعہ لکھا تھا اسی سے مضمون کی ابتدا کرتا ہوں

ادب کے کارگر معمار شبنم — کسی شاعر کے ہیں شہ کار شبنم

حریفان سیاست کے لئے خوف — کڑکتی، صدق کی تلوار شبنم

ادیبوں کے قدرداں ہیں ازل سے — بڑے مشفق بڑے دلدار شبنم

کھری باتیں بجھاتے ہیں سبھی کو — علی الاعلان سر دربار شبنم

شبنم سُرن کی مُردم خیز وادی میں ۵ جون ۱۹۴۸ء کو پیدا ہوئے۔اس دوران ملک آزاد ہو چکا تھا لیکن معاشی بحران اور سیاسی خلفشار جیسے مسائل سر اٹھا رہے تھے۔شبنم صاحب کے والدِ ماجد مرحوم خواجہ قمر الدین لون بڑے رئیس اور فیاض شخصیت کے حامل تھے۔انکے دادا مرحوم خواجہ غلام قادر لون بھی بڑے صاحبِ نصاب، فیاض اور دانشور انسان تھے، مرحوم کی فیاضی کا یہ عالم تھا کہ اردگرد کے گاؤں میں جو بھی رحلت فرماتا اسے کفن کی تنگی نہ ہونے دیتے تھے علاوہ ازیں مجبور لوگوں کو محصولات اور تاوانات بھی مہیا کرتے، خدا مرحومین کی ارواح کو سکون

ابدی عطا کرے اور بخش دے۔

شبنم کی ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول سمہوٹ پھر ہائی اسکول سرنکوٹ اور ڈگری کالج پونچھ میں ہوئی۔ جناب شام لعل شرما، جناب حسام الدین بیتاب، اور نذیر حسین قریشی صاحب جیسے نامور اور باصلاحیت اساتذہ نے ان کی نوک پلک درست کی بے نام سے نامور کر دیا۔ بیتاب صاحب نے شبنم صاحب کو ادب کی طرف راغب کیا، اپنی سربراہی میں مقامی شعراء وادبا کی مدد سے بزم ادب سرنکوٹ تشکیل دے کر شبنم کو جنرل سیکریٹری کامیاب کیا۔ غالباً یہ بات ۱۹۷۲ء کے اوائل کی ہے جن دنوں شبنم صاحب کے لکھنے کا شوق پروان چڑھ رہا تھا بقول شاعر روشنی کی اشد ضرورت ہے/ ہر شرر آفتاب ہونے دو

۱۹۷۳ء میں جب آنجہانی کرشن چندر اپنی زندگی پر ڈاکیومنٹری فلم بنانے کی غرض سے پونچھ تشریف لائے تو شبنم صاحب نے ان کے اعزاز میں ایک ادبی نشست منعقد کی۔ اور اپنا افسانہ بعنوان ''میں کیا ہوں؟'' پڑھا جسے سن کر کرشن چندر بہت خوش ہوئے۔ وقت نے کروٹ لی تو ۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو کرشن چندر کے انتقال کے بعد شبنم صاحب کی رائے ثواب پر بزم ادب کا نام بدل کر کرشن چندر میموریل بزم ادب سرنکوٹ رکھا گیا۔ اسی دور میں شبنم صاحب صحت مند اور تعمیری سیاست کی جانب مائل ہو چکے تھے اور سماج کے پسماندہ طبقوں کی موثر آواز بن کر معاشی بدحالیوں، ناانصافیوں اور طبقاتی کشمکش کے خلاف نبرد آزما تھے۔

انکی شعلہ خیز تقاریر سننے کے لئے لوگ دور دور سے آکر جمع ہو جاتے۔ ۱۹۷۵ء کے آس پاس خود میں نے شبنم صاحب کی طبیعت کی جولانیوں کو دیکھا اور سنا، میں سچ کہہ رہا ہوں کہ شبنم صاحب پہلے مقرر تھے جنہیں میں نے سنا اور دوسروں کی طرح اُن سے سخت متاثر ہوا۔ میرا ابھی لڑکپن کا دور تھا، میرے اندر کا انسان انگڑائیاں لیتا تھا کہ کاش بڑا ہو کر میں بھی ایسی روح پرور تقاریر کر سکوں۔

اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کرتے ہوئے شبنم صاحب نے ایک ادبی اُردو ماہوار جریدہ بھی اجراء کیا جو بعد ازاں پندرہ روزہ اور پھر ہفت روزہ اخبار میں بدل دیا گیا جو ابھی تک رواں دواں ہے۔ اخبار کے نام کی مناسبت سے (ستاروں سے آگے) شبنم صاحب شاید علامہ اقبالؒ کی خودی کے فلسفہ کو اجاگر کرنا اور عوام الناس کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ شبنم صاحب نے سیاسی ایوان حکومت تک پہنچنے کی بھی سعی کی لیکن تعصب پرور اجارہ دار سماج کے ٹھیکداروں نے انہیں کسی بھی طرح آگے نہیں آنے دیا حالانکہ عوامی دعویٰ ہے کہ وہ کسی بھی اور کی نسبت زیادہ اہل تھے۔

اُن کے ادبی جریدے یا اخبار میں جناب پرتپال سنگھ بیتاب، شمس الرحمان فاروقی، عرش صہبائی، عابد

مناوری، فارق مضطر، حسام الدین بیتاب، کے ڈی مینی، شیخ خالد کرآر، صابر مرزا، خورشید بسمل، جاوید راہی، غلام نبی شہباز، عبد الرشید فدا، محمود الحسن محمود، مسعود الحسن مسعود، جیسے شعراء کا کلام چھپتا رہا اور مالک رام آنند اور شام سندر آنند لہر کے افسانے بھی۔

سیاسی سفر میں شبنم صاحب کو کئی مشکلات سے دو چار ہونا پڑا۔ حالیہ بدامنی کے دور میں اُن پر طرح طرح کے لیبل چسپاں کئے گئے۔، حیرت ہے کہ شبنم صاحب نے بیک وقت دو کشتیوں پر پیر رکھے اور ایسی کشتیاں جن کے رخ الٹی سمتوں میں تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ابھی تک وہ اپنے پاؤں ٹکائے ہوئے ہیں۔ انہوں نے سیاسی ثمر بہت کم کھائے اور علم و ادب کو بھی ضرورت کے مطابق زیادہ وقت نہ دے سکے۔ اُس پر طرہ یہ کہ نہ ادب کو مکمل طور پر چھوڑ سکے اور نہ ہی سیاست کو۔ شاید اسی لئے ان کی حیثیت دنیادار مومن جیسی ہے

؎ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

سیاسی الجھنوں اور جھنجھٹوں کے باعث شبنم صاحب کا سخت ادبی نقصان ہوا شاید اب وہ اسی کی تلافی کے لئے یا کفارہ ادا کرنے کی غرض سے بطور احسن ''ادبیاتِ پونچھ'' کی اشاعت کر رہے ہیں۔ میری دانست میں وہ اس کتاب کی اشاعت میں پہل کر کے اپنا خاص ادبی مقام بنا لیں گے۔ جسے ان کے بعد کوئی نہ چھین سکے گا۔ شبنم اس پیش کش کو بڑے سلیقے سے پیش کرنے جا رہے ہیں۔ انہوں نے شعراء و ادبا سے حاصل کردہ پُرزیوں کو گوہر نایاب سمجھ کر اپنے پاس محفوظ رکھا اور سینے سے لگا لیا۔

شبنم صاحب کا گھر ہو یا میڈیکل شاپ بزم ادب کا دفتر ہو یا دوران سفر مخصوص ادبی فائیلیں ہر وقت ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ انہوں نے بسیار کوششوں اور بڑے جتن کے ساتھ کلام اکٹھا کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ان کے بے پناہ علمی و ادبی شغف کا اور علم دوستی کا بین ثبوت ہے۔

کرشن چندر نے اپنے سفرنامے ''ورق روق کھو گئی زندگی میری'' میں لکھا ہے ''سرنکوٹ میں میری ملاقات افسانہ نگار شبنم سرنکوٹی سے ہوئی'' کرشن جی کا ایسا لکھنا سند سے کم نہیں۔

شبنم صاحب کے افسانے سماج میں پائی جانے والی افراط و تفریط کا آئینہ دار بھی ہیں اور اصلاح کار بھی۔ بقول شمس الرحمان فاروقی ''فن پارہ تہذیب کا مظہر ہوتا ہے اور تہذیب کے کسی مظہر کو ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تلک ہمیں ان اقدار کا علم نہ ہو جو اس تہذیب میں جاری و ساری تھیں''۔ شبنم صاحب نے اپنے افسانے نہایت ہی عمدہ مقامی محاورہ اور روایتی انداز میں لکھے ہیں۔ انکی زبان علامتی اور استعاراتی نہیں، نئی تخلیقی زبان کی معنوی اکائیوں سے کوئی علاقہ نہیں، وہ بدن کو خیمۂ گل نہیں کہتے اور سانسوں کو طناب!

زیرِ نظر کتاب میں شامل افسانہ ''میں کیا ہوں؟'' میں شبنم صاحب گوہر پاشیاں یوں کرتے ہیں ''قول فیصل ہے کہ جب کوئی قوم سرکش ہو کر ظلم و جبر کی طرف راغب ہو جائے اور انصاف کا دامن چھوڑ دے تو اس قوم پر خدائے لم یزل ظالم اور جابر حکمران مسلط کر دیتا ہے جو اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک وہ سرکش قوم پلٹ کر اپنے اصل کی طرف نہ لوٹ آئے''۔ یہ اقتباس شبنم صاحب کے لائحہ عمل اور فکر و شعور کا بھی پتہ دیتا ہے۔ انہوں نے اپنے اس قول کی تائید میں مغلوں کی تعیش و غفلت شعاری کی زبردست مثال درج کی ہے۔ انہوں نے سفید شیطان کی چالوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ سرحد کو وہ خونی لکیر کہتے ہیں۔ خوب استعارہ ہے۔ تقسیم ملک کے دوران جن دلدوز واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ان واقعات کا اجمالی خاکہ پڑھ کر ہمیں ندا فاضلی صاحب کے مشہور اشعار یاد آ جاتے ہیں کہ

رشتۂ دیوار و در تیرا بھی ہے میرا بھی ہے
مت جلا اس گھر کو یہ گھر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

ناگہانی کھا گئی جن کو سیاست کی صلیب
ان میں اک نورِ نظر میرا بھی ہے تیرا بھی ہے

کیوں لڑیں آپس میں ہم ایک ایک سنگِ میل پر
اس میں نقصان سفر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

ان کا افسانہ فسادات کا نقشہ، عصمتوں کی پامالیوں کی بات اور رشتوں کے فتراق اور جدائیوں کی کہانی بہترین پیرائے میں بیان کر رہا ہے۔ شبنم صاحب اپنے افسانوی مجموعے شاہین میں رقم طراز ہیں کہ

''آدم کے بیٹے شراب کے نشے میں دھت ہاتھیوں کی طرح چنگاڑ رہے ہیں، حوا کی بیٹیاں ننگ تہذیب بن کر ان کی باہوں میں کھلونا بنی ہوئی ہیں، حوا کی بیٹیوں کے ہونٹوں سے لپ اسٹک آدم کے بیٹوں کے منہ پر منتقل ہو رہی ہے۔ جیسے یہ لالی کہہ رہی ہو۔ اے آدم کے بیٹو، سنبھلو ورنہ اسی لالی جیسا ایک سیلاب آنے والا ہے، جو موجودہ دور میں پلنے والی تہذیب و تمدن کو مٹا ڈالے گا''۔ اپنے اس افسانے ''کائنات شرما اٹھی'' جو انہوں نے عظیم صحافی مرحوم شمیم احمد شمیم کے نام کیا ہے۔ جس میں آج کی تہذیب کی جھلکیاں، شراب و شباب کی باتیں، جنسیات و لذتیات Sensualism & Sexology کی وارداتوں کا ذکر کیا ہے۔ شبنم صاحب کو (Universal Moral Ethical Codes) عالمی صالح اخلاقی اقتدار کے پائمال ہونے کا ڈر ہے۔ وہ ان اقدار کو اپنے بگڑے ہوئے سماج میں آب و تاب سے واپس زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی باور کرانا چاہتے ہیں کہ تہذیبیں بدلتی رہتی ہیں۔ ''زار شاہوں کی رنگ رلیاں ہوں یا ملکی راجاؤں کے یہاں حسین محل سراؤں یا اپسراؤں کے قصے، وقت کی رواں دواں لہروں کے ساتھ ہی بہہ جاتے ہیں۔

شبنم صاحب ملکی معاشرہ کی بنیاد صالح اقدار پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک قوموں کی بقا اور ترقی

کارراز اسی میں مضمر ہے بقول غالبؔ۔ میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

مختصراً شبنم صاحب نے اپنے افسانوی مجموعہ شاہین کے کرداروں میں جوانوں کے وحشیانہ افعال، بد حال معاشرہ اور بگڑے ہوئے سماج کی خوب خبر لی ہے ''مشرقی عورت'' کے کردار کو بھی اجاگر کیا ہے۔ وہ کہاں تک اپنی کاوشوں میں کامیاب ہیں، اس کا فیصلہ تو نقاد اور ماہرین فن افسانہ نویس ہی کر سکیں گے۔

میرا مقصد صرف اور صرف ایک تعارف لکھنا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ شبنم صاحب بیانیہ صلاحیتوں سے بھر پور ہیں۔ یاد رہے کہ شبنم صاحب کی کسی ادبی تخلیق کے مقابلے میں ان کی ادبی جدوجہد 'ادبیاتِ پونچھ' کا تاریخی کام بہت ہی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ چراغ حسن حسرتؔ مرحوم، تحسین جعفری، ضیاء الحسن ضیاؔء، کرشن چندر، دینا ناتھ رفیق، دیانند کپور، بلدیو راج رہبرؔ، اور ان گنت ادبا و شعرا جو پونچھ سے تعلق رکھتے تھے یا ہیں آج تک کسی کو خیال نہیں آیا کہ وہ پونچھ کے اس مشترکہ ادبی ورثہ کو محفوظ کریں۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم اور مشکل کام کا سہرا ایوب شبنم صاحب کے ہی سر ہے۔

میں آخر پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ شبنم صاحب کی ''ادبیاتِ پونچھ'' میں اکثر ادیبوں کا منتخب کلام شامل ہے اور یہ وہ کلام ہے جو یا تو شبنم صاحب کا پسندیدہ ہے یا پھر خود شعراء و ادباء کا۔ بعض کلام ایسا بھی ہے جو شبنم صاحب کو اضطراری طور پر پیش کرنا پڑا ہے۔ شبنم صاحب نے کتاب ہذا میں مصنفین پر جامع اور شاندار تبصرہ بھی کیا ہے۔ مصنفین کی فنی زندگیوں پر مختصراً جاندار اور واضح روشنی ڈالی ہے، جس کو پڑھنے کے بعد میں ضروری نہیں سمجھتا کہ مزید اپنی طرف سے کچھ لکھوں۔

خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ وہ ہر دور میں شبنم صاحب کا نعم البدل پیدا کرتا رہے جو ادبی سرمایہ کو جو ورق ورق بکھر رہا ہے کو یکجا کر کے سامنے لائے اور محفوظ کر دے۔ اس پیش کش کو منظر عام پر لانے پر میں شبنم صاحب کو اپنے دل کی گہرائیوں سے اور تمام دختران و فرزنداں خطہ پونچھ کی طرف سے مبارک باد کا ہدیہ پیش کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ ان کی ادبی کاوش اور سعی سدید ادبی حلقوں میں مقبول ہو اور اس گلدستہ کی مہک اور خوبصورتی دور تک مشام ہائے جاناں کو راحت پہنچائے بقول منظور ہاشمی۔

گھنے درختوں کے سائے کی عمر لمبی ہو

کہ ان کے نیچے مسافر قیام کرتے ہیں

☆☆☆

ادبیاتِ پُونچھ۔ پس منظر‘ پیش منظر

محمد ایوب شبنم

کائنات کا ذرہ ذرہ گواہ ہے کہ ایک ادیب‘ ایک شاعر مالکِ کُل کی سماجی تخلیق کا ایک لاثانی اور عظیم شاہکار ہوتا ہے۔ ایک ایسا جادوگر‘ ایک ایسا سامری جو اپنے فن کے ذریعے غور وخوض کے بعد نئے نئے جادو جگا کر پورے سماجی ماحول میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے...... وہ ایک ایسا مسیحا زماں ہوتا ہے جو اپنے جادوئی الفاظ کی چابکدستی سے، سانحات، کیفیات، مشاہدات، دلآویز اصطلاحوں اور عجیب استعاروں کے ذریعے، احساس کی رگوں کو چھیڑتا ہے، جگاتا ہے۔ اس کی حساس پکڑ اور حساس روح ساری کائنات کی جراحی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی........ اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ اگر ابن آدم کی یہ قسم‘ یہ جراحی ترک کر دے تو ساری دُنیا، ان دیکھی، ان سُنی، ان کہی اور انجانی ہو جائے۔

اس میں قطعاً شک نہیں کہ ہر شخص شاعر یا ادیب ہو نہیں سکتا......... مالکِ کون و مکاں کا یہ عظیم شاہکار‘ سینکڑوں میں نہیں‘ ہزاروں میں ایک ہوتا ہے بلکہ کہیں کہیں‘ کبھی کبھی لاکھوں‘ کروڑوں میں صرف ایک...... جسکی خوشبو سے سارا جہاں مہک اٹھتا ہے اور جسکی ضیا پاشیوں سے سارا جہاں بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ ماحول موزوں نہ ملے تو دب جاتا ہے اور اگر ماحول موزوں مل جائے تو قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی۔ ادیبانہ یا شاعرانہ جبلت Instinct اور بصیرت Vision عالمِ محسوسات کی ہر مرئی حتیٰ کہ غیر مرئی

اشیاء اور اُن کی ماہیت کو دیکھ لیتی ہے' پرکھ لیتی ہے جبکہ باقی عوام الناس ان چیزوں کے ادراک سے قطعاً بے بہرہ اور انجان ہوتی ہے۔

شاعرِ مشرق اپنی بصیرت کے زور پر ہی تو کہتے ہیں کہ۔ محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

عظیم فلسفی شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اپنی بصیرت ہی کو بروئے کار لا کر سینکڑوں سال بعد ظہور پذیر ہونے والے واقعات کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور۔ جبکہ عام انسانوں کو تو آج بھی بلڈ بینک، ہارٹ بینک، کڈنی یا آئی بینک کا ادراک تک نہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ ادیب کی قلم کی نوک سے سیاسی' سماجی' ثقافتی' انقلابات جنم لیتے ہیں اور دوسری طرف امن و آشتی' مساوات اور محبت اور پیار کے فوارے بھی پھوٹتے ہیں۔ کائنات کے پُراسرار سربستہ راز بھی فاش ہوتے ہیں۔

قانونِ فطرت ہے وہ خود تو مٹ جاتے ہیں لیکن اپنے جادوئی قلم سے اور تحقیقی فکر سے حال ہی نہیں بلکہ مستقبل میں بھی ظہور پذیر ہونے والے حالات و واقعات کو بھی فاش کر جاتے ہیں۔ صدیوں بعد تک جنم لینے والی نسلوں کے لئے روشن ترین راہیں متعین کر جاتے ہیں۔ اقتدار' زن' زر' زمین ہر شئے فنا ہو جاتی ہے لیکن اس نسل کے قلم سے پھوٹا ہر لفظ عمر جاوداں پا جاتا ہے شرط یہ ہے کہ جب لکھا جائے تو اس میں Originality ہو اور جن تحریروں میں Originality نہ ہو وہ گیلی مٹی پر ثبت نشانات کی طرح مٹ جاتی ہیں۔

شعراء و ادبا اپنے دور کی زبان ہوتے ہیں۔ اُن کے کلام میں اُس دور کی تہذیب و تمدن کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ اُن کی کاوشیں کبھی تو حسن و جمال پر مرکوز ہو کر ادب برائے ادب تخلیق کرتی ہیں اور کبھی مقصدیت اور تقاضۂ حالات کے پیشِ نظر ادب برائے زندگی کو بھی وجود بخشتی نظر آتی ہیں۔ اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔

انسانی فطرت کے پیچیدہ احساسات و جذبات کی عکاسی کہاں ہو سکی ہے اور کہاں ہو گی؟ انسان کا متجسس ذہن کہاں مطمئن ہوا ہے اور کب ہو گا' تحقیق کرنے والے تحقیق کرتے رہیں گے' لکھنے والے لکھتے رہے ہیں اور لکھتے رہیں گے اور یہ سلسلہ روزِ آخر تک رواں دواں رہے گا، جیسے یونانی دیو مالاؤں کی تحقیق میں مصر کے کھنڈرات' اہرامِ مصر سے متعلق ریسرچ ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ جاپانی دیو مالاؤں کی مماثل ''آریہ ورت'' کی دیو مالاؤں کی کھوج ہوئی ہے اور ہوتی رہے گی۔ عظیم فلاسفر گوئٹے اور ہومر کے ادب سے یونانی دیو مالاؤں کے فلسفۂ حیات کی ان گنت کرنیں پھوٹتی ہیں۔ تمثیلات' استعارات' اور تلمیحات کی تشریح و توضیع۔ حضرتِ موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے واعظوں سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ اور یہ تلاش جاری رہے گی۔ رامائین اور مہا بھارت

کے افسانوی کردار، آسمانی دیوتاؤں کا درجہ حاصل کر کے انسانوں کی ایک وسیع آبادی میں قابلِ پرستش بن گئے ہیں۔ انسان کو انسان کی پُراسرار ذات میں ابدی نور چمکتا دکھائی دیتا ہے اور بے پناہ ظلمتوں کی تیرہ و تار سیاہی بھی۔

تاریخ سے شغف رکھنے والا ہر انسان قوموں کے عروج و زوال، اُن کی شکست و ریخت اور اس کے اسباب و علل کو ہر زمانے کے ادب میں تلاش کرتا آرہا ہے اور تلاش کرتا رہے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کسی نہ کسی قلم نے کہیں نہ کہیں جواہر پارے ضرور بکھیرے ہوں گے۔ زمانے کے پس و پیش پر قلم ضرور اٹھایا ہوگا کیونکہ وہ اپنے زمانے اور اپنے دور کا آئینہ ہوتا ہے...... جیسے مشہورِ زمانہ ادیب شیکسپیئر نے اپنے دور میں اپنے جادوئی قلم سے ''یہودی کی بیٹی'' کی تخلیق کرتے ہوئے خون کے دو قطرات کو زمین پر گرنے ہی نہیں دیا کہ یہ قطرات کسی کی شادمانی اور کسی کے بے پناہ غم کا مرقع بن گئے...... مشہور سیہالوں کی ہیر' زہر کے پیالے میں دو بوند خون کیا گھول گئی کہ وارث شاہ کے کلام کو حیاتِ جاوداں بخش گئی۔ کالی داس کی شکنتلا میں راجا دشنت کے دربارِ خاص میں۔ شکنتلا، دو آنسو کے قطرے کیا بہا گئی کہ کالی داس اور شکنتلا دونوں ہی بے مثال بن گئے ''سیتا'' کے دو آنسو گرتے ہی اُس دور کے راجا راون جیسے بڑے عالم کی عظیم ترین سلطنت لنکا جل کر بھسم ہو جاتی ہے اور بالمیکی کی رامائین الہامی کتاب کا درجہ پا کر لافانی بن جاتی ہے۔ پانچ پانڈوؤں کی واحد بیوی ''دروپدی'' دو آنسو کیا بہاتی ہے کہ مشہور اٹھارہ اکھشونی سور بیر خون میں نہا جاتے ہیں اور وید ویاس کی مہابھارت (کرشن اوتار) کے اُپدیشوں کا سہارا لے کر الہامی کتاب تصور کی جا کر ''پوجیا'' ہو جاتی ہے۔ زلیخا کے دو آنسو زندان یوسفؑ کی دیوار کے دو روشن دان بن جاتے ہیں۔ خوبصورت۔ بہت ہی خوبصورت قلوپطرہ کے دو آنسو۔ مصر اور یونان کی عظیم ترین سلطنتوں کو غرق کر دیتے ہیں۔ حضرت صغریٰ کے غم و اندوہ سے بھرے ہوئے دو آنسو یزید کی پشیمانی' بربادی' ذلت کی وجہ اور شہدائے کربلا کی یاد میں خون کے آنسو رُلا دینے والی داستانِ غم بن جاتے ہیں۔

روس کا مشہور ادیب لیو ٹالسٹائی جو ادب تخلیق کر جاتا ہے اگر اُس کو روسی انقلاب کی وجہ قرار دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ٹالسٹائی اپنی ایک تخلیق میں ایک انڈے کی علامت سے دو ہمسایوں کو جانی دشمن بنا کر خون کی ندیاں بہا دیتا ہے۔ فرد سے افراد۔ افراد سے خاندان۔ خاندان سے خاندانوں میں حسد و بغض کی آگ کے شعلے برسانے لگتی ہے اور مکمل گاؤں جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ دائمی محبت کس طرح دائمی نفرت میں بدل جاتی ہے یہ ٹالسٹائی کی عظیم قوتِ بیان کی کرامت ہو سکتی ہے۔ اسی ادیب کی شہرۂ آفاق تصنیف War and Peace محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ برنارڈ شا اپنے افسانوی کردار ''تاش کا بادشاہ'' اور میکسم گورکی کی اپنی شاہکار تخلیق ''ماں'' میں اپنے زورِ قلم سے جمہوری اور شخصی نظام کی پسِ پردہ حقیقت کو ایسے طنزیہ انداز میں واشگاف کرتے ہیں کہ کوئی اہلِ قلم لاکھ

کوششوں کے باوجود نہیں کر سکے گا۔

ٹیگور اور شرت چندر زورِ قلم سے وقت کے فرسودہ سماج کی روایات کو اس طرح چیلنج کرتے ہیں کہ پورے بنگال کی سرزمین میں بھونچال آجاتا ہے، کرشن چندر نے جاگیردارانہ نظام اور اس کی چیرہ دستیوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ہر اہل دل کو کشمیر اور کشمیری عوام سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ادب میں پونچھ کو اسطرح ابھارتے ہیں کہ پورا روسی ادب پونچھ کے نام سے روشناس ہو جاتا ہے...... شیخ محمد عبداللہ جیسی سیاسی شخصیت کو ایک نامور ادیب محمد یوسف ٹینگ کے زورِ قلم کا سہارا لینا پڑتا ہے پھر جا کر'' آتش چنار' وجود میں آتی ہے ... . پریم چند کے افسانوی کردار 'زندہ وجاوید انسانوں کے کردار لگنے لگتے ہیں۔ امریکی سماج کی واہیات' شہوت پسندانہ ذہنیت کی عکاسی اور ان کا پردہ فاش کرتے ہوئے معروف ادیبہ پرل بک امریکی ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر دیتی ہے۔'' مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' جیسا افسانہ تخلیق کر کے سجاد حیدر کچھ ایسے تاثرات پیدا کر دیتے ہیں کہ ہر انسان کو دوستوں سے خوف لگنے لگتا ہے۔ خود یہ افسانہ پڑھنے کے بعد ان کے اپنے دوست بدظن ہو گئے تھے۔ سعادت حسن منٹو اپنے قلم کے زور سے دنیا کے تمام 'پاکبازوں' کے کپڑے نوچ کر اُن کو عین برہنہ کر کے سڑک پر کھڑا کر دیتا ہے۔ اس نے سیاسی اور فلم سے متعلق 'بڑے لوگوں' کو بھی نہیں بخشا اور قاری کو حیرت کی سرحدوں پر لا کھڑا کیا۔ سابق وزیر اعظم ہند آنجہانی جواہر لعل نہرو Discovery of India جیسی تخلیق دے کر پورے مشرق و مغرب کو حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ اُردو ادب و سیاست کی بہت ہی بلند پایہ شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی تخلیقات 'چڑیا چڑے کی کہانی' ..... نہ گھر تیرا نہ گھر میرا... چڑیا رین بسیرا' کا وہ مکمل ترین شاہکار ہیں۔ آزاد کی چڑیا کی پرواز ذہن کے پردوں کو یوں ماؤف کرتی ہے جیسے انسان کی ہوس کا انجام دیدۂ عبرت نگاہ بن کر انسانیت کو چونکا دے۔

غرض کہ ان گنت ادبا اور شعراء حضرات اس دنیا میں آئے جن کے اسمائے گرامی اور اُن کی لافانی تخلیقات کو گننا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ بس مقصدِ گفتگو اتنا ہی ہے کہ ان کے قلم میں اتنا زور ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو بنا دیں چاہیں تو بگاڑ دیں۔

کتنا عجیب' کتنا حیران کن' اور کتنا ہی افسوس ناک لمحۂ فکریہ ہے کہ اسی نسل کا بیشتر حصہ جنگل میں کھلنے والے پھولوں کی طرح ان دیکھا انجانا ہی وجود میں آتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ زمانے کی کم نگاہی بھی اُسے اپنا شکار بنا لیتی ہے۔ سوچنے والا سوچتا ہے، اگر اتنی کم نگاہی کے باوجود یہ مقدس نسل کیا کیا کر گزرتی ہے تو اگر ان کی صحیح خبر گیری، حوصلہ افزائی، پذیرائی اور دیکھ ریکھ ہو تو یہ کیا سے کیا کچھ کر کے ساری دنیا کو حیرت واستعجاب میں مبتلا کر دیں؟ بقول

غالب سب کہاں کچھ لالہ وگُل میں نمایاں ہوگئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو

گئیں۔

ثابت ہوا کہ کسی قوم یا سماج کے کمال و زوال، فنا یا بقا کا انحصار سماج کے انہی حساس اور علم و دانش سے مزین افراد کی حرکات و سکنات پر مبنی ہوتا ہے..... زبانیں تو کسی علاقے اور عوام کے ذریعۂ اظہار کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتیں۔ اصل مقصد ان زبانوں یا ان کے جذبات و محرکات کو یکجہتی کی سمت عطا کرنے میں ہے جو زبانیں انسانی ارتقا کے مقابلہ میں کسی قوم یا ملک کو کھڑا نہ کرسکیں انہیں ترک کر دینا چاہیے وہ رابطہ کے لئے تو باقی رہیں لیکن ان پر انحصار نہ کیا جائے۔

میں سارے جہاں کی اس حساس، متبرک، اور عظیم ترنسل کو سلام عقیدت و احترام پیش نہ کروں تو یہ کفرانِ نعمت ہی نہیں بلکہ کفرانِ حقوق العباد بھی ہوگا۔

میں ایک پُر احساس، پُر دردسعی کے طور پر ضلع پونچھ کے ادباء و شعراء کے مختصر سوانحی خاکہ جات اور اُن کے نمونۂ کلام کے ہمراہ ''ادبیاتِ پونچھ'' عنوان کے تحت ایک تاریخی اور ادبی تصنیف منظر عام پر لانے کی جسارت کر رہا ہوں۔ سرحدی رکاوٹوں، کلام کی عدم دستیابی، سوانحی خاکوں کی عدم بازیابی، اور رنگ ہا رنگ کی مشکلات کے باوجود اپنی اس مشکل مگر گراں قدر سعی کو آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ میرا یقین واثق ہے کہ آج یا کل کا ادیب، مورخ یا ادب نواز طبقہ اس سے فائدہ اٹھائے گا اور ضرور اٹھائے گا اور جہاں تک میری رسائی ہوئی ہے وہاں سے آگے کا سفر وہ ادب کی شمع جلائے رکھنے میں اور مستعدی سے کام کرے گا کیونکہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

میں ہر لحاظ سے ارزاں اپنی اس کوشش اور خواہش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں قارئین پر چھوڑتا ہوں کیونکہ بہترین منصف قارئین ہی تو ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی بھرپور کاوشوں سے بزم میں شامل تخلیقات کو چھانٹ کر نکالا ہے حالانکہ Choice بہت کم تھی۔ اگر میں ان ساری تخلیقات کو محض فنی معیار کی کسوٹی پر اتارنے کی کوشش کرتا تو بزم میں شامل تخلیق کاروں کی فہرست سکڑنے کا امکان تھا۔ ویسے بھی ہمارا کام معیار کو پرکھنا نہیں بلکہ نمائندگی سے عاری ادبا کو حوصلہ دینا اور دنیا کے سامنے لا کھڑا کرنا ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے اُردو ہفت روزہ ''ستاروں سے آگے'' کا اجرا کیا تو میرے احباب نے شرماتے لجاتے ہوئے اپنی تخلیقات چھاپنے کے لئے مجھے بھیجیں تو ان میں سے بیشتر قطعاً غیر معیاری تھیں۔ لیکن میں نے اس ماہنامے کا اجرا ان کو ابھارنے کے لئے کیا تھا دبانے کے لئے نہیں چنانچہ ایسا وقت آیا کہ وہ سب لوگ اتنا معیاری لکھنے لگے کہ میری تو بات ہی چھوڑیئے اچھے اچھے

قلمکار دور پیچھے رہ گئے۔

کچھ عرصہ سے گوجروں، پہاڑیوں، ڈوگروں، پنجابیوں اور کشمیریوں نے اپنی اپنی زبانوں کے لئے الگ الگ شدومد سے کام شروع کر رکھا ہے۔ ایسا کرنے سے بے شک ادب میں چند اوراق کا اضافہ ہو تو ہو لیکن مجموعی بھائی چارہ اور اجتماعی تفکر میں بڑا فرق آیا ہے۔ بڑا فاصلہ بڑھا ہے اور بڑھتا جارہا ہے۔ بقول شاعر ؂

تم اٹھو اٹھ کر گرادو بیچ کی دیوار کو

دیکھنا آنگن تمہارا دوگنا ہو جائے گا

میری دانست میں یہ ساری تگ ودو ماسوائے حقیر سیاسی واقتصادی مفادات حاصل کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اور وہ بھی صرف چند مخصوص طبقوں یا افراد کے لئے۔

مولانا سر سید احمد خان نے ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی ہمیں انگریزی زبان سے جوڑ کر عالمی سماج سے جوڑنے کی کامیاب کوشش کی جس کے بہت ہی دورس نتائج برآمد ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قطعاً قاصر ہوں کہ ان چھوٹی چھوٹی وادیوں میں بولی جانے والی ضمنی بولیوں کے فروغ کے لئے دوڑ دھوپ کر کے میرے دوست، بزرگ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ بجائے ان لا حاصل کاوشوں کے اگر اُردو زبان کے لئے ہی کام کیا جاتا تو کم از کم برصغیر کے لوگوں کو ایک ہی دھاگے میں پرو کر رکھا جا سکتا جس کے بے پناہ نتائج برآمد ہوتے اور برصغیر یوروپی برادریوں کی طرح جدید دور کے تقاضے پورے کر سکتا۔

بے شک ہر زبان ماں کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن ماں تو ماں ہوتی ہے۔ اُسکی لغت میں دنیا کے تمام بیٹوں یا بیٹیوں کے معانی ایک ہی ہوتے ہیں۔ ماں کے پیار میں تفریق یا نفی کا عنصر ہرگز نہیں ہوتا۔

اس سے قبل کہ پونچھ کے ادیبوں اور اُن کے ادب پر قلم اٹھاؤں میں چاہتا ہوں کہ پونچھ کو جغرافیائی اور تاریخی پس منظر میں دیکھ لوں۔ کیونکہ جب کسی علاقہ یا اس میں مکین عوام سے متعلق لکھا جائے اس جگہ یا عوام کو جغرافیائی اور تاریخی پس منظر میں دیکھ لینا اُن کے ساتھ صحیح انصاف کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔

سرزمین پونچھ نے بھی ان گنت تاریخی نشیب وفراز کا سامنا کیا ہے۔ کبھی 'رام' اور کبھی پانڈو برادران نے اسے اپنا مسکن بنایا اور کبھی شہرہ آفاق راجاراون کے دادا مہارشی پُلست نے برسہا برس عبادت کر کے اس خطہ کا نام پُلست مشہور ہو جانے کا جواز پیدا کر دیا۔ جو بعد ازاں کشمیری اور پہاڑی زبانوں کی آمیزش کی وجہ سے پُلست سے پرونس، پرونس سے پونچھ متعارف ہوا۔ ہیون سانگ کے مطابق پرونس کا دارالخلافہ لوہارہ تھا جو بعد ازاں لوہر کوٹ اور پھر لورن کہلانے لگا۔ اس سرزمین پر صدیوں تک ہندو حکمرانوں نے حکمرانی کی اور جب اسلام نے اپنی

باہیں پھیلائیں تو مسلم سلاطین نے بھی یہاں صدیوں تک حکومت کی۔

پنڈت کلہن نے راج ترنگنی میں الگ ریاست پونچھ کا قیام 850ء میں ظاہر کیا ہے جبکہ اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کے سوداگر ''نر'' نے حکومتِ کشمیر کے خلاف بغاوت کر کے اپنی حکومت قائم کر لی چنانچہ 850ء سے لے کر 1542ء تک ریاست پونچھ پر مختلف ہندو راجاؤں نے حکومت کی۔

1596ء میں مغل شہنشاہ جہانگیر نے سراج الدین کو پونچھ کا حکمران نامزد کر کے ریاست پونچھ کو اپنے تسلط میں لے لیا۔ 1823ء میں راجا مبارض خان کے دورِ حکومت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ پر مہاراجا گلاب سنگھ نے ریاست پونچھ کو فتح کر لیا۔ اور 1850ء تک یہ ریاست خالصہ دربار کے زیرِ نگیں رہی۔ خالصہ دربار کے وزیر اعظم موتی سنگھ نے ایک بار پھر پونچھ کو الگ ریاست کا درجہ دے دیا چنانچہ 1850ء سے 1947ء تک ڈوگرہ خاندان نے ریاست پونچھ پر حکومت کی۔

انگریز حکومت کی شرانگیزی نے 1947ء میں بھارت کو تقسیم کر کے جب پاکستان کے وجود میں آنے کی راہیں ہموار کر دیں تو پونچھ میں بھی انتشار پیدا ہو گیا، پاکستانی قبائیل نے حملہ کر دیا تو بریگیڈیر پریتم سنگھ کی تحریک پر اور دیگر لوگوں نے قبائیلیوں کو پرے دھکیل دیا۔ لیکن شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی مصلحت نے پنڈت جواہر لعل نہرو کے ساتھ مل کر پونچھ کی بھی ناجائز تقسیم کروا دی جس کی وجہ سے دو بڑی تحصیلیں سُدھنتی، باغ اور کرلوپ کے پرگنوں کے علاوہ تحصیل مہنڈر اور حویلی کا بھی بہت زیادہ رقبہ پاکستانی کشمیر کے تسلط میں چلا گیا اور ریاست پونچھ سکڑ کر چھوٹے سے ضلع کی صورت اختیار کر گئی۔

اس وقت ضلع پونچھ تحصیلات حویلی، مہنڈر، سرنکوٹ اور نوزائیدہ تحصیل منڈی پر مشتمل ہے اور ریاست کی قانون ساز اسمبلی کے اندر اس کی تین نشستیں، حویلی، مہنڈر اور سرنکوٹ ہیں۔ 2001ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع کی آبادی 3,76,361 افراد پر مشتمل ہے۔ اور اس ضلع کا کُل رقبہ 1676 مربع کلو میٹر ہے۔ ضلع کی سرحدیں مشرق میں کشمیر وادی اور مغرب میں پاکستانی کشمیر سے ملتی ہیں۔

یہاں یہ قابلِ ذکر ہے کہ 1882ء میں جب راجا بلدیو سنگھ تخت نشین ہوا تو اس وقت اُردو زبان درباری زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اس سے قبل سنسکرت، فارسی، ٹاکری، پہاڑی اور ڈوگری زبانوں کا دور تھا لیکن ان زبانوں کا ادبی ورثہ دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔ یا تو تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ادب جنم ہی نہیں لے سکا یا پھر لکھا گیا لیکن زمانے کے تغیر وتبدل کے ساتھ ضائع ہو گیا۔ لیکن اُردو زبان کے رائج ہوتے ہی ادبی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ دسہرہ یا بسنت پنچمی، ان تہواروں کے موقعہ پر شعراء حضرات اُردو زبان میں راجا کی شان میں قصائید

پڑھتے، راجا بہت خوش ہوتا اور اُن کو اعزازات سے نوازا جاتا۔ اس دور میں فخر پونچھ' شہرۂ آفاق شاعر مولانا چراغ الحسن حسرتؔ، اُن کے نانا منشی علی حسن خان، روپ چند احقرؔ، ہیڈ ماسٹر ہرچرن داس، ولی محمد، امام دین ہُدہُدؔ، سائیں قادر بخش، مولوی حبیب اللہ شاہ بخاریؒ، سید ہدایت شاہ بخاری، سید برکت شاہ شاعر، سید باغ حسین شاہ، سید حیدر شاہؒ، قاضی شہاب الدین، قاضی حسن دین، دینا ناتھ رفیقؔ، چوہدری دیا نند کپور، کرشن چندر، فرزند علی خان تحسین جعفری، بیلی رام بیدلؔ وغیرہ ادبی افق پر ابھر کر سامنے آئے۔

اصل میں 1925ء سے 1940ء کا زمانہ ہی ادبی انقلاب کا زمانہ تھا جس میں شعرا و ادبا کو کچھ کر گزرنے کا موقعہ ملا 1943ء میں ڈاکٹر سرون ناتھ آفتابؔ نے اُردو ہفت روزہ ''آفتاب'' شائع کر کے پونچھ میں صحافت کی بنیاد رکھی۔ اس اخبار کی اشاعت سائیکلو اسٹائیل مشین پر ہوتی تھی لیکن 1935ء میں چوہدری دیا نند کپور اور چوہدری بدری ناتھ پوری نے مل کر لیتھو پریس شروع کیا اور اس کے ساتھ ہی پربھات نام سے منسوب اُردو ہفت روزہ اخبار کی اشاعت بھی شروع ہوئی۔ ان شخصیات کی دیکھا دیکھی میر پور سے تعلق رکھنے والے نبی بخش نظامی نے بھی 1936ء میں المجاہد نام کا ایک اُردو ہفت روزہ شائع کیا۔ 1937ء میں حسرتؔ صاحب کے برادرِ اصغر سراج الحسن سراجؔ نے بھی ''صادق'' نام سے مشہور اخبار کی اشاعت شروع کی۔ 1938ء میں شہزاد آزاد نے اُردو ہفت روزہ ترجمان بھی شائع کرنا شروع کیا۔ اور اس طرح صحافت کا سنہری دور شروع ہو گیا۔

ڈاکٹر سرون ناتھ آفتابؔ نے بزم ادب پونچھ کی بنیاد ڈال کر ان تمام ادبا و شعراء اور صحافیوں کو جمع ہونے کا موقع دیا۔ کرشن چندر نے ''جہلم میں ناؤ پر'' ''یرقان'' ''مصور کی موت'' تین افسانے لکھ کر لاہور کے ادبی رسالے ''ہمایوں'' اور ''ادبِ لطیف'' میں کیا شائع کئے کہ پورے ادبی ماحول میں تہلکہ مچ گیا۔ جگن ناتھ ٹھاکر' جو ٹھاکر پونچھی کے نام سے معروف ہوئے' نے کرشنا ڈرامیٹک کلب کی بنیاد ڈال کر اپنی پہلی کہانی ''کالکی'' تخلیق کرنے کے بعد جموں کے اخبار ''چاند'' میں شائع کی جس سے پونچھ کے ادبی کینوس پر نئے رنگ بکھرے۔

لیکن افسوس 1947ء کے ہولناک خونی المیے نے ریاست پونچھ کی جغرافیائی' تاریخی' سیاسی' ثقافتی' اور خاص کر ادبی شکل کو ہی مسخ کر دیا۔ کرشن چندر' چراغ الحسن حسرتؔ' تحسین جعفری' سراج الحسن سراجؔ' سید برکت شاہ' وغیرہ درجنوں لوگ کچھ ممبئی جا بسے اور کچھ پاکستان چلے گئے۔ ایک بڑی ہجرت نے شیرازہ ہی بکھیر کر رکھ دیا۔

1955ء تک جب 1947ء کے پُر آشوب حالات کا اثر کسی حد تک زائل ہوا تو جناب غلام محمد بھٹ، ہیڈ ماسٹر، ہائی اسکول سرنکوٹ کی فرمائش پر ادباء و شعرائے سرنکوٹ نے بزم ادب سرنکوٹ کا قیام عمل میں لایا۔ حسام الدین بیتابؔ' ماسٹر عبد الصمد شوقؔ، ست پال کپور' چوہدری خدا بخش زارؔ' بخشی بشمبر داس دتہ' شمس الدین

مہجورؔ، چوہدری حسن الدین حسنؔ، قاضی شہاب الدین، قاضی حسن دین وغیرہ ممبران بزم نامزد ہوئے۔

1965ء میں حالات پھر خراب ہوئے لیکن جلد ہی سنبھل بھی گئے۔ ڈاکٹر سرون ناتھ آفتابؔ اخبار تو بند کر چکے تھے البتہ انہوں نے بزمِ ادب پونچھ کا احیائے نو کیا۔ بلدیو راج رہبرؔ، دینا ناتھ رفیقؔ، بدری ناتھ احقرؔ (پوری)، گردھاری لعل برقؔ، دوارکا ناتھ حاذقؔ، جے دیو سنگھ دت، کندن لعل عاجزؔ، درشن سنگھ اکالی، بچن سنگھ دردی، محمود الحسن محمودؔ، مسعود الحسن مسعودؔ، شیو لعل آزادؔ وغیرہ ممبران نامزد ہوئے۔

22 نومبر 1970ء کو زیرِ صدارت چوہدری خدا بخش زارؔ بزمِ ادب سرنکوٹ کو پھر متحرک کیا گیا۔ جناب حسام الدین بیتابؔ کو بزم کا صدر اور مجھے جنرل سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ سید مشتاق شاہ بخاری، نذیر حسین قریشی، خوشدیو مینی، فضل حسین مشتاق، ماسٹر شاہ محمد آزادؔ، اوم پرکاش شرما، ست پال کپور، شیخ آزاد احمد آزادؔ، سید حاکم شاہ قمرؔ، وغیرہ بزم کے ایکٹو ممبران نامزد ہوئے۔

مئی 1972ء میں بزمِ ادب سرنکوٹ کی ادارت اور تحریک پر میں نے ماہنامہ ''ستاروں سے آگے'' کی اشاعت شروع کی اور اس وقت تک نامساعد اور مشکل ترین حالات 'بشمول سیاسی قید وبند' کے باوجود اخبار کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ اپریل 1972ء میں میں نے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ ''شاہین'' شائع کیا جو بعد از اں سرنکوٹ کی ادبی تاریخ میں ایک سنگِ میل ثابت ہوا۔

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزر گئی
دنیا تو لطف لے گی مرے واقعات سے

مئی 1973ء میں فخر ایشیاء کرشن چندر، حکومتِ ہند کی تحریک پر اپنی زندگی کو لے کر ایک دستاویزی فلم کی تیاری کے سلسلہ میں پونچھ تشریف لائے تو میں نے ان کی دعوت ایک چائے پارٹی کے حوالے سے کی۔ وہ 28 مئی 1973ء کو ہائی اسکول سرنکوٹ میں تشریف لائے تو میں نے اپنا افسانہ ''میں کیا ہوں'' محفل میں پڑھ کر سنایا۔ جسے سننے کے بعد انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ وفات سے قبل انہوں نے مجھے ایک خط لکھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ایک مکان کا انتظام کر کے رکھوں کیونکہ وہ زندگی کے آخری ایام پونچھ' خاص کر سرنکوٹ میں گزارنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اعادہ کیا کہ وہ ایک جدید پریس لگا کر پونچھ وراجوری کے ادبا وشعراء کی ادبی تخلیقات کو شائع کریں گے اور پونچھ کے عوام کی خدمت کریں گے۔ (خط کی نقل ملاحظہ کیجئے) کرشن چندر عارضۂ قلب کے مریض تھے۔ بھائی مہندر ناتھ اور بہن سرلا دیوی کی بے وقت موت نے ان کو دل گرفتہ کر دیا اور وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے جس کے باعث کچھ ادھورے کام چھوڑ کر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اُن کی وفات 8 مارچ 1977ء کو ہوئی

جس نے پوری اُردو دنیا میں ایک وسیع خلا پیدا کر دیا۔

30 جنوری 1978ء کو کرشن چندر کے تئیں خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے بزم ادب سرنکوٹ کا نام تبدیل کر کے کرشن چندر میموریل بزم ادب سرنکوٹ رکھا گیا اور بزم ادب کو سوسائٹیز ایکٹ کے تحت رجسٹر بھی کروادیا گیا۔

اسی سال جناب خوشدیو مینی نے اُردو ادب کی اس تاریخ ساز شخصیت کے نام نامی سے منسوب کرشن چندر میموریل کلب قائم کیا اور پونچھ میں نہ ختم ہونے والی ادبی وثقافتی سرگرمیوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔

سرنکوٹ میں کچھ اور نوجوانوں نے کلچرل فروغ کے لئے کچھ ایسی تنظیمیں بنائیں جنھوں نے آگے چل کر اس شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ لیکن بعد ازاں ان کے منتظمین نوجوان بھی اپنی پیشہ وارانہ سرگرمیوں کے باعث اس سلسلہ کو جاری نہ رکھ سکے۔ اور یہ تنظیمیں آہستہ آہستہ تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ ان میں محمد رفیع میموریل کلچرل کلب' جسکے سربراہ شیخ ظہور تھے اور جو بعد ازاں جموں منتقل ہو گئے۔ اوم پرکاش شرما بھی جموں منتقل ہو گئے اور خواجہ نثار احمد، شیخ رفیق احمد اور ان کے دیگر رفقائے کار بھی جموں منتقل ہونے کے باعث اپنے فن اور ان تنظیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔

حویلی پونچھ میں ادب اور ثقافت کی ترویج واشاعت کی غرض سے بہت ساری ادبی تنظیموں نے اپنی خدمات انجام دیں، چاہے، اُن کی کاوشوں کے پیچھے کوئی بھی جذبہ کارفرما رہا ہو۔ جن کا جذبہ صادق تھا وہ اپنی کارگزاری سے وقت کے منصف کو شاداماں کر گئے اور تاریخ کیا کہے گی یہ سوال بھی چھوڑ گئے۔

لیکن جن کا جذبہ، وقتی اور جذباتی تھا وہ حرف غلط کی طرح حذف ہو گئے۔ حالیہ دور میں بزم یادگارِ حسرت، کوہسار کلچرل آرگنائزیشن، کہکشاں کلب، سرسنگم پربھات، سرسوتی سنگیت کلا کیندر، پنجابی ساہتیہ سبھا، کرشن چندر کلب، سرسوتی سنگیت ودیالیہ وغیرہ تنظیموں نے جنم لیا، کچھ تو فعال ثابت ہوئیں اور کچھ صرف تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ پونچھ میں ڈاکٹر بشیر بدر کے نام ایک شام اور جناب ندا فاضلی کے اعزاز میں دی گئی ادبی نشستیں بھی ادبیاتِ پونچھ کی تاریخ کا سنہرا باب ہیں۔

تحصیل مہنڈر میں بلاشبہ بہت اچھے قلمکار موجود ہیں مگر اُنہوں نے کبھی کسی فعال تنظیم کو معرض وجود میں نہیں لایا اور اگر لانے کی کوشش بھی کی تو اُن کا وجود پیدا ہونے سے قبل ہی مٹ گیا۔

زیر نظر کتاب میں سالہا سال کی تاخیر کی وجہ سرحد کے اُس پار سابقہ ریاست کے اُس حصے کے ادیبوں کی تخلیقات کی عدم دستیابی ہے، پہلے تو دونوں ممالک کے تعلقات پر جمی تناؤ کی برف نہ پگھلی۔ اب جب یہ برف پگھلی

تو میرے لئے ہی نہیں۔

اُس پار کا کوئی ایسا ادیب جو میری خواہشات کو سمجھ سکے اُس سے رابطہ بھی نہ ہو سکا۔ بہرصورت مستقبل میں اگر حالات سازگار رہے تو اُن ادباء و شعراء کی تخلیقات کو ادبیاتِ پونچھ کے دوسرے حصے میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

اس وقت تک میں نے شکریہ ادا کرنے کی تکلفانہ رسم سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ تاہم مختصراً یہ ضرور کہوں گا کہ میں اپنے ان کرم فرماؤں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اپنے مخلصانہ تعاون سے نوازا اور ان دوستوں سے مجھے کوئی شکوہ نہیں جنہوں نے دانستہ یا غیر دانستہ میری اس کاوش میں حصہ ڈالنے سے گریز کیا ؎

دیکھو یہ میرے خواب تھے، دیکھو یہ میرے زخم ہیں

میں نے تو سب حسابِ جاں برسرِ عام رکھ دیا

زیرِ نظر کتاب میں جن اصحاب کی تخلیقات کو پیش کیا جا رہا ہے اُن کی تخلیقات کا اسلوب یا ان کے اپنے متعلق میں مختصراً اپنی رائے، جیسا کہ میں نے انہیں پایا، پیش کر رہا ہوں۔ اگر کسی کو اس سے اختلاف ہو تو اس کا اظہار اُس کا حق ہے۔ میری اس کاوش کے متعلق مجھے اپنے باوقار قارئین کی آرا کا انتظار رہے گا۔

☆ **محمد دین بانڈے** میرے بزرگ بھی تھے اور دوست بھی۔ صلاح کار اور خیر خواہ بھی۔ ادبیاتِ پونچھ کے حوالے سے انہوں نئے بہتر صفحات پر مشتمل ایک طویل مقالہ لکھ کر دیا۔ اور اس کی اشاعت کے لئے بار بار زور ڈالتے رہے۔ لیکن اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے میں اس جانب توجہ نہیں دے سکا۔ شاید انہوں نے ہم سے جلدی رخصت ہونا تھا۔ لہذا مقالہ واپس مانگ لیا اور اپنے بڑے صاحب زادے نیاز بانڈے کو حکم دیا کہ اس مقالے کو کتابی شکل میں منظر عام پر لائیں۔ لیکن وہ بھی بانڈے صاحب کی علالت کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے۔ بانڈے صاحب کے انتقال کے بعد ان کے فرزند نے اسی مقالہ کو کتابی شکل میں بعنوان ''پونچھ تاریخ کے آئینے میں'' شائع کر دیا۔ عنوان وہی رکھا جو میں نے اپنی اس پیش کش کے لئے رکھا تھا بدیں وجہ مجھے ''ادبیاتِ پونچھ تاریخ کے آئینے'' میں کے بجائے ''ادبیاتِ پونچھ'' رکھنا پڑا۔ بانڈے صاحب بلا کی یادداشت رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں سادگی لیکن کاٹ اتنی زبردست تھی کہ نامور نثر نگار حضرات دانتوں تلے اُنگلی دبا لیتے تھے۔ اُن کی آخری خواہش جس کا اظہار انہوں نے اپنے مضمون میں کیا ہے ''میری دعا ہے کہ حدِ متارکہ کی یہ خونی لکیر مٹ جائے، برلن کی یہ دیوار گر جائے تاکہ ہم سب پھر ایک ہو جائیں، ہمارا درد ایک ہو جائے، ہماری دوا ایک ہو جائے''۔ خدا کرے ان کی یہ خواہش پوری ہو جائے اور برصغیر ہندو پاک سُکھ کا سانس لے سکے۔

☆**ڈاکٹر محمد صفیر خان** پوٹھی بالا راولاکوٹ پاکستانی کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ مئی ۲۰۰۱ء میں اشاعت شدہ ایک تاریخی کتاب بعنوان ''پونچھ کی تہذیب وثقافت'' کسی طرح پڑھنے کے لئے میرے ہاتھ لگ گئی۔ کتاب میں سابقہ ریاست پونچھ کے علاقے کرلوپ ،تھکیالہ پڑاوہ، کے پرگنوں کا ذکر نہ کر کے مصنف نے مضمون سے زیادتی کی ہے تاہم ڈاکٹر صاحب کی کوشش قابلِ تعریف ہے۔ اُن کے مضمون کا کچھ حصہ حسبِ ضرورت ادبیاتِ پونچھ میں شامل کیا گیا ہے تاکہ پونچھ کی تاریخ پر مزید روشنی ڈالی جاسکے۔

☆**کرشن چندر** ۔شاید ایسی ہی شخصیت کے لئے کسی نے کہا ہے کہ

؎ مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

کرشن چندر نے جس مٹی سے جنم لیا۔اس کا حق اُدا کرنے کے لئے اپنی تحریروں میں اسکا جگہ جگہ ذکر کر کے اسے جاوداں بنا دیا۔لفظ پونچھ اُن کے خون میں دوڑتا رہتا تھا۔مٹی کے صنم میں اپنی عقیدت کا اظہار یوں کرتے ہیں'' میں ایک شہر تھا،کوئی بہت بڑا شہر نہ تھا، میں تو یہاں نہایت شفاف اور حساس شہر تھا، میں نے خوشی دیکھی تھی،اعتماد اور بھروسہ اور محنتی ہاتھوں کا لمس مجھے حاصل تھا۔ میں ایک شہر تھا مگر کوئی میرے اندر نہ رہتا تھا...... کتنے ہی راستے ہیں میرے اندر جو پُونچھ کو جاتے ہیں، میں جدھر سے بھی چلتا ہوں، پُونچھ پہنچ جاتا ہوں۔ اکثر اس شہر کے کلس میری تنہائیوں میں چمک اٹھتے ہیں'' کرشن جی نے زندگی کے آخری ایام میں مجھ سے جو خط وکتابت کی اُس میں سے ایک خط اس پیش کش میں شامل کر رہا ہوں۔ کرشن جی سے اگر زندگی وفا کرتی اور وہ پروگرام کے مطابق سرنکوٹ آجاتے تو شاید پونچھ کی ادبی سرگرمیوں میں کتنے ہی انقلابات برپا ہوتے۔ انکا آخری سفر نامہ بعنوان'' ورق ورق کھوگئی زندگی میری'' اس کتاب میں شامل ہے جس کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔

کرشن چندر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ادب کی دنیا میں اُن کی تخلیقی مقبولیت کا راز رومانیت اور خوبصورت اندازِ بیان تھا۔ بلاشبہ ناول نگاری میں بھی اُن کو کمال حاصل تھا لیکن پریم چند مرحوم کے بعد اُردو افسانے کو جو نئی جہت انہوں نے دی شاید کوئی اور نہ دے سکے۔آپ کے مشہور افسانوں میں سے'' کالو بھنگی'' اس کتاب میں شامل کر کے ہم پونچھ کے اس بیٹے کو خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔

☆**مہندر ناتھ** ۔کرشن چندر کے چھوٹے بھائی تھے۔اگر کرشن چندر کے بھائی نہ ہوتے تو انفرادی سطحوں پر ہی کرشن چندر کے ہم پلہ ادیب بن کر ابھرتے۔ان کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا ہے کہ جیسے پیپل یا بڑھ کا چھتنار پیڑ اپنے سائے میں کم ہی پودوں یا سبزے کو پنپنے دیتا ہے۔ان کا افسانہ'' جہاں میں رہتا ہوں'' شامل کتاب ہے اور اپنی انفرادیت کی منہ بولتی تصویر ہے۔

☆**ٹھاکر پونچھی** ۔ریڈیو کشمیر سے مدتوں منسلک رہے۔ پونچھ میں جنم لیا۔ شاندار ادب تخلیق کرتے رہے۔ اُردو ادب کے تین چوتھائی صدی پر محیط سیمابؔ اکبر آبادی کے خاندان سے وابستہ رسالے ماہنامہ ''شاعر'' میں تواتر کے ساتھ ان کی نگارشات کا چھپنا ان کو اعزازی ادیب بناتا ہے۔ ان کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ ان کے آخری سوانحی ناول ''اب میں وہاں نہیں رہتا'' کو تقریباً ڈیڑھ سال تک ماہنامہ شاعر نے لگا تار قسطوں میں چھاپا۔ یاد رہے کہ یہ ناول پورے کا پورا پونچھ کی ہی روداد ہے۔ ان کا ایک خوبصورت افسانہ ''ادھ جلی رات'' کتاب میں شامل ہے۔

☆**سرلا دیوی**۔ مجھے سرلا دیوی کی ایک آدھ تحریر ہی پڑھنے کا موقعہ ملا۔ ان کے اسلوب نگارش اور زبان و بیان کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ وہ بھی اپنے فن میں یکتا تھیں۔ اگر چہ اپنے بھائی مہندر ہی کی طرح کرشن چندر کے مقابلے میں ان کا پنپنا مشکل تھا۔ ان کی تحریر ''شاردا'' کتاب میں شامل ہے جو ان کے فن اور شخصیت کی آئینہ دار ہے۔

☆**دیانند کپور** ۔مولانا چراغ حسن حسرتؔ اور کرشن چندر کے ہمعصروں میں سے تھے حسرتؔ صاحب سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ پونچھ کی تاریخ میں صحافت کی داغ بیل ڈالنے کے لئے اولین اخبار ''پر بھات'' جاری کیا اور لیتھو پرنٹنگ پریس بھی لگائی۔ پر بھات میں شائع ہونے والے مضامین اکثر قارئین کی دلبستگی کا سامان بن جاتے۔ قلم میں بلا کا زور تھا۔ میں نے جب ماہنامہ ''ستاروں سے آگے'' کے لئے کوئی تخلیق حاصل کرنے کے لئے ڈونکس میں ان کے گھر میں ان سے ملاقات کی تو میری بہت حوصلہ افزائی کی اور بیٹھے بیٹھے مضمون بھی لکھ دیا۔ ''اُردو ادب کو پونچھ کی دین'' کے عنوان سے انہوں نے حسرتؔ صاحب کی جو تصویر کشی کی ہے وہ کتاب میں شامل ہے۔

☆**خوشدیو مینی** ۔کثیر الجہت شخصیت کے مالک ہیں۔ علم تاریخ کے ماہر اور ضلع پونچھ کی تہذیب و تمدن کے آئینہ بردار بھی ہیں۔ افسانہ نگاری ہو یا شعر گوئی دونوں سے انصاف کرتے ہیں، راجوری اور پونچھ سے متعلق تواریخ کی اشاعت بھی کر چکے ہیں۔ پہاڑی قبائل سے متعلق تاریخ ''پہاڑی قبائل تاریخ اور تشخص'' بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ اگر اُردو زبان کی طرف زیادہ توجہ دیں تو اچھا ادب تخلیق کر سکتے ہیں۔ تنہائیوں میں شعروں کا لطف اٹھاتے ہوئے فرماتے ہیں۔ دل مسافر کا لگائے رکھنا / رات بھر آگ جلائے رکھنا

میں بھی ظاہر نہیں ہونے دوں گا / یہ بھرم تُو بھی بنائے رکھنا

☆**ڈاکٹر لیاقت جعفری** ۔علم و ادب سے بے پناہ شغف کے باعث نام کما رہا ہے

ہیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے لیاقت جعفری نے بحیثیت شاعر خود کو منوالیا ہے۔ علامتی شعری پیکر بناتے ہیں اور اُن میں حسیاتی رنگ بھر کر قارئین کو متحیر کر دیتے ہیں۔ تحقیق کے خارزاروں نے ان کے فن کو مزید جلا بخشی ہے۔ آزادی کے بعد کی اُردو شاعری کی فکری اساس کے موضوع پر ضخیم تحقیقی مقالہ قلم بند کر کے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ میری دعا ہے کہ وہ اپنے ادبی سفر کو جاری رکھتے ہوئے نئی اور اچھوتی منزلوں کا سراغ ڈھونڈیں۔

؎ مجھ سے خوشبو پوچھ رہی ہے/ میں نے کتنے پیڑ تراشے

دریا کا مطلوب سمندر/ تشنہ لب دریا کو تلاشے

☆**شام سندر آنند لہر** - پونچھ سے نقل مکانی شاید اُن کے وکالت پیشہ کا شاخسانہ ہے۔ اس وقت جموں ہائی کورٹ کے نامور وکلاء کی صف میں شامل ہیں۔ افسانہ نگاری میں انتہائی بلند مقام حاصل ہے۔ ابتداً شعر گوئی بھی کرتے تھے اور خوب کرتے تھے لیکن اب شعر گوئی سے کنارہ کر لیا ہے۔ ''گوری'' کے عنوان سے ان کا افسانہ کتاب میں شامل ہے۔

☆**شیخ خالد کرار** - اولاً اندازہ کرنا مشکل تھا کہ شیخ خالد کرار اچھے افسانہ نگار ہیں یا اچھے شاعر۔ لیکن اب اُن کی شاعری نے منوالیا ہے کہ وہ ایک بہترین جدید شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری میں یاسیت وحرمان اور فکر فلسفہ مرکزی اسلوب ہیں۔ زبان و بیان کی باریکیوں سے روشناس ہیں۔ افسانہ نویسی اور شاعری دونوں اصناف میں صاحبِ کتاب ہیں۔ ریاضت جاری رہی تو ریاستی سطح پر اپنے فن کو منوالیں گے۔ یقیناً ہمارے علاقے کا ادبی مستقبل ان ہی جیسے نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ بات ہم پیش رووں کے لئے باعثِ راحت ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

پُرکھوں کی کہانی میں یہ کردار نہیں تھا/ سردار تھے سب کوئی سرِ دار نہیں تھا

پُھولوں کے حوالوں سے اٹی ساری کتابیں/ خوشبو کی دکانوں پہ خریدار نہیں تھا

ان کا ایک مختصر افسانہ ''اب گلدانوں میں بھوک سجائیں'' کتاب میں شامل ہے۔

☆**مالک رام آنند** - ۱۹۴۷ء میں سابقہ ریاست پونچھ کے علاقہ بانڈی عباس پور ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے اور جموں پیر مٹھا میں جا بسے۔ میرے ہمعصر تھے اور جگری دوست بھی۔ ''ستاروں سے آگے'' میں ادبی معاونت کرتے تھے۔ ہم نے ایک مکمل ادبی جریدے کا اجراء کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ مگر موت کے بے رحم ہاتھوں نے انہیں ہم سے چھین لیا۔ وہ ایک بہترین افسانہ نویس اور ناول نگار تھے، پونچھ کے لیے یا پونچھیوں کے لئے اس قدر جذباتی کہ وہ پونچھی پہلے تھے اور باقی کچھ بعد میں۔ اُردو شاعری کے ساتھ اُن کا ایک

جذباتی رشتہ تھا۔ اور نہایت ہی روایتی لہجہ رکھتے تھے۔

شہریاروں کو پتہ کیسے یہ چل جاتا ہے/ جب فقیروں کا جنوں شعلوں میں ڈھل جاتا

حق پرستوں کو غنیمت ہے یہ کانٹوں کا چمن/ فرشِ گُل ہو تو بدن اُن کا ہی جل جاتا ہے

☆**ٹھاکر مدن سنگھ**۔ ٹھاکر پونچھی صاحب کے چچازاد بھائی ہیں۔ افسانہ نویسی سے شغف ہے۔ ان کا معاملہ بھی تقریباً مہندر ناتھ جیسا ہی رہا ہے۔ میری اس پیش کش میں ٹھاکر پونچھی کے حوالے سے میسر مواد کی فراہمی میں اُنہوں نے نہایت دلچسپی اور ہمدردی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک افسانہ بعنوان ''سورگ سیڑھی'' آپ کی نظر ہے۔

☆**حسام الدین بیتاب**۔ اپنے علاقے کی ادبی سرگرمیوں کے محرک رہے ہیں۔ ان دنوں درجہ فہرست ذاتوں کی نمائندگی کے لئے مصروف ہیں۔ اگر زندگی بھر محدود حصار میں گھرے نہ رہتے تو بہت کچھ کر جاتے۔ عقیدہ کے پختہ ہیں اور روایتی شاعری کر لیتے ہیں۔ نثر میں کافی دم ہے۔ ایک سال سے پندرہ روزہ ''دامن شب'' سے منسلک ہیں۔ فرماتے ہیں۔

توجہ اہل بینش کی ہٹی جاتی ہے جو مجھ سے/ شہر میں پھر کسی نے کچھ تماشہ کر دیا ہو گا

☆**جاوید راہی**۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ کمال کے ذہین اور صاحبِ فن ہیں۔ بجا طور کہا جا سکتا ہے کہ جاوید راہی کی جدید اُردو شاعری پونچھ کے ادب کا عظیم سرمایہ ہے۔ اکثر وقت گوجری زبان اور گوجر ملت کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔ اُردو غزل کے ساتھ وفا نہ کر کے انہوں نے اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ دیر سویر اُن کی ایک آدھ غزل پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ جس سے عیاں ہوتا ہے کہ اگر ڈاکٹر جاوید راہی اپنے مخصوص ملی جذبات سے فرصت پاتے تو جدید اُردو شاعری کے منظرنامے پر اپنا زبردست اثر چھوڑتے۔

دشمنوں کے حال کا تھوڑا اندازہ رکھو/ لاکھ دیواریں بنا دو ایک دروازہ رکھو

اس طرح بھی آزماؤ تم طبیبوں کی دوا/ ہر مسیحا کو دکھاؤ زخم کو تازہ رکھو

☆**شاھنواز**۔ حال ہی میں تخلیق کا کھاتہ کھولا ہے۔ ادب کی تاریخ اور تنقیدی ارتقاء کو نظر میں رکھنے کا خاطر خواہ شعور رکھتے ہیں۔ ریاستی کلچرل اکادمی کے شعبۂ گوجری سے منسلک ہیں۔ اس لئے ان کی اکثر تحریریں گوجری زبان و ادب سے متعلق ہی منظر عام پر آتی ہیں۔ دعا ہے کہ وہ اپنے مخصوص دائیرۂ ادب کو وسیع کر کے ہر ایک آنکھ کا تارہ بن جائیں۔

☆**موتی لعل کپور**۔ آپ دیانند کپور صاحب کے صاحب زادے ہیں۔ پونچھ ڈونکس سے

نقل مکانی کے بعد جموں کی اپنا وہار کالونی میں جا بسے ہیں۔ ایک مدت سے آنکھوں کی بینائی کھو چکے ہیں۔ ساری ملازم محکمۂ انفارمیشن میں بہ حیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ نظم میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں لیکن نثر میں دم خم ہے۔ دیانند کپور صاحب کی وفات کے بعد مرحوم چراغ الحسن حسرتؔ اور دیانند کپور صاحب کی زندگی پر روشنی ڈالنے کی غرض سے ''روشن چراغ'' کے عنوان سے ایک تاریخی کتاب شائع کر کے ادب میں اپنا حصہ ڈال چکے ہیں۔ جس کا نمونہ شامل کتاب ہے۔

☆**ڈاکٹر رفیق انجم** ۔ چائلڈ اسپیشلسٹ ہیں۔ چنڈک پونچھ سے نقل مکانی کر کے راجوری شہر میں رہائش پذیر ہیں۔ گوجری زبان کے شاعر ہیں۔ اُردو کے بجائے گوجری میں مقابلتاً اچھی شاعری کر لیتے ہیں۔ نثر میں بھی اپنی کاوشوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

تشنگی میری گئی نہ میری تنہائی گئی / دامنِ گیتی میں اُلفت کی کمی پائی گئی

؎ ہم نے پوچھا کیا ہوئی تھی جو جوانی آپ کی / بولے وہ رحمت خدا کی تھی جو آئی، گئی

☆**مولانا چراغ حسن حسرت** ۔ حسرتؔ بنیادی طور پر ایک اعلیٰ صحافی تھے۔ لیکن فطرت نے انہیں لازوال شاعرانہ جبلت بھی بخشی تھی۔ زبان و بیان پر بے پناہ دسترس تھی۔ آپ پونچھ کا عظیم سرمایہ تھے اور اُردو ادب کو پونچھ کی طرف سے ایک گرانقدر سرمایہ اور تحفہ بھی کوئی بد بخت ہی ہوگا جو آپکی شاعری کو سلام نہ کرے۔ غزل جیسی نازک صنف میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ آپ نے ہی فرمایا تھا

؎ غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سُنا تم نے / کچھ ہم سے کہا ہوتا' کچھ ہم سے سُنا ہوتا

جوانی مٹ گئی لیکن خلش دردِ محبت کی / جہاں معلوم ہوتی تھی وہاں معلوم ہوتی ہے

☆تحسین جعفری۔ آپ اُستاذ الاستاذ تھے، طبعاً فطری شاعر تھے۔ آپ کے اشعار میں مذہبیت کا عنصر غالب ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ حصارِ عقائد سے باہر نکلا آپ کے نزدیک روا نہ تھا۔ لہٰذا موہوبی صلاحیتوں کا مفاد دائرہ محدود تک ہی رہا۔ غزل میں بھی کبھی کبھار طبع آزمائی فرماتے تو کہتے۔

عارضِ سیمیں پہ خمِ زُلفِ رسا ہونے تو دو / جس پہ سب مرتے ہیں پیدا ہوا دا ہونے تو دو

نہ پاسِ قوم باقی ہے نہ عزت باپ دادا کی / عجب مدہوش ہم کو کر دیا فیشن پرستی نے

☆**پرتپال سنگھ بیتاب**۔ برِصغیر کے گنے چنے شعراء میں شامل ہو چکے ہیں۔ جدید رنگ، نیا آہنگ قابلِ رشک ہے۔ بہت سے شعری مجموعے منظرِ عام پر آ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ اُنہوں نے اپنیا نفرادیت کے باعث عالمی پیمانے پر اپنی پہچان بنا کر پونچھ کے نام کو روشن کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

تم کسی نام سے پکار و ہمیں/ ہم تو پہچان کھو چکے ہیں میاں
دنیائے رنگ وبُو سے کنارا نہیں کیا/ اچھا کیا جو ہم نے دکھاوا نہیں
ہم جسم کو بچا نہ سکے گرد سے مگر/ یہ تو کیا کہ روح کا میلا نہیں کیا

بیتابؔ کی شاعری مین اُن کی انفرادی سرشت جھلکتی نظر آتی ہے، یاس و حرمان کے عناصر شعروں میں ڈھلتے نظر آتے ہیں، کہیں وہ اپنی کشتِ ویراں سے گلا گزار ہیں، اور کہیں اپنے بازِ ومشقت سے کنگ نظر آتے ہیں۔ بہر کیف۔ اپنے درون کو شعری سانچوں میں ڈھالتے رہتے ہیں جو اگر چہ عام فہم نہیں لیکن اہلِ بصیرت کے لئے اظہر من الشمس ہوتے ہیں۔

☆**بلراج کمار بخشی**۔ ۱۹۴۷ء کے پر آشوب دور نے ان کو بھی سابقہ ریاست پونچھ سے نقل مکانی کر کے اودھم پور میں بسنے پر مجبور کر دیا۔ اُردو زبان سے ان کا عشق اس قدر گہرا ہے کہ اودھم پور کا ماحولیاتی تکدر انہیں متاثر نہ کر سکا اور وہ آج تک اپنی موروثی روایات کی آبیاری کر رہے ہیں۔

ہر کسی کو نہ آزمایا کرو/ میں جو کہتا ہوں مان جایا کرو
آؤ دل کے چراغ سے کھیلیں/ میں جلاؤں گا تم بجھایا کرو

☆**دینا ناتھ رفیق**۔ کرشن چندر کے اُستاد رہے ہیں، کبھی نہ جانے کس جذبے کے زیر اثر کرشن جی کو شعر کہنے پر طمانچہ جڑ دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کرشن چندر عظیم شاعر کے بجائے عظیم افسانہ نگار بن گئے۔ جس کا اظہار کرشن جی نے خود بھی کیا ہے۔ ماسٹر جی بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ضلع پونچھ کی زمینِ شاعری میں یکتا تھے۔ ڈوگرہ اقتدار کے نہایت قریب رہے۔ ایک مُدت تک ان کے زیر سایہ کسی شاعر کو پنپنے کا موقعہ نہ ملا۔ نہایت ہی زبان شناس شاعر تھے۔

کرم فرمائیاں ہیں یہ جنابِ عشق کی مجھ پر/ خدا کو بھول بیٹھا ہوں تجھے ہی یاد کرتا ہوں
تیرے عفو و عطا، جور و جفا سے دل کی بستی کو/ کبھی آباد کرتا ہوں کبھی برباد کرتا ہوں

☆**بلدیو راج رہبرؔ**۔ میرے دوستوں میں سے تھے، روایتی غزل کے علمبردار۔ اُن کی غزلیں سچ مچ کا شاہکار ہوتی تھیں، سگریٹ کی ڈبیوں پر لکھتے یا پرزوں پر اور پھر نذرِ آتش کر دیتے، میری میڈیکل شاپ پر اکثر بیٹھے رہتے اور کبھی کبھی مجھے مخاطب کر کے شعر کہتے۔ ایک بار ایک آزاد نظم کھڑے کھڑے لکھی جو اس پیش کش میں شامل ہے۔ ازدواجی زندگی کی محرومیوں کی وجہ سے انگور کی بیٹی سے ایسی سانٹھ گانٹھ ہوئی کہ پھر زندگی کی طرف لوٹ کر نہ آسکے۔

کچھ شوق کے مارے پیتے ہیں کچھ درد کے مارے پیتے ہیں
بدنام تو میں ہوں لوگوں میں لیکن یہ سارے پیتے ہیں

☆**سرون ناتھ آفتاب**۔آزادی سے قبل پونچھ مین اُردو ہفت روزہ ''آفتاب'' شائع کر کے صحافت کی ابتداء کرنے والوں اور پونچھ میں بزمِ ادب کا قیام عمل میں لانے والوں میں شامل ہو گئے۔اپنے عہد میں شاعری کے حوالے سے نہایت ہی منفرد اور معتبر مقام کے حامل ہو گئے تھے۔

تم اپنے حُسن پہ اتنا نہ اتر واؤ نہ اتراو/تمہارا حسن میرے دل کی چاہت کے سوا کیا ہے

☆**مسعود الحسن مسعود**۔مشہور زمانہ شعرا اور صحافی چراغ الحسن حسرت کے بھانجے تھے۔طنز و مزاح میں یکتا تھے۔روایتی غزل ہو یا نظم خاصی شہرت رکھتے تھے۔ابتدائے جوانی سے ہی دُکھی اور پریشان تھے۔بنتِ عنب سے اس قدر آشنائی تھی کہ اسی کو ہر غم کا مداوا گردانتے تھے،اس اضطرابی کیفیت میں کچھ زیادہ نہ کہہ کر ہم سے دور جا بسے۔مشاعروں کی جان اس شاعر کے بکھرے ہوئے کلام کو یکجا کرنے کی توفیق ان کے بڑے بھائی محمود الحسن محمود کو حاصل ہوئی ہے۔جو منظر عام پر آ چکا ہے۔ان کا بعض کلام سرقہ بھی کر لیا گیا ہے۔

ادھر جذبِ محبت کی فراوانی کا یہ عالم/ اُدھر الفت برائے نام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
سراپا جُرم ہیں پھر بھی خدا سے ڈرنے والوں میں/ سرفہرست اپنا نام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

☆**عنایت تنویر**۔معاشی بدحالی کی وجہ سے اکثر زندگی صحرا نوردی میں گزاری۔دکھوں اور تکالیف کو شعری پیکروں میں ڈال کر اپنے دکھوں کا مداوا کرتے رہے۔جواں عمری میں ہی راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔

ریزہ ریزہ ہو گیا ہوں ٹوٹ کر/حسنِ ظن جو درمیاں تھا کیا ہوا
کھا گئی تنویر دیمک یہ مکاں/ جو مکیں تھا جانِ جاں تھا کیا ہوا

☆**بشارت جاذب**۔شعر گوئی کا بہت شوق تھا لیکن زندگی کی پیچیدگیوں نے اتنا الجھائے رکھا کہ کچھ زیادہ نہ کہہ سکے۔زندگی وفا کرتی تو بہت کچھ کہہ جاتے۔''زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے''

موت کی دو ہچکیوں نے کر دیا قصہ تمام/کیا عجب شئے تھی جسے ہم زندگی کہتے رہے
تم مجھے اور میں تجھے الزام دیتا ہوں مگر/اپنے اندر جھانکتا تو بھی نہیں میں بھی نہیں

☆**فاروق مغل پرواز**۔جدید شعرا میں شامل ہیں۔ان کے فن کو زیادہ جلا تب ملی جب علی گڑھ کے شعبۂ اُردو کے صدر جناب شہریار کے ساتھ منسلک رہے۔ملک کے معتبر ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن اب مُدت سے ان کی کوئی نئی تخلیق پڑھنے کو نہیں ملی۔لیکن جو لکھا کمال لکھا۔

کام آیا نہ کوئی درد پرانا اپنا / ہر کوئی ڈھونڈ رہا تھا یہاں سایہ اپنا
میں کسی خواب کی تہذیب کا پروردہ ہوں / آئینہ دیکھتا رہتا ہے سراپا اپنا

☆**خورشید کرمانی** ۔اُردو اور پہاڑی زبان کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔شاعری میں روایتی اور جدید رنگوں کا امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔شاید اسی لئے قارئین ان کی شاعری کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔اُردو شعری مجموعہ ''دُکھ کے موسم'' طبع ہو چکا ہے۔نثر نگاری کی طرف دھیان دیں تو مزا آجائے۔

ہمت کیسی مجبوری ہے / تنہا دریا روک رہا ہوں

☆**محمود الحسن محمودؔ** ۔ان کو بھی مولانا چراغ حسن حسرتؔ کا بھانجہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔پونچھ کے نمائندہ شعراء میں سے ہیں۔رنگ روایتی ہی سہی لیکن فن کے اُجلے پن سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔دینی رجحان ترقی پذیر ہے۔خوددار ہیں، خداشناس ہیں۔شاعری برائے اصلاح کے مقلد ہیں، جو کہتے ہیں دل کو چھو جاتا ہے۔

سینے میں حادثوں کو سپر کرلیا کرو / کام ہے کٹھن سا مگر کرلیا کرو
فکرِ معاش اور غم زندگی کے ساتھ / ذکرِ خدا بھی شام وسحر کرلیا کرو

☆**علمدار حسین عدمؔ** ۔نوخیز کلی کا یہ عالم ہے تو پھول کا عالم کیا ہوگا۔رنگ ولہجہ روایتی ہے۔دلوں کو موہ لینے کا فن جانتے ہیں۔عمر کے ساتھ ساتھ فن میں پختگی بھی آجائے گی۔

زمانے کا مقدر ہوگیا ہے / وہ صحرا تھا سمندر ہوگیا ہے
نگلتا جارہا ہے آسماں بھی / جہاں والو! وہ اجگر ہوگیا ہے

☆**امتیاز نسیم ہاشمی** ۔پہاڑی زبان میں شاعری کی طرف قدرے زیادہ راغب ہیں۔''چنکارا'' کے عنوان سے پہاڑی شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے جسے ریاستی کلچرل اکادمی نے سال ۲۰۰۳ء کے بہترین پہاڑی شعری مجموعے کے اعزاز سے نوازا ہے۔اُردو شاعری میں شہریار صاحب سے کافی متاثر نظر آتے ہیں اُنہی کے رنگ میں شعر کہتے ہیں۔

میں تو صحرا تھا مگر سبز ہوا جاتا ہوں / جانے کس جسم کو چھو کر یہ ہوا آتی ہے

☆**عبد الغنی جاگل** ۔دینی وادبی علوم پر خاصی دسترس رکھتے ہیں، عروضیات وکوائفِ شعری کے انتہائی مقلد ہیں۔شاعری ورثے میں پائی ہے، شخصیت میں عجب طرح کا اضطراب ہے، جو شعروں میں در آتا ہے۔نثر نگاری میں بھی کافی زور ہے۔اگر اُن کا پیشہ اُن کے آڑے نہ آیا تو بلندیوں کو جالیں گے۔

بڑا چالاک ہے عیار بھی ہے/ قبیلے کا مگر سردار بھی ہے
قسم تسبیح کے دانوں کی مجھ کو/ پریشاں صاحبِ زنار بھی ہے

☆**مختار الدین ظہیر**۔ شعری ماحول سے دور ہوتے ہوئے بھی شعری ذوق رکھتے ہیں اور خوب شعر بھی کہہ لیتے ہیں، نوک پلک سنوارنے کے لئے استاد کی ضرورت ہے۔

سنوں باہر کی آوازوں کو کیسے/ میرے اندر بھی کوئی چیختا ہے
حساب اب تک لگایا ہے کسی نے/ سمندر کتنے دریا پی گیا ہے

☆**پرویز مانوس**۔ ابتداً مایوس تھے۔ لیکن جب مایوسی کسی مقام پر اُنس اور خوشی میں ڈھل گئی تو مانوس ہو گئے۔ نقل مکانی نے پونچھ سے سرینگر پہنچا دیا۔ حال ہی میں ایک شعری مجموعہ حکیم منظور صاحب کی نگرانی میں منظر عام پر لایا ہے۔ پہاڑی میں بھی لکھتے ہیں۔ اشاعت کے سلسلہ میں معیار پر دھیان نہیں دیتے، یعنی جھٹ منگنی پٹ بیاہ کے قائل ہیں۔

یہ عالم جگمگائے گا سحر پھر سے جواں ہوگی/ رخ روشن سے زلفیں تو ہٹاؤ چاند کہتا ہے

☆**مستور احمد شاد**۔ نامساعد حالات نے تعلیم حاصل نہ کرنے دی۔ فطرتاً شاعر ہیں۔ بہتر تعلیم اور بہترین ماحول نصیب ہوا ہوتا تو یقیناً فن کی معراج تک جا پہنچتے۔ پھر بھی سرنکوٹ کی سنگلاخ دھرتی پر رہ کر جو کہہ لیتے ہیں وہ کسی سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔

اب کے کیسی فصل اُگی ہے/ پھول بھی اب پتھر لگتا ہے
اُس کی بات میں زہر ہو جیسے/ ایسا کیوں اکثر لگتا ہے

☆**احتشام بٹ**۔ علاقہ منڈی کے مشہور خطیب بشیر بٹ کے چچازاد ہیں۔ اگرچہ ابھی نوآموز ہیں شعر او ادب کی طرف رجحان وراثتاً ہے۔ چند غزلیں پڑھنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگر سنجیدگی سے اس جانب راغب رہے تو فن کی بلندیوں کو پہنچ جائیں گے۔

ہم کو معلوم ہے معلوم ہمیں کچھ بھی نہیں/ بے خبر ہو کہ بھی ہم سب کی خبر رکھتے ہیں

☆سرور حبیب۔ پیشہ کے لحاظ سے سپرانٹنڈنٹ پولیس ہیں، صاحبِ کتاب بھی ہیں اُردو اور گوجری دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کر لیتے ہیں۔ ریاضت کی ضرورت ہے اگر پیشہ مخل راہ نہ ہوا تو ادب میں گرانقدر حصہ ڈالیں گے۔

نہ ہمیں یوں جدا کرو لوگو/ کچھ تو خوفِ خدا کرو لوگو

رنگ و مذہب نہ بیچ میں آئے/آج مل کر دعا کرو لوگو

☆**ڈاکٹر شیو رتن لعل برقؔ**۔ درابہ سرنکوٹ سے ۱۹۶۵ء میں ہجرت کر کے دہلی میں جا بسے۔ ماہنامہ برقؔ کی کئی سال تک اشاعت کی۔ بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ ادب برائے زندگی کی خاطر لکھتے ہیں، فنی صلاحیتوں میں یکتا ہیں مبالغہ آرائی سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

برقؔ ان سے سیکھ لے جینے کی ہر ادا/ جو جی رہے ہیں موت کے دامن میں بیٹھ کر

☆**نذیر حسین قریشی** :معروف استاد، بہترین مقرر، مقالہ نویس اور ناقد کی حیثیت سے ان کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کے مقالات اور مضامین اکثر و بیشتر اخبارات ورسائل کی زینت بنتے رہے ہیں۔

پُونچھ کے ان نئے پرانے ادیبوں اور شاعروں پر میرا یہ تبصرہ کوئی حتمی اور حرفِ آخر نہیں ہے، کئی ادیب اپنے سفر کے ابتدائی مراحل میں ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو اپنی تخلیقات کے باعث ریاستی اور ملکی سطح پر اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔

ادبیاتِ پونچھ کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کے حوالے سے میں ڈاکٹر لیاقت جعفری، عبد الغنی جاگل، شیخ خالد کرارؔ، ڈاکٹر جاوید راہیؔ، سمیت اپنے بہت سے دوسرے قلمکار دوستوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے اس دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں اپنا بھرپور تعاون دیا۔

ادبیاتِ پونچھ اب مکمل ہے اور آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

محمد ایوب شبنم

۲۵ دسمبر ۲۰۰۶ء

سرنکوٹ (پُونچھ)

پُونچھ

تاریخ کے ادبی، سیاسی، سماجی، تمدنی وثقافتی آئینہ میں

محمد دین بانڈے

پونچھ کبھی ایک ریاست، بعد ازاں جاگیر اور آج تین تحصیلات پر مشتمل سرزمین جس کو حدِ متارکہ کی مصنوعی لکیر نے منقسم کرکے رکھ دیا۔ ایک تاریخ، ایک عہد، رنگا رنگی میں ہمہ رنگ، انجمن، مشترکہ تہذیب وتمدن کا گہوارہ، انسان دوستی کا وارث، جہاں آج بھی انسانی دردمندی اور سادہ لوحی کے جذبے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ زندہ و پائندہ ہیں۔ جہاں کے کچے گھروں کی چاردیواری میں، حدِ متارکہ کی

کچھ ان کے بارے میں:

نام: محمد دین بانڈے

ولدیت: رحیم جو بانڈے

پیدائش: 26اپریل1930ء(موضع اڑائی)تحصیل حویلی

وفات: 6جون2005ء

تعلیم: بی اے، ایل ایل بی(علیگ)ادیب فاضل۔

تصنیفات: پونچھ تاریخ کے آئینے میں، مقالات ریڈیو واخبارات۔

پیشہ: انسپکٹر آف اسکولز، وکالت، سیاست۔

سابق ممبر لیجسلیٹر کونسل۔سابق ڈپٹی منسٹر اطلاعات۔سابق وائس چیئرمین پہاڑی ایڈوائزری بورڈ۔

ذریعۂ اظہار: اُردو، انگریزی

لٹکتی تلوار کا بھیانک سایہ، زمانے کی کٹھن آزمائش، شب و روز توپوں کی گھن گرج، غربت و افلاس، بیکاری، اقتصادی بدحالی اور اربابِ بست و کشاد کا بے مروّت حُسنِ سلوک و سرد مہری، اور ترقی پذیر شہروں کی دھواں دھواں تہذیب، اس دھرتی کے مہکتے پیار کو زہر آلود نہ کر سکی ہے۔ یہی اس مقدس سرزمین کا طرۂ امتیاز بھی ہے اور قابلِ رشک تمثیل و تقلید بھی، یہی اس مقدس سرزمین کی منفرد کہانی، اور پھر میری زبانی، طویل داستان کو الفاظ کا جامہ پہنانا، اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس خطۂ ارض کے حسن و جمال کی عکاسی مولانا ظفر علی خان، فی البدیہہ شاعر، قلم کے شہسوار، اُردو ادب کے اُفق پر روشن آفتاب، نے 1940ء میں اسلامیہ ہائی اسکول پونچھ کے سالانہ اجلاس میں حاکمِ وقت راجہ جگدیو سنگھ کی صدر نشینی میں ایک تاریخی شعر کہہ کر ایک جاودانی حقیقت کا انکشاف کیا، یہ شعر آج بھی زبان زدِ عام ہے۔

خطۂ پونچھ کو کشمیر کے عارض کا تل کہیے

اسے ہندوستاں کی جاں کہیے یا دل کہیے

سرزمینِ پونچھ، پراچین زمانے سے آج تک کئی راز سینے میں محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ راون کے دادا پلست کو علم و آگہی ریاضت و عبادت Meditation اور تپسیا کے لئے اس تاریخی شہر کی سرزمین کا انتخاب کرنا پڑا۔ بدیں وجہ جغرافیہ پونچھ مرتبہ مرحوم چوہدری دیناناتھ رفیق، مرحوم سرفراز حسین تحسین جعفری، میں پونچھ کی وجہِ تسمیہ کو پلست رشی کے نام سے نسبت کا ذکر ہے۔ جس کا تذکرہ 631ء ہیون سانگ کے تاریخی سفرنامہ کے اوراق کی زینت بنا اور کشمیری زبان کی آمد سے پرونس اور پنجابی، پہاڑی زبانوں کی آمیزش کی وجہ سے آج پونچھ کے نام سے معروف و مشہور ہے۔ منڈی راجپور جہاں بوڑھا امرناتھ کا مندر ایک قدیم تاریخ کا شاہد، جہاں شہزادہ بن دیو جو مہابھارت میں بھیم سین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے نے ایک شیولنگ لا کر نصب کیا۔

پانی کی ''باؤلی'' رام کنڈ، دیگر تعمیرات اپنے جاہ و جلال میں آج بھی رام چندر جی مہاراج کی بن باسی زندگی کے امتحانی دور کی منہ بولتی تصویر ہے۔ کوروؤں اور پانڈوؤں کی تعمیرات کے کھنڈرات ان مٹ نشانات، مہابھارت کی کہانی زبانِ خاموش سے سناتے چلے آرہے ہیں۔ لوہر کوٹ (موجودہ لورن گاؤں) جو کبھی کشمیر کی راجدھانی رہا تھا، وہاں کے قلعہ جات کے کھنڈرات اور حال ہی میں راجہ کنشک کے زمانے کے سکہ جات کی برآمدگی بُدھ دھرم اور ماضی کے حالات و واقعات کی روداد کی کہانی سنا رہے ہیں۔ اس سرزمین کے جیالے نڈر اور پہاڑی راجاؤں نے محمود غزنوی جیسی شخصیت کے حملے کو ناکام بنایا، اور تسخیر کشمیر کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ مغل افواج کو بھی براستہ پیر گلی ایک عرصہ تک وادیٔ کشمیر میں نہ داخل ہونے دیا۔ یہاں تک کہ جب تک باہمی

غداری نہ ہوئی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی افواج کو بھی براستہ لورن منڈی وادیٔ کشمیر میں داخل نہ ہونے دیا۔

اس خطۂ ارض کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ 1517ء میں فقیر منش، درویش صفت، انسان دوست، وحدانیت کے علمبردار بابا گورونانک دیو جی مہاراج نے اپنے سفر کشمیر کے دوران مہنڈر، چنڈک، بہرام گلہ، لورن میں رواداری، بھائی چارہ کی حسین مہک چاروں طرف بکھیر دی اور اسی سرزمین سے گزر کر بابا غلام شاہ بادشاہؒ نے اعتکاف، تبلیغ، نعرۂ حق وروحانی کرامات کی زندہ و پائندہ چھاپ چھوڑی۔

اس تاریخی شہر میں جو ریاست کی تیسری بڑی میونسپلٹی ہے، مشترکہ تہذیب وثقافت کا خوشگوار امتزاج ہے۔ یہ شہر کشمیر وادی کے مغرب اور جموں شہر کے جنوب مغرب میں ساڑھے تین ہزار فٹ کی بلندی پر پہاڑ کے دامن میں دوندیوں کے درمیان اپنے حسن و جمال کے ساتھ بے شمار تاریخی اُتار چڑھاؤ کی عظیم کہانیاں زبان خاموش سے سنانے کو بے تاب نظر آتا ہے۔ اس کے طویل تر سفر پر قلم اٹھاتے ہوئے مجھے کم مائیگی اور شدتِ جذبات کا احساس بھی ہے۔ اس سرزمین کے بسنے والوں کی وسعتِ قلبی، تاریخی اہمیت وافادیت اور قومی یکجہتی کی حسین وجمیل دلہن جسکی مانگ کا ٹیکہ یہاں کا اتحاد اور سہاگ ان کا اتفاق، نیز اُردو، پہاڑی، گوجری، پنجابی، کشمیری بولیاں اس کے سُر یلے اور میٹھے گیت اور مختلف عقائد وگروہ اس کے خوبصورت، سڈول جسم کے بیش بہا زیورات، جن میں سج دھج کر نئی نویلی دلہن، دیکھنے والوں کے دل موہ لیتی ہے۔

اگر مجھے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا فن ودیعت ہوتا تو شاید اس تاریخی شہر، اس خطۂ ارض کی ہمہ گیر تصویر کشائی کر پاتا۔ اور الفاظ کی اوڑھنی پہنا سکتا۔

کسی کیمیا گر نے کیا خوب کہا ہے کہ ''شمع کی لو کو جمالیا جائے تو سونا بن جائے گی''، لیکن شمع کی لو کو جمانا کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔ اس طرح ''پونچھ تاریخ کے ادبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی آئینے میں'' جیسے مقالہ میں ہمہ پہلو اظہار، تاریخ کی ورق گردانی، سماجی وسیاسی زندگی کے ادوار، ادبی رنگین محفلوں کا تذکرہ، تاریخ ساز شخصیات کے حالات پر سیر حاصل تبصرہ، زمانے کے ہاتھوں چرخ کہن کے انقلابات کی کہانی، ان مٹ مثبت ومنفی اثرات کا اجاگر کرنا اتنا ہی مشکل بلکہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

دامان نگہ تنگ وگُل حسن تُو بسیار

یہ شہر زمانۂ حال سے ماضی کی حشمت، جاہ وجلال کو خاموش زبان سے کہہ رہا ہے اور اپنی مشترک اقدار، فن تعمیر کی عکاسی کرتا ہے۔ موجودہ گیتا بھون، جو کبھی میاں نظام الدین (وزیر اعظم عہد راجہ موتی سنگھ) حویلی نظام الدین کے نام سے موسوم تھا، اپنے اندر کتنے قصے، کہانیاں، عروج وزوال کی عبرت ناک داستان حیات،

جاگیردارانہ استحصال واستبداد کی روداد، شاہی محلات کی ریشہ دوانیوں کا خزینہ چھپائے منتظر ہے....... کہ ہے کوئی جو اس پر تحقیق وتحریر کی نظر ڈالے؟ ساتھ ہی مسجد وزیرنی، مسجد نظام الدین کے گنبد کے مینارے جن پر تانبے کے کلس اپنی محبت اور رواداری کا پیام دے رہے ہیں۔ مینار کے کلس دیکھ کر اجنبی اشخاص نعرۂ توحید اور اذان کی گونج سن کر کیسے حیرت میں گم نہ ہو جائیں۔ کیونکہ مندر مسجد میں ذاتِ لاشریک کو نہ تو محدود کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی حدود کا احاطہ، جو انسانی عقل وآگہی اور خیال وتصور سے بالاتر ہے۔ امروز مسجد وزیرنی جو حویلی نظام الدین کے ملحق جانب شمال گورودوارہ، متصل گیتا بھون، اپنی افادیت اور قوتِ برداشت کی حسین عکاسی ہے۔ موجودہ ملکی سطح پر کوتاہ نظر مخصوص طبقہ کے لئے مقامِ عبرت ہے کہ جہاں محض سیاسی شعبدہ بازی کی خاطر عبادت گاہوں کو ہدف بنایا جاتا ہے وہاں ہمارے ہاں منظر ہی دوسرا ہے۔

مندر مسجد کے جھگڑوں میں بانٹ دیا بھگوان کو

دھرتی بانٹی، امبر بانٹا مت بانٹو انسان کو

وزیردتی کی مسجد، وزیرنی بمقام احاطہ اولڈ اسلامیہ ہائی اسکول پونچھ کا یادگار مسافر خانہ جہاں اس وقت بھائی دھرم دت جی، جنہوں نے نصف صدی تک مُون دھارن کر رکھا وہاں صبح وشام بھجن کی سُریلی آواز سے پیام محبت کی مہک آتی ہے۔ اور وہیں ایشور، اللہ، ست گورو نام کے سنہری حروف داخلی دروازے کے سامنے والی دیوار پر کندہ جاذبِ نظر ہیں۔ وہاں برآمدہ کے تین طاقچوں پر گیتا، قرآن حکیم اور گرنتھ صاحب کے نسخے دعوتِ عمل دے رہے ہیں۔ یہ اس بات کی عکاسی ہے کہ اُن ایام سے آج تک یہاں مذہبی رواداری کی کتنی گہری چھاپ زندہ وپائندہ ہے۔

جہاں دشنامی اکھاڑہ کی جاگیر مشہور راجہ شمس خان کی زندہ جاوید تصویر ہے، وہاں اعلیٰ پیر بادشاہ کی زیارت کو بھی (ملحق موتی محل) جاگیر عطا کی گئی ہے، یہاں پر رواداری، میل ملاپ ایک دوسرے کے مذہبی مقامات اور عقائد کا تقدس، سائیں میراں بخش کا مزار، سائیں الٰہی بخش لورن کا مزار، ڈیرہ بابا صاحب، بوڑھا امرناتھ کی یاترا، عیدملن وہولی اور لوہڑی کے روزمرہ تہوار پونچھ کے عوام کی زندگی کا جزولازم بن چکے ہیں۔

14 اگست 1947ء کو پونچھ 16 ہزار مربع میل پر پھیلی ہوئی ریاست (بعدازاں جاگیر) چار لاکھ سے زائد نفوس کی مسکن، تحصیلات، حویلی، مہنڈر، باغ اور سُدھنتی کے علاوہ علاقہ تھکیالہ پڑاواہ اور جموں میں تحصیل کرلوپ پر مشتمل تھی مگر 1947ء کے پر آشوب حالات کی وجہ سے آج تحصیل حویلی کا نصف۔ سابقہ تحصیل مہنڈر جو موجودہ دور میں تحصیل مہنڈر و تحصیل سرنکوٹ میں تبدیل ہو چکی ہے، کا پانچواں حصہ۔ تحصیلات باغ سُدھنتی مکمل طور

پر، اور علاقہ تھکیالہ پڑاواہ حد متارکہ کی نذر ہو چکا ہے۔ تحصیل کرلوپ تحصیل جموں میں مدغم ہو چکی ہے۔ موجودہ پونچھ جو ہمارے پاس ہے اس کی آبادی تین لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1813ء میں بھمبر کے راجہ سلطان خان اور راجوری کے راجگان عزیز خان اور افسر خان کو گرفتار کر کے مفتوح علاقہ جات پر دیوان دلباغ رائے کو حاکم مقرر کیا۔ سکھ فوج کے سپہ سالار راجا دھیان سنگھ (راجا گلاب سنگھ کے بھائی) نے شمس خان سدھن کو اس کا مشیر مقرر کیا۔ مگر مہاراجہ گلاب سنگھ جو سپہ سالارِ اعظم تھے نے شمس خان کی تقرری کی مخالفت کی۔ شمس خان اپنے وطن مالوف پونچھ چلا آیا۔ گلاب سنگھ کو شبہ ہوا کہ شمس خان باغی ہو گیا ہے لہذا اس نے اودھم سنگھ، میاں لعب سنگھ اور زور آور سنگھ کی سرکردگی میں فوج کو قلعہ سری منگ (تحصیل باغ) پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجا۔ شمس خان نے اپنی صفائی میں خط بھی لکھا لیکن گلاب سنگھ نے پرواہ نہ کی۔ شمسؔ خان تو ہاتھ نہ لگا مگر اس کے دو نامور وفادار ساتھی سبز علی خان اور ملی خان سدھن کو زندہ گرفتار کر کے سرِ عام درختوں کے ساتھ لٹکا کر ان کی کھال اُتروادی اور ان میں بھوسہ بھر کر عام لوگوں کو خوف زدہ کیا۔

شمس خان نے راجہ شہر یار خان، راجہ سرفراز، سدھرون کے ہاں پناہ لے رکھی تھی۔ گلاب سنگھ کی مانگ پر شہریار خان نے میر جعفر یا جے چند کا کردار دکھایا اور شمس خان کو گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا۔ شمس خان اور اس کے بھتیجے راجو لی خان کے سر کاٹ کر اور نیزوں پر چڑھا کر گلاب سنگھ کو پیش کئے گئے، شمس خان کے ظالمانہ قتل کے بعد یہ سارا علاقہ عرصۂ دراز تک سکھوں کی عملداری میں رہا۔ شمس خان کی قبر موضع دیگوار ملدیالاں تحصیل حویلی میں موجود ہے۔

انگریز سیاح G.T Wayin نے اپنے سفرنامہ میں جو لندن میں 1882ء میں شائع ہوا۔ گلاب سنگھ کی سفاکی کا یوں ذکر کیا ہے۔ ''سکھوں کی غاصبانہ بالا دستی کے خلاف پونچھ میں تحریکِ مزاحمت کے دوران 1837ء میں یہاں کے نامور سدھن قبیلہ کو ڈوگرہ بھائیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑا۔ انہوں نے سدھن سرداروں سبز علی خان اور ملی خان کے علاوہ کئی سرکردہ افراد کی زندہ کھالیں کھنچوائیں''۔

ڈوگرہ استبداد و استحصال کی کہانی Tyndol Bisco جو سرینگر میں مشن ہائی اسکول کے کئی برس پرنسپل رہے، اپنی کتاب Sun & Shade in Kashmir میں رقمطراز ہیں کہ ''اگر برطانوی قوم کو اس ظلم کا سامنا کرنا پڑتا جیسا کہ کشمیریوں نے برداشت کیا تو ممکن ہے کہ وہ اپنی مردانگی ہی کھو بیٹھتے''۔

1832ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دھیان سنگھ، جو بڑا ہی زیرک تھا کو راجہ راجگان کا خطاب دے کر پونچھ اور کوٹلی کی جاگیر عطا کی۔ سکھوں نے 1846ء تک کشمیر پر حکومت کی اس کے بعد ڈوگرہ راج کی بنیاد پڑی۔

27 جون 1839ء کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے فوراً بعد راجہ دھیان سنگھ کے وارث راجہ موتی سنگھ نے پونچھ علاقہ پر اپنا تسلط جمالیا اور یہیں سے پونچھ باسیوں، پر عجیب وغریب ٹیکسوں کی بھر مار ہوئی۔ رفتہ رفتہ ان سے تمام انسانی حقوق چھین لئے اور انہیں حیوانوں جیسی زندگی جینے پر مجبور کر دیا گیا۔ Assessment report Tehsil Bagh مرتبہ Residency صفحہ نمبر 110 پر یوں درج ہے ''نذر ٹیکس بطور نذرانہ دسہرہ کے تہوار پر بہ حساب 2 روپے فی صد مالیہ کے ساتھ وصول کیا جاتا۔ دیوالی ٹیکس بہ حساب چار آنے مالیہ کے ساتھ وصول کیا جاتا۔ راجا صاحب کے زیورات کے لئے چار آنے فی کس سالانہ وصول کیا جاتا وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں بیگار اور شکار کے لئے چاہڑ کی رسم پونچھ میں اسی دور کی دین ہے۔ مالیہ فوج کے ذریعے وصول کیا جاتا۔ اگر کوئی فرد غربت کی وجہ سے ٹیکس ادا نہیں کر سکتا تو اسکے سر پر 25 سیر وزنی پتھر رکھ کر کھڑا کیا جاتا اور جب تک اس کا مال و اسباب ضبط نہ کر لیا جاتا وہ اسی حالت میں رہتا یا پھر اس کے رشتہ دار ادائیگی کر کے اسے چھڑا لیتے''۔

1846ء میں چنداں کور کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے سکھوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج کے درمیان ایک معرکے میں میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا اور سکھ سلطنت بکھر کر رہ گئی۔ کشمیر کی جدید تاریخ کا آغاز عموماً رسوائے زمانہ معاہدۂ امرتسر مارچ 16، 1846ء مابین مہاراجہ گلاب سنگھ اور برٹش گورنمنٹ کے نمائندگان Fedrick Curie, H.M Larrence ہوا۔ جس معاہدہ کی شق 3 کے تحت (Sale Deed) بیعنامہ امرتسر مہاراجہ گلاب سنگھ کو 75 لاکھ روپے سکہ نانک شاہی اس شرط پر ادا کرنا طے ہوا کہ بوقت تحریر و تصدیق بیعنامہ پچاس لاکھ اور بقیہ پچیس لاکھ یکم اکتوبر سال 1846ء کو یا اس سے قبل ادا کرنا ہے۔ شہرۂ آفاق کتاب ''راج ترنگنی'' کے حوالے سے کشمیر سے مراد وادئ کشمیر اور ملحقہ کشمیری بولنے والے علاقے ہی ہیں۔ پونچھ، راجوری، کشتواڑ کی الگ الگ ریاستیں مقامی راجگان کے تحت تھیں۔ معاہدۂ امرتسر کے بعد گلاب سنگھ نے اپنے فوجی کمانڈر کے ہمراہ بزورِ شمشیر، کشمیر، پونچھ، گلگت بلتستان، لداخ پر قبضہ کرلیا۔

جب راجہ موتی سنگھ ریاست پونچھ کے سیاہ وسفید کے مالک بنے تو شہر پونچھ آہستہ آہستہ آباد ہونا شروع ہوا۔ موجودہ پرانی پونچھ جو عرفِ عام میں خانقاہ محلہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں اکثر اہل علم حضرات سرینگر شہر کے خواجگان محلہ خانقاہ سے آ کر آباد ہوئے جن میں خواجہ عبداللہ جو مرحوم سپرانٹنڈنٹ کسٹم، خواجہ حبیب جو بستنی بردار، خواجہ عبدالغنی، سب جج، پیر حسام الدین گیلانی، گدی نشین، (خواجہ محمد شفیع اڑی سابقہ وزیرِ تعلیم) کے بزرگان وغیرہ شامل ہیں۔ پرانی پونچھ محلہ خانقاہ کے خواجگان سیاست، ثقافت علم وادب اور سرکاری نوکریوں کے سلسلہ میں حکومتِ وقت پر ہمیشہ چھائے رہے، آج بھی اس خاندان کا ایک فرزند محمد ایوب شبنم صحافت، ادب اور سیاست میں سرگرم

عمل ہے اور خواجہ محمد شفیع ریٹائرڈ پرنسپل ڈگری کالج پونچھ باحیات ہیں۔

اسی شہر پونچھ میں شہرۂ آفاق شاعر چراغ حسن حسرتؔ کے والد فوج کی ملازمت کے سلسلہ میں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ نبی بخش نظامی ایڈیٹر ہفت روزہ ''المجاہد'' صحافت کے علاوہ صفِ اول کے سیاست کاروں میں شامل رہے اور دوسری جنگِ عظیم میں فوجی بھرتی کے آفیسر رہے۔ ضیاء الحسن ضیاء، صادق، ریاض اور حسرتؔ صاحب خود صحافت، ادب اور شاعری میں لوہا منوا چکے ہیں۔ پونچھ کی سرزمین کے درخشندہ ستارے جہاں بھی ہوں اولاً اور آخراً پونچھی ہیں۔

فوارہ باغ کی ناگفتہ بہ حالت بہ زبان خود اور اس کے اردگرد متصل باغات اور ننگالی سے قلعہ پونچھ تک نہر کے کھنڈرات شاہد ہیں کہ یہ چھوٹا کشمیر اپنے اندر کس قدر قدرتی حسن رکھتا تھا۔ مگر 1947ء کی تقسیم اور پھر بعد کے ارباب بست وکشاد کی سرد مہری اور ناعاقبت اندیشی نے اسے تاراج کر ڈالا۔

ڈوگرہ راج میں عوام الناس اور خاص کر اکثریتی طبقہ پر عجیب وغریب ٹیکس عائد کئے جاتے رہے۔ حتیٰ کہ راجا وقت ہی تمام اراضی کا مالک تصور کیا جاتا۔ ایک رسوائے زمانہ ٹیکس گلی کور کے نام سے موسوم تھا۔ جو صرف راہگیر اشخاص سے جبراً وصول کیا جاتا تھا۔ جو جسمانی طور پر لاغر یا عمر رسیدہ ہوں اور بیگار دینے سے قاصر ہوں۔ مسلمانوں کو ترنی ٹیکس فی بھینس ڈیڑھ روپیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ مسلمانوں کی رسم نکاح پر بھی گیارہ آنے ٹیکس عائد کیا گیا تھا۔ ترکھان، لوہار، درزی، حجام، موچی، دھوبی بھی ٹیکس ادا کرتے تھے۔ مسلمان مسجد بنانا چاہتے تو لکڑی خرید کرنی پڑتی جبکہ دوسرے عقائد کے لوگوں کو لکڑی مفت مہیا کی جاتی۔ عوام کو مال درآمد کرنے پر دوہرا ٹیکس ادا کرنا پڑتا۔ اولاً جب بیرون ریاست سے مال آتا تو اس وقت اور پھر جب پونچھ کی حدود کے اندر داخل ہوتا تو اس وقت بھی۔ اس طرح عوام ہمیشہ دو عملی کا شکار رہتے۔

راجہ بلدیو سنگھ 1956 بکرمی میں موتی سنگھ کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھے تو بلدیو متصل ڈی سی آفس پونچھ اپنی رہائش کے لئے تعمیر کروایا لیکن تپ دق کی وجہ سے مارچ 1922ء یعنی بائیس سال کے بعد فوت ہو گئے۔ بدیں خوف 1947ء تک اس محل میں کوئی آباد نہ ہوا کہ اس محل میں تپ دق کے جراثیم زندہ ہیں۔

راجا بلدیو سنگھ کے عہد میں ایک ناخوشگوار واقعہ کو رشید تاثیر نے ''تحریکِ حریتِ کشمیر'' جلد اول میں یوں قلمبند کیا ہے۔ ''اس کے دوران اقتدار میں ڈاکٹر بہاری لعل، چوہدری رام سرن اور دیوان بدری ناتھ جیلر نے ایک منظم سازش کے تحت پونچھ جیل میں قرآن مجید کی بے حرمتی کروائی اور ہندو مسلم فساد بھڑکانے کی کوشش کی۔ مگر عین موقعہ پر انگریز ریذیڈنٹ میکنزی اور راجہ بلدیو سنگھ نے ذاتی تحقیقات کے ذریعے اصل مجرم کا پتہ لگایا اور ان کو

ریاست بدر کیا اور ساتھ ہی باوزن شعر مسلمانوں کے رہنما حبیب جو کو بھی ریاست بدر کیا۔ مسلمانوں کو سخت ناخوشگوار گزرا تو انہوں نے ہجرت کرنا شروع کر دی۔ ریاست میں بغاوت کے آثار پیدا ہو چلے تو راجہ بلدیو سنگھ نے خواجہ حبیب جو کی جلا وطنی کا حکم واپس لے لیا اور مہاجرین کو واپس بلا کر ریاست کو بچا لیا''۔

پونچھ کی تمام اراضیات راجہ کی ملکیت تصور کی جاتی تھیں۔ ریاستی باشندے اپنے بنیادی شہری حقوق سے محروم تھے۔ اپنی شکایت حکام بالا تک پہنچانے کے حق سے بھی محروم تھے، اس دوران تحصیل باغ کے موضع ٹائیں کے سردار بہادر علی خان نے مختلف قبائل کے ایک سو افراد کو ہم خیال بنا کر 1903ء کے حق ملکیت کو چیلنج کر دیا۔ جس کو چیف کورٹ پنجاب نے برقرار رکھا لیکن حق آسامی کو مالک کی طرح رہن اور بیع کا حق دے دیا (ماخوذ ڈاکٹر محمد سرور عباسی) اور پھر 1950ء میں آزادی کے بعد عوامی حکومت نے ایک نوٹیفکیشن کے تحت حقِ آسامیان پونچھ کے حقوق بحال کئے۔

راجہ بلدیو سنگھ کے زمانے میں موجودہ احاطۂ کچہری (جو جل گئی ہے) میں پہلے پرائمری اسکول اور بعد ازاں مڈل اسکول کی کلاسز جاری رہیں۔ لیکن بکری 1959 میں وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول جو آج کل گرلز مڈل اسکول ہے کا سنگِ بنیاد رکھا گیا جس کا کتبہ ابھی تک موجود ہے۔ 1945ء تک اس اسکول نے کئی نامور ادیب، سیاست کار، ایجوکیشنل اسکالر، بیوروکریٹ، وکلاء، اور فنکار پیدا کئے ہیں۔ جیسے گلزاری لعل نندہ، سابق وزیرِ داخلہ وعبوری وزیر اعظم ہند، فرزند ماسٹر بلاکی رام۔ کرشن چندر، مہندر ناتھ، چراغ حسن حسرتؔ، سرفراز حسین تحسین جعفری، فرزند علی یاس، چوہدری دینا ناتھ رفیق، حبیب جو، آئی ایف ایس، اور بعد ازاں پاکستان میں چیف کنزرویٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ پروفیسر ستیہ بھوشن، سابق وائس چانسلر جموں یونیورسٹی، سردار عبدالقیوم خان، سابق صدر پاکستانی مقبوضہ کشمیر، چوہدری دیانند کپور، ٹھاکر پونچھی، سردار تیجا سنگھ، سابق ایڈیشنل چیف سیکریٹری جموں وکشمیر وغیرہ۔

ریاست جموں وکشمیر میں جدید تعلیم کا آغاز مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں ہو چکا تھا۔ اس طرح تعلیم کو عام کرنے کے رجحانات پونچھ میں نمودار ہوئے۔ سردار اکرم خان عباسی (ایس پی) اور پیر حسام الدین گیلانی گدی نشین نے 1911ء میں انجمن اسلامیہ پونچھ کی شاخ قائم کی۔ اس کے تحت اولاً ایک پرائمری اسکول قائم ہوا جو بعد میں ہائی اسکول بن گیا۔ بعد ازاں سردار محمد ایوب خان سب جج فرزند محمد اکبر خان عباسی، خواجہ عبداللہ جو سپرانٹنڈنٹ کسٹمز اینڈ ایکسائز، پیر محمد دین شاہ، فرزند حسام الدین گیلانی، سردار محمد خان عباسی، ملک محمد حیات خان، چیف فارسٹ آفیسر، منشی غلام احمد، ناظر عدالت (چچا مرحوم ایم ایل اے ماسٹر غلام محمد) خواجہ کمال الدین، جلال

الدین، بنجارہ برادران، سید اکبر شاہ کرمانی، سیاست داں خواجہ غلام احمد بٹ، خواجہ غلام احمد تحصیلدار، پسر خواجہ عبد اللہ جو مذکور، شیخ نبی بخش نظامی، سید ضیاء الدین اندرابی، اور شیرِ پونچھ غلام قادر بانڈے وغیرہ شخصیات نے اس اسکول کی فلاح کے لئے بہت زیادہ کاوشوں کا مظاہرہ کیا۔

اسی دور میں پہلی عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا تو پہلی بار ڈوگروں اور گورکھوں کے علاوہ ضلع پونچھ، باغ سُدھنتی کے سدھن، ڈھونڈ اور دیگر قوموں کے مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا جن میں کیپٹن خان محمد خان، خان بہادر کیپٹن عطاء محمد عباسی، لیفٹیننٹ جعفر علی خان، اور برہان علی خان وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ روایت آج بھی زندہ و پائندہ ہے کہ پونچھی حدِ متارکہ کے اس طرف ہوں یا اُس طرف، پونچھی بہادر، ربط وضبط کا پابند سپاہی ہے، وفادار ہے اور دلیر بھی۔ مشرقی سرحد کے سابق Corps کمانڈر مسٹر شرما سُدھنتی کے رفیوجی تھے جو فخر کی بات ہے۔

1918ء میں بلدیو سنگھ کے انتقال کے بعد اس کا نابالغ بیٹا سکھدیو سنگھ گدی نشین ہوا تو سرکاری کام کاج اسسٹنٹ سیکریٹری خان بہادر منشی احمد الدین کی ایماء پر سرانجام دیئے جانے لگے۔ راجہ بلدیو سنگھ نے حکومت کی بھاگ ڈور سنبھالی سہی لیکن وہ قبل ازیں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی سرپرستی قبول کر چکا تھا۔ جس سے ریاست کی اندرونی خودمختاری کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا تھا۔ گو سکھدیو سنگھ کو اس غلطی کا احساس شدید طور پر ہوا مگر بے سُود۔ سکھدیو سنگھ آزاد خیال شخص تھے۔ اس نے ایک مسلمان کی دعوت میں کھانا تناول فرمایا۔ جس کا علم پرتاپ سنگھ کو ہوا تو وہ سیخ پا ہو گیا، اس نے سکھدیو سنگھ کو سرینگر طلب کیا اور انکار کی صورت میں راجہ ہری سنگھ جو اس کی افواج کا کمانڈر تھا کو پونچھ پر فوج کشی کرنے کا حکم دیا۔ سکھدیو سنگھ نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے سردار محمد اکرم خان عباسی کو انگریز ریذیڈنٹ کے پاس سرینگر روانہ کیا جس کی وجہ سے مشکل ٹل گئی۔

راجہ سکھدیو سنگھ کا دورِ حکومت بہت مختصر تھا۔ اس نے موتی محل نہایت، محنت لگن اور منفرد نقشے پر تعمیر کروایا۔ مگر بے وقت موت کی وجہ سے اس لعل بنگلہ کو موت کا بنگلہ یعنی ''موتی محل'' کا نام رکھ دیا۔

راجہ سکھدیو سنگھ کے قلیل دورِ حکومت میں ادبی محفلوں، تھیٹروں کے قیام، پولو کے کھیل جیسی سرگرمیاں بہت عروج پر پہنچ گئی تھیں۔ اسی دور میں سکھدیو تھیٹریکل کلب کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس زمانے کے مشہور میوزک ڈائریکٹر ماسٹر کرامت کی کاوشوں کی وجہ سے منڈی ہال پونچھ میں پُکار، کنگ لیئر اینڈ سفید خون، سکندر اعظم، اکبر اعظم، پرہلاد بھگت، جولیس سیزر، وغیرہ تاریخی ڈرامے اسٹیج کیے گئے جن میں ٹھاکر پونچھی کے والد شری بھیم سین، لعل چند کپور، پشکر ناتھ مصری، چوہدری بھگت رام، (والد محترمہ سشما چوہدری) نثار حسین شاہ، اے ایس پی، چوہدری

کانشی ناتھ ، ماسٹر عبد الاحد، غلام احمد شیخ، سردار مان سنگھ، پچھمن داس اروڑہ، بابو عبد الرمضان میر، دوار کا ناتھ بھلہ، خادم حسین، غلام احمد حلوائی، وغیرہ نے خوب جوہر دکھائے۔اس دور میں ادبی محفلیں منڈی ہال کی زینت بنیں۔اور مقامی شعراء کو سرکاری سرپرستی کا شرف حاصل ہوا۔

مگر راجہ کی علالت نے مہلت نہ بخشی اور راجہ کی بیماری کا فائیدہ اٹھا کر 1925ء میں والی ریاست جموں وکشمیر ہری سنگھ نے ایک شاہی حکم کے ذریعے 1927ء میں ریاست پونچھ کی تاریخی اہمیت کو صرف جاگیر کا درجہ دے کر اپنا تسلط مضبوط کرلیا۔

26اکتوبر 1927ء کو راجا بلد یوسنگھ کی وفات کے بعد اس کا برادرِ اصغر راجہ جگد یوسنگھ پونچھ کا راجہ بنا کیونکہ سکھد یوسنگھ کی کوئی اولاد نہ تھی۔راجہ جگد یوسنگھ نے ہی اپنی بیوہ بھاوج رانہ اٹلیا کے لئے شیش محل کی شاندار عمارت بنوائی مگر رانی آبائی وطن الور چلی گئی۔

راجہ موتی سنگھ کے عہد میں دیوالی ٹیکس چار آنے سالانہ تھا اور دیگر ٹیکسوں کی بھرمار بھی تھی، مگر راجہ جگد یو سنگھ نے غریب عوام پر اندھا دھند ٹیکس لگا دیئے۔ پہلے بھینس پر ٹیکس تھا اب مسلمانوں کی بکریوں پر بھی ٹیکس عائد کر دیا گیا۔جس سے متاثر ہو کر حکومت جموں وکشمیر کے وزیر وزرات سردار بدھ سنگھ نے مہاراجہ جموں وکشمیر سے سخت احتجاج کیا اور استعفیٰ بھی دے دیا۔اس کا صلہ تھا کہ ان کو مہاتما بدھ سنگھ کہا جانے لگا اور وہ پونچھ اور میر پور سے جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر ممبر منتخب ہوئے۔

راجہ جگد یوسنگھ خود شاکھاہاری تھے،اس لئے انہوں نے ہر قمری مہینے کی اول تاریخ،نویں تاریخ، تیرہ اور چوبیس تاریخ کو ذبح کرنے والوں کے خلاف فوجداری کیس رجسٹر کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔

راجہ جگد یوسنگھ کے عہد کی شروعات میں ہی کشمیر سرکار کی گرفت مضبوط ہوتی چلی آرہی تھی۔اور باشندگان پونچھ دوعملی کا شکار تھے۔ کیونکہ پونچھ سرکار اور مہاراجہ ہری سنگھ کی سرکار میں قدیم روایتی خاندانی کشمکش میں کمی آنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔رفتہ رفتہ اعلیٰ عہدوں پر تقرریاں ہونے لگیں تو پونچھ سرکار کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔اب وزیر وزرات اور ایس پی مہاراجہ ہری سنگھ کی منظوری کے تابع تعینات ہوتے تھے۔حاکم اعلیٰ ٹھاکر کپور سنگھ کی جگہ مہتہ دونی چند کو پونچھ میں کشمیر سرکار کی ایما پر تعینات کیا گیا۔ بدیں وجہ راجہ اور پرجا دونوں کے اندر ہی اندر آگ سُلگ رہی تھی۔ کہ پونچھ کا کھویا ہوا وقار کس طرح بحال ہو؟ حد یہ تھی کہ پونچھ کی وراثت میں آئی پونچھی فوج اور اس کے افسران کو دھیرے دھیرے سبکدوش کر دیا گیا اور مہاراجہ کشمیر نے پونچھ کی رسالہ چھاؤنی میں اپنی فوج کا ایک دستہ تعینات کر دیا۔اس دوران مولوی غلام حیدر جنڈالوی کی زیر سرکردگی انجمن آزادئ کشمیر وجود میں

آئی ہفت روزہ اخبار ''صداقت'' کے مدیر منشی گُل احمد خان انجمن کے سیکریٹری بنائے گئے۔ راجہ پونچھ درپردہ اس انجمن کا سرپرست تھا۔ فروری 1940ء میں غلام حسین جنڈالوی کو ایک سال کے لئے جلاوطن کردیا گیا۔ انجمن کے رکن سر ظفر اللہ خان ممبر وائسرائے ہند ایگزیکٹو کونسل کی مدد سے وائسرائے ہند کو ملے اور ریاست کا سابقہ درجہ بحال کرنے کے لئے ایک یادداشت پیش کی گئی۔ جس میں لکھا گیا تھا کہ پونچھ کی عدلیہ کشمیر ہائی کورٹ سے کلیتاً آزاد کر دی جائے۔ انگریز ریذیڈنٹ مقرر کیا جائے۔ پونچھ میں کشمیر سے بھیجے گئے افسران واپس بلا لئے جائیں وغیرہ۔ مگر 1940ء میں راجہ بلدیو سنگھ کی وفات کی وجہ سے یہ تحریک کمزور پڑ گئی۔

راجہ جگت دیو سنگھ کے عہدِ حکومت میں ہی باشندگان جاگیر پونچھ کا میل ملاپ براستہ حاجی پیر اُڑی، سرینگر، راولپنڈی، براستہ کوٹلی میرپور اور جموں سے کافی گہرا ہو چکا تھا۔ اور سماجی، سیاسی، انقلابی رجحانات و اثرات شمالی ہندوستان میں نمودار ہو رہے تھے ان کے اثرات پونچھ پر بھی پڑ رہے تھے، اس دور میں آتش بیان مقرر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے جب عیدگاہ پونچھ میں تقریر کی تو ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے تمباکونوشی کے حقے اور نسوار کی ڈبیاں نالہ بتاڑ میں پھینک دیں اور ایک عرصہ تک کے لئے اس بدعت سے عوام کی جان چھوٹ گئی۔

1911ء میں انجمن اسلامیہ پونچھ کے قیام کے بعد اس پلیٹ فارم سے سیاسی جاگیرتی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ جموں میں ینگ منز ایسوسی ایشن کے قیام نے پونچھ کے نوجوانوں پر بہت زیادہ اثرات مرتب کئے۔ لاہور کی تب و تاب جہاں کی ہمہ پہلو زندگی بامِ عروج پر تھی، کے اثرات نے پونچھ کو متاثر کرنا شروع کردیا تھا۔

باشندگان پونچھ خاص کر اکثریتی طبقہ کشمیر سرکار اور پونچھ سرکار کی دو چکیوں کے پاٹ میں بے پناہ مسائل کا شکار ہو رہے تھے، ہر شعبۂ زندگی امتیاز اور ناانصافی کا شکار تھا، حتیٰ کہ جاگیر پونچھ کے چالیس کلیدی عہدوں پر صرف سات آسامیوں پر مسلمان تعینات تھے۔

جنوری 1929ء میں انڈین نیشنل کانگرس کا راوی کے کنارے لاہور میں تاریخی اجلاس ہوا جس میں پہلی بار نوجوان قائد پنڈت جواہر لعل نہرو نے مکمل سوراج کا نعرہ بلند کیا۔ پونچھ سے بھی ایک والنٹیر مسٹر ترلوک ناتھ بھسین کو اس اجلاس میں بھیجا گیا۔ اس سال پونچھ شہر میں ینگ مینز ایسوسی ایشن عوام کی بے پناہ توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس کے بانیوں میں خواجہ غلام قادر بانڈے جیسے جوشیلے لیڈر شامل تھے۔

1931ء میں جو تحریک حریت کا علم سرینگر اور جموں میں بلند ہوا پونچھ کے جیالوں نے بھی ہراول دستے میں شمولیت کی۔ 13 جولائی 1931ء کو سینٹرل جیل سرینگر کے سامنے جب معصوم کشمیریوں کو شخصی راج کی گولیوں سے چھلنی کردیا گیا۔ 17 افراد نے جام شہادت نوش کیا۔ اسی روز پونچھ کے ایک نوجوان محمد یعقوب ولد غلام محی

الدین سکنہ اڑائی تحصیل حویلی نے بھی سینہ سپر ہو کر ڈوگرہ فوج کی گولیوں کو لبیک کہا۔ مفتی ضیاء الدین پونچھی تحریک حریت کے ہر اول دستہ کے سپہ سالار کی گرفتاری اور جلاوطنی نے نہ صرف سوبۂ کشمیر بلکہ راجوری، میر پور، ریاسی، پونچھ، قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں، انسانوں، سبزہ زاروں، آبشاروں کو بھی غصے کی آگ کی لپیٹ میں لے لیا۔ پونچھ میں غیر انسانی قسم کے سلوک، ٹیکسوں کے خلاف کھلے عام بغاوت ہوگئی۔

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے اپنی سوانح حیات ''آتش چنار'' میں مفتی ضیاء الدین اور غلام قادر بانڈے کی قید و بند کی صعوبتوں کی بات کی ہے۔ 1931ء میں ہی جبکہ سردار فتح محمد خان کریلوی کے والد سردار محمد قیوم خان اور نانا سردار منصور خان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر سب جج سردار محمد ایوب خان (فرزند سردار محمد اکرم خان عباسی) کی عدالت میں پیش کیا گیا تو انہوں نے پہلی ہی پیشی میں ان معزز اشخاص کو ضمانت پر رہا کر دیا۔ علاوہ ازیں فتح محمد کریلوی، پیر حسام الدین گیلانی، خواجہ غلام احمد بٹ پونچھی، سردار غلام حسین خان آف سہڑا مہنڈر، مولوی غلام حیدر جنڈالوی، سید ضیاء الدین اندرابی، غلام رسول میر، سید غنی شاہ اڑائی،۔ سید نذیر حسین ایڈوکیٹ، سید ولایت شاہ بخاری پمروٹ، چوہدری غلام حسین لسانوی، راجہ محمد اکبر خان میر پور، میاں احمد یار وغیرہ نے تحریکِ آزادی کے کارواں میں صفِ اول کے زعماء میں اپنا نام شامل کرایا۔

مسلم کانفرنس کے قیام اور عوامی دباؤ سے مجبور ہو کر مہاراجہ ہری سنگھ نے گلینسی کمیشن کا قیام عمل میں لایا تاکہ عوام الناس کی شکایات کا ازالہ ہو سکے۔ جس میں سرکاری ممبران کے علاوہ غیر سرکاری دو اور غیر مسلم دو ممبران شامل کئے گئے۔ مگر آئینی اصلاحات پر اختلافات کے باعث شکایات کا ازالہ ہو سکے۔ مگر آئینی اصلاحات پر اختلافات کے باعث صدر کمیشن نے از خود ایک اسمبلی کے قیام کی سفارش کی۔ مگر پونچھ کو اس حق سے بھی محروم رکھا گیا تاہم مسلم کانفرنس کے ایک اجلاس میں ریزولیشن پاس کیا گیا کہ جاگیر پونچھ جموں و کشمیر کا جزو لاینفک ہے۔ لہذا اس کو آئینی مراعات سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ حکومت نے اس مطالبہ کی جوازیت کے پیش نظر اسمبلی میں دو نشستیں دے دیں۔

انتخابات ہوئے تو پونچھ جاگیر سے تحصیل حویلی، مہنڈر حلقۂ انتخاب، باغ اور سدھنتی تحصیلات حلقۂ انتخاب سے بالترتیب مسلم کانفرنس کے منڈیٹ پر فتح محمد خان کریلوی اور خان کیپٹن محمد خان 1937-1934ء تین سال کے لئے منتخب ہوئے (بعد ازاں 1937ء کے انتخاب میں بھی یہی حضرات کامیاب ہوئے) گوجر جاٹ کانفرنس کے امیدوار کو فتح محمد خان کریلوی نے شکست دے دی۔ 1947ء میں پھر انتخاب ہوا تو نیشنل کانفرنس کا قیام ہو چکا تھا۔ لیکن نیشنل کانفرنس کے زعماء کی گرفتاریوں کی وجہ سے نیشنل کانفرنس نے پرجا سبھا کے انتخاب کا

بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ اس لئے پونچھ، حویلی اور مہنڈر سے مسلم کانفرنس کے امیدوار سردار یار محمد خان بار ایٹ لاء چنڈک کا مقابلہ گوجر جاٹ کانفرنس کے بزرگ سیاسی لیڈر چوہدری غلام حسین لسانوی سے ہوا، لیکن دونوں سیٹوں پر مسلم کانفرنس کے امیدوار محمد خان اور سردار محمد ابراہیم بار ایٹ لا کامیاب ہوئے۔ جو بعد ازاں حدِ متارکہ کے پار آزاد کشمیر میں صدر رہے۔

1932ء میں مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں پونچھ کے مندوبین حضرات نے شرکت کی، اور بزرگ رہنما خواجہ غلام احمد بٹ کو صدر مسلم کانفرنس پونچھ اور خواجہ غلام قادر بانڈے کو جنرل سیکر یٹری بنایا گیا اور پھر شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ صدر جموں و کشمیر مسلم کانفرنس نے ایک گیارہ رکنی عوامی فلاحی کمیٹی تشکیل دی تو اسمیں بھی پونچھی بزرگ خواجہ غلام احمد بٹ جیسے رہنما کو ممبر رکھا گیا۔

آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس 12 تا 15 مئی 1937ء میں بمقام پونچھ منعقد ہوا جس میں چوہدری غلام عباس، بخشی غلام احمد، راجہ محمد اکبر خان، مولانا محمد سعید مسعودی، اللہ رکھا ساغر، غلام محمد صادق وغیرہ شامل ہوئے جو سنڈیکٹ بنجارا بلڈنگ میں ٹھہرے۔ اور جب جلوس سنڈیکٹ بازار سے بہ طرف عیدگاہ روانہ ہوا تو بلند قامت رومی ٹوپی پہنے، برجیس لگائے، سیاہ داڑھی، پُرکشش شخصیت شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ ہجوم میں جاذبِ نظر تھے۔ پہاڑی لوک گیت کی دھن ''شیخ محمد عبداللہ کمال تیریاں دور بلائیاں'' فضا میں گونج رہی تھی۔ اور میں والدہ کی اُنگلی پکڑے ٹھاٹھیں مارتا ہوا انسانوں کا سمندر دیکھ کر حیران تھا۔

1937ء کے انتخابات کے بعد پونچھ میں بہ یک وقت دو تحریکیں ابھر آئیں۔ جن کے دوران مسلمانوں کے جوش و ولولے کے سامنے حکومت کو سرنگوں ہونا پڑا۔ حکومتِ وقت نے جنگلات کی حدود بندی کے دوران مالکان کے حقوقِ اراضی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ حکومتی زیادتی کے خلاف سید احمد شاہ نے باغ سدنوھتی کی عوام کو چٹان کی طرح کھڑا کر دیا تھا۔ ان کے رفقاء کار میں مولوی غلام حیدر جنڈالوی اور پیر اصغر شاہ بھی تھے۔

ابھی یہ تحریک جاری تھی کہ جون 1937ء میں پونچھ جیل کے مسلمان قیدیوں نے اس بنا پر بھوک ہڑتال کر دی کہ سپرانڈنٹنڈنٹ جیل ڈاکٹر رام سنگھ نے دورانِ معائنہ قرآن مجید کی بے حرمتی کر دی تھی۔ خبر جب جیل سے باہر آئی تو طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ راجہ جگدیو سنگھ نے مسلمانوں کے مطالبات منظور کر لئے لیکن شہر کے غیر مسلموں نے جوابی ہڑتال شروع کر دی۔ لہذا امن عامہ کو بحال کرنے کے لئے بریگیڈیر اسکاٹ کی زیرِ نگرانی شہر میں فوج متعین کر دی گئی۔ چوہدری نیاز احمد چیف جج پونچھ جس کو تحقیقاتی افسر مقرر کیا گیا تھا، نے ڈاکٹر رام سنگھ کو بے گناہ قرار دیا تو راجہ جگدیو سنگھ نے ڈاکٹر رام سنگھ کو اپنا پرسنل فزیشن بنا دیا جس کی وجہ سے عوام از سرِ نو مشتعل ہو گئی تو مظاہروں کا

ایک سلسلہ چل نکلا۔

اسی دوران حکومت نے خواجہ غلام قادر بانڈے جن کی نئی نویلی دلہن کی ڈولی ابھی صبح صبح صحن میں اتری تھی اور خواجہ غلام محمد بٹ کو گرفتار کر کے ریاست بدر کر دیا۔ اسی اثناء میں توہین قرآن مجید کی خبر قرب وجوار کے دیہات میں پھیل گئی۔ سید احمد ایک سو سے زائد افراد کا ایک جلوس لے کر پونچھ شہر کی طرف چل پڑا۔ راولاکوٹ میں لوگوں نے جلوس کا شاندار استقبال کیا۔ کھڑک کے نائب صوبیدار خان محمد خان کی زیر صدارت ہزاروں افراد نے جلسہ میں شرکت کی۔ مولوی احمد سعید جنڈالوی اور سید عتیق اللہ شاہ نے تقاریر کیں اور جلوس پونچھ کی طرف چل پڑا۔ راولاکوٹ کے سردار محمد افضل خان، مولوی عبداللہ کفل گڑھی بھی الگ الگ جلوس لائے۔ پل پر پہنچ کر ہجوم بے قابو ہو گیا، پولیس سے لاٹھیاں، پیٹیاں اور پگڑیاں چھین لیں۔ مولوی غلام حیدر جنڈالوی نے جلوس سمیت اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا تو پولیس عاجز آ گئی اور منت سماجت سے جلوس کو واپس کیا البتہ سید احمد شاہ سمیت تین افراد گرفتار کر لئے گئے۔ شیخ نبی بخش کی قیادت میں ایک بڑا جلوس حکومتِ کشمیر تک شکایت پہنچانے کے لئے چل پڑا۔ ابھی وہ علیا آباد حاجی پیر تک ہی پہنچے تھے کہ ان کی ملاقات شیخ محمد عبداللہ، سردار بدھ سنگھ اور پنڈت پریم ناتھ بزاز سے ہوئی، جن کو کشمیر سرکار نے مصالحت کروانے کے لئے پونچھ روانہ کیا تھا۔ شیخ صاحب کی استدعا پر جلوس واپس پونچھ آ گیا اور کافی تگ ودو کے بعد مصالحت ہو گئی اور تمام قیدی رہا کر دیئے گئے۔ اور ڈاکٹر رام سنگھ کو جموں بھیج دیا گیا۔ غلہ کی برآمدگی پر ٹیکس منسوخ کر دیا گیا، خواجہ غلام احمد بٹ اور خواجہ غلام قادر بانڈے کو واپس بلا لیا گیا جن کا شہر میں والہانہ استقبال تاریخ کا حصہ بن گیا۔

11 جون 1938ء میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلا گیا تو ممبر اسمبلی فتح محمد خان کریلوی اور خان محمد خان اس میں شامل نہ ہوئے۔ بیشتر ممبران مسلم کانفرنس جو باغ اور سدھنوتی سے تعلق رکھتے تھے بھی شامل نہ ہوئے۔ جبکہ خواجہ غلام احمد بٹ اور خواجہ غلام قادر بانڈے نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر بنے۔ بعد ازاں شری روپ لعل وکیل، ڈاکٹر لعل چند کپور اور ستیہ بھوشن (سابق وائس چانسلر) بھی نیشنل کانفرنس تنظیم میں متحرک ہو گئے اور یہ روپ لعل وکیل تھے جن کی تجویز اور باقی ممبران کی تائید سے نیشنل کانفرنس کے جھنڈے میں ہل کے نشان کو چنا گیا حالانکہ مولانا مفتی محمد سعید مسعودی نے چنار کا پتہ چننے پر زبردست زور دیا تھا۔

1939-1946ء تک پونچھ میونسپلٹی میں جداگانہ انتخابات کی بنیاد پر انتخاب ہوئے۔ اور اسی دور میں پونچھ میں پن بجلی سے بجلی کی فراہمی شروع ہوئی اور نہر کی تعمیر بھی ہوئی۔

صحافت کے میدان کے شہسوار دیانند کپور نے پونچھ میں پہلی بار پریس کا اہتمام کیا اور ایک ہفت روزہ

اخبار ''پر بھات'' کا اجراء کیا۔ ضیاء الحسن ضیآء نے اپنے ہفت روزہ اخبار ''صادق'' اور شیخ نبی بخش نظامی جو سیاست کار بھی تھے نے ہفت روزہ اخبار ''المجاہد'' کا اجراء کیا۔ یہ تینوں اخبارات اپنے اپنے فرقہ کی بھر پور نمائندگی کرتے اور ایک دوسرے پر شدید نکتہ چینی بھی مگر ان کے ذاتی مراسم اور سماجی تعلقات اس قدر گہرے تھے کہ ہر شام محلہ ڈونکس دولت خانہ دیانند کپور ادبی محفل میں شریک ہوتے اور رنگین محفل کی نذر بھی ہو جاتے۔

1945ء میں پونچھ کالج کا قیام ہوا۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ پر آزاد فوج کے حوالدار شیخ عبد الرحمن سکنہ گوجرہ تحصیل حویلی کا بعد رہائی اپنے وطن مالوف آنا ہوا۔ معلوم ہوا کہ موصوف نیتا جی سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج کے بینڈ میں حوالدار تھے۔ اور جن گن من ترانے کی موجودہ دُھن انہوں نے ہی ایک پبلک جلسے میں جو فیڈ ریشن نے چوک بازار میں ان کے اعزاز میں منعقد کیا تھا، سنائی اور شہر کے لوگوں نے کلارنٹ پر پہلی بار آزادی سے ایک برس قبل قومی ترانہ کی سریلی دھن نہایت مسرت وانبساط سے سنی۔

1946ء میں ریاست کی سرکردہ جماعت نیشنل کانفرنس نے راجواڑہ شاہی کے خلاف کشمیر چھوڑ دو (Quit Kashmir) بینامہ امرتسر توڑ دو کی تحریک شروع کی۔ یہ ہندوستان کی 1942ء کی Quit India کی انقلابی تحریک کی مماثل تھی۔ وادیٔ کشمیر کے علاوہ پونچھ، میر پور، کوٹلی، مظفر آباد، اور چینی جموں میں بھی اس تحریک کے شرکاء نے اہم رول ادا کیا۔ پونچھ شہر تو جلسے جلوسوں کا مرکز بن گیا۔ پونچھ منڈی میں مولوی عبد الغنی امام وخطیب جامع مسجد نے تحریک کو زندہ رکھا۔ مولانا عبد الرحمن امام وخطیب جامع مسجد بگیالاں، چھاترا پونچھ میں مولانا عبد الحمید، مولوی عبد الکریم، نے پلندری میں تحریک کو فعال بنایا۔

خواجہ غلام قادر بانڈے کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ پروفیسر ستیہ بھوشن (پسر لالہ روپ لعل وکیل) کو ریاست بدر کر دیا گیا۔ راقم، گوردیو سنگھ اور اوتار کرشن کو پرنسپل کالج نے 75 روپے فیس کس کا جرمانہ کیا کیونکہ ہم نے راجندر ناتھ مصری، محمد ایوب، موتی لعل کپور، مدن لال وغیرہ نے ہڑتال کی کال دی اور فوارہ گارڈن میں ایک زبردست جلسہ میں حکومت پر زوردار حملے کئے تھے۔

مہاراجہ ہری سنگھ آزادی سے چند ماہ قبل پونچھ آئے۔ سرکاری سطح پر استقبال ہوا لیکن عوامی سطح پر کچھ بھی نہیں ہوا۔ مہاراجہ سدھوتی پہنچا تو جو لوگ زیادہ تر دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر فوج سے سبکدوش ہو کر واپس آئے تھے وہ قطار میں استقبال کے لئے کھڑے ہوئے۔ پندرہ میل تک دو قطاروں میں فوجی وردی میں ملبوس جوانوں نے راجہ کو متحیر کر دیا۔ راولاکوٹ کے کیپٹن سخی دلیر نے مہاراجہ کو کھلے گراؤنڈ میں عوام سے ملنے کی استدعا کی تو جنرل اسکاٹ نے فوراً راجہ کے کان بھرے اور کہا "This is show

of force,we have to subdue it with iron hands"

جونہی عوام کو ان ریمارکس کی خبر پہنچی، تو چاروں طرف نفرت کی آگ پھیل گئی۔ اور بغاوت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ مہاراجہ کی اس تاریخی غلطی کا عوام الناس آج تک بھگتان کر رہے ہیں۔ لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی۔

مہاراجہ کی واپسی پر ڈوگرہ فوج کے ناعاقبت اندیش بریگیڈیر کرشن سنگھ نے عید الاضحیٰ کے دن بمقام ڈھلی تحصیل باغ میں بلا اشتعال نمازیوں پر گولی چلادی۔ نتیجتاً تمام تحصیل سُدھنتی اور باغ میں ڈوگرہ فوج کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دوران شیخ محمد عبداللہ رہائی پا چکے تھے، جنہوں نے پرتاپ پارک کے تاریخی عظیم الشان اجتماع میں ڈوگرہ ظلم وستم خاص کر نہتے عوام پر جو باغ میں ہوا تھا، کی شدید مذمت کی اور کہا کہ جاگیر پونچھ کے حالات بگاڑنے میں تمام تر ذمہ داری حکومت کی ہے۔

جب تحصیل سُدھنتی اور تحصیل باغ میں کھلم کھلا بغاوت ہوگئی۔ ڈوگرہ فوج کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ غیر مسلم لوگوں نے پونچھ کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ ہندو مسلم فرقوں میں اعتماد کی بحالی کے لئے دونوں فرقوں سے چنیدہ افراد کا ایک نمائندہ وفد بلدیو سنگھ پٹھانیہ، وزیر وزارت پونچھ کے دفتر میں ملاقی ہوا۔ انہوں نے امن وسلامتی کے لئے چند تجاویز پیش کیں نیز ڈوگرہ فوج کی زیادتیوں کی شکایت بھی کی۔ پٹھانیہ یہ سن کر طیش میں آ گیا۔ کیونکہ مسٹر پٹھانیہ کو حالیہ باغ اور سُدھنتی میں اپنی فوجی شکست کا قلق تھا اور اسی لئے اسے یہ برداشت نہیں ہوسکا کہ کوئی بھی لفظ سرکار کی زیادتیوں کا زبان پر لایا جائے۔ اسے طاقت کا گھمنڈ تھا کہ بزورِ شمشیر وہ شاید عوامی غم وغصہ کو دبا سکے اور اکثریتی طبقہ کے خلاف سخت ترین اقدام کر پائے۔ اس کے تیور بدلتے دیکھ کر خواجہ غلام قادر بانڈے، اور ضیاء الدین اندرابی نے پٹھانیہ کے عزائم کو بھانپ لیا۔ تو انہوں نے بازارِ چوک میں جلسہ کیا جہاں پٹھانیہ کے مخفی عزائم کی قلعی کھول دی۔

تقسیم وطن کے انقلاب سے پونچھ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ نقل مکانی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا۔ قافلوں کے قافلے مشرق سے مغرب سے مشرق تحفظ وسلامتی کی تلاش میں مہاجرین بن گئے۔ کچھ حدِ متارکہ کے اس پار اور کچھ اپنے ہی وطن میں بے وطن۔ داستان دردناک اور عبرت آموز بھی ہے۔ اس تار کے ساز چھیڑو تو اشکوں بھری انفرادی واجتماعی زندگی کی کہانیاں اور قصے انسانی ضمیر کو لرزہ براندام کر دیتے ہیں۔

1948ء نومبر، دسمبر کامریڈ کرشن دیو سیٹھی گڈول مشن برائے بحالی امن واعتماد و پروفیسر ستیہ بھوشن (ضلع پونچھ اور راجوری) کے ہمراہ تشریف لائے اور بہترین خلوص وایثار کا مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر لعل چند

کپور، سید جماعت علی شاہ بخاریؒ، اوتار کرشن در، سردار اللہ دتہ خان، چوہدری اکبر دین، سردار غلام حسین منہاس، منشی طالب حسین، خواجہ باقر جو، خواجہ غلام دین میر، ماسٹر غلام احمد، منشی فتح محمد وغیرہ اور بندۂ ناچیز نے سیٹھی صاحب کا استقبال کیا اور تعاون دیا۔ علاوہ ازیں خواجہ غلام رسول آزاد، ڈوڈہ، اور ان کے رفیق کامریڈ دیوراج نے بھی امن و اعتماد بحال کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ اسی دوران فروری 1949ء میں خواجہ غلام قادر بانڈے کو POK سے واپس آنے کے بعد ان کی بہترین کارکردگی کی وجہ سے پونچھ کا چیف ایڈمنسٹریٹو آفیسر مقرر کیا گیا۔ جنہوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں سے اس اجڑے دیار کو پھر سے بسایا اور امن بحال کیا۔

شہر پونچھ جو چودہ ماہ تک گھرا رہا۔ ناکہ بندی، اور گولیوں کا مسکن رہا۔ جو کبھی ریاست، جاگیر اور پھر سمٹ کر قصبہ بن گیا، حدِ متارکہ کی تلوار نے ٹکڑے کر دیا بقول شاعر اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

پونچھ شہر جسے انگریز سیاح نے اسکاٹ لینڈ کی شبیہ کہا ہے کی نسبت اس سرزمین کی آغوش میں پروردہ، اس کے دلکش مناظر، سرسبز و شاداب خطہ کے حسن، یہاں کے جھرنوں، ندی نالوں، آبشاروں سے متاثر قلم کار ادیب، شہرت کی بلندیوں کو پھاند جانے والے افسانہ نگار، بقول علامہ اقبالؒ ''ادیب اپنے دور کا آئینہ ہوتا ہے، معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے جس میں ہر چھوٹے بڑے عکس نظر آتے ہیں''۔ کرشن چندر کو اس خطۂ ارض میں اسکاٹ لینڈ سے زیادہ حسن، منفرد جمالیاتی عکس نظر آیا تو چلا اٹھا کہ اسکاٹ لینڈ آٹھ ٹیلوں پر بسا ہے جبکہ میرا پونچھ تو اپنے جاہ و جلال کی یکتائی میں گیارہ ٹیلوں پر پہاڑ کے دامن میں بسا ہے۔ جس کے پاؤں شب و روز دو صاف و شفاف ندیاں دھوتی نظر آتی ہیں۔ کرشن چندر کے ناول ''مٹی کے صنم'' میں پونچھ کا جاہ و جلال و جمال، جغرافیائی خد و خال، قدرتی مناظر، تہذیب و تمدن کا عکس شفاف نظر آتا ہے اور ہر افسانے میں پونچھ کا پس منظر ہی نہیں پونچھی کردار بھی نظر آتا ہے۔

کرشن چندر کی تحریروں میں پونچھی پہاڑی زبان کے الفاظ اُردو ادب کے حسن میں بے پناہ اضافہ ہیں۔ کرشن چندر کا پہلا افسانہ ''تین بندوقچی'' جس کی نوک پلک چراغ حسن حسرتؔ نے درست کی ہفت روزہ ''پربھات'' میں شائع ہوا اور اس وقت کے اُردو ادب میں خشتِ اول ثابت ہوا۔ کرشن چندر کی زندگی میں ہی ملک اور بیرونِ ملک کرشن چندر پر اتنا لکھا گیا کہ شاید ہی کسی ادیب کو اتنی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی ہو۔ کرشن چندر کی عظمت کا احساس اس واقعہ سے بھی عیاں ہے کہ 1972ء میں جموں نمائش گاہ میں ڈائریکٹر انڈسٹریز غلام رسول رینزو (آئی اے ایس) نے ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا۔ جس میں پروفیسر ظ۔ انصاری، خواجہ احمد عباس، کرشن

چندر، ان کی اہلیہ سلمیٰ صدیقی، جگن ناتھ آزاد، واجدہ تبسم، غلام ربانی تاباں، عصمت چغتائی، جانثار اختر، مجروح سلطانپوری اور دیگر شہرت یافتہ ادیب وشاعر مدعو تھے۔ کرشن چندر کی نظر اچانک اگلی صف میں بیٹھے سامعین میں اپنے استاد دینا ناتھ رفیق پر پڑی۔ پھر کیا تھا، اسٹیج سے نیچے اُترے، رفیق صاحب کے گھٹنوں کو چھوا اور ان کو لے جا کر اپنے ساتھ اسٹیج پر بٹھایا اور تمام لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا ''دوستو! یہ ہیں وہ ہاتھ جنھوں نے کرشن چندر کو سنوارا، نکھارا اور تراشا''۔

مئی 1974ء کی بات ہے کہ کرشن چندر کی زندگی پر ایک ڈاکومنٹری تیار کی جا رہی تھی۔ اس سلسلہ میں کرشن چندر باقی ٹیم کے علاوہ مہندر ناتھ، اپنے چھوٹے بھائی، سلمیٰ صدیقی (اہلیہ) کے ہمراہ پونچھ اور سرنکوٹ تشریف لائے۔ جہاں جناب چوہدری دینا ناتھ رفیق، سردار نرنجن سنگھ (کرشن جی کا ہم جماعت) خواجہ غلام قادر بانڈے، مہندر پیاسا ایڈوکیٹ، خوشدیو مینی، محمد ایوب شبنم، حسام الدین بیتاب، مشتاق احمد شاہ بخاری، پروین مینی اور بندۂ حقیر کے علاوہ ہزاروں لوگوں نے ان کا استقبال کیا۔ ان کے ایک جلسے میں اسٹیج سیکریٹری کے فرائض میرے مقدر کا نصیب بنے۔

بعدازاں کرشن چندر کی وصیت کی تکمیل میں فوارہ گارڈن پونچھ میں چنار کے درخت کے نیچے ان کی استھیاں دفن کی گئیں۔ اس موقعہ پر اس وقت کے ڈپٹی کمشنر پونچھ مسٹر وجاہت حبیب اللہ، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر ظہور الدین، شری رام ناتھ شاستری، بلراج پوری، ایس ایس بلوریا، چوہدری الٰہی بخش، چوہدری دینا ناتھ رفیق بھی شامل ہوئے۔ کرشن چندر کے مجسمہ کی نقاب کشائی بھی کی گئی۔

کرشن چندر کے افسانے فکری وفنی اعتبار سے ان کی منفرد شخصیت وعظمت کے ضامن ہیں۔ انہوں نے زندگی بھر محنت کش عوام کو اپنے افسانے اور ناولوں کا ہیرو بنایا۔ انہوں نے اپنے ایک عزیز ادیب محمد ایوب شبنم مدیر ہفت روزہ ''ستاروں سے آگے'' سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ سرنکوٹ میں ان کی رہائش کا انتظام کریں تو وہ اپنی زندگی کے باقی ایام ضلع پونچھ وراجوری کے ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لئے بسر کریں گے اور ایک پریس کھول کر ان کی تحریروں کو باقی دنیا تک پہنچائیں گے۔ لیکن افسوس ان کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی اور وہ 8 مارچ 1977ء کو بظاہر ہم سے دور چلے گئے۔

پونچھ کی سرزمین کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ یہاں کی آب وگل سے ایک پودا تناور چنار کی خوشگوار چھاؤں بنا۔ میری مراد چراغ حسن حسرت سے ہے جنھوں نے کرشن چندر جیسے عظیم ادیب کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ حسرت کالم نویس، قلمکار، مترجم، صحافی اور شاعر تھے۔ اخبار زمیندار، لاہور۔ امروز، لاہور۔ الہلال کے قلمی معاون، عرب ہوٹل

لاہور کی ادبی محفلوں کا مرکزی کردار۔ چراغ حسن حسرتؔ برٹش فوج میں کرنل کے عہدے پر تعینات 1946ء کے آخری ایام میں جب پونچھ آئے تو کالج میں ڈرامہ کی ابتدا، ارتقاء اور تکنیک پر مدلل اور تاریخی لیکچر دیا جس کی یادیں ابھی تک تازہ ہیں۔ لیکن عین شباب میں جب ادبی دنیا ان سے فیض حاصل کر رہی تھی۔ جون 1955ء میں موت کے بے رحم ہاتھوں نے انہیں وطن سے دور ہم سے چھین لیا۔

تم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے　　　　زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا

حسرتؔ صاحب کی ابتدائی زندگی کشمکش اور تگ و دو کی ایک دردناک کہانی ہے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اسلامیہ ہائی اسکول پونچھ میں مدرس تعینات ہوئے لیکن ایک رئیس حسام الدین گیلانی صاحب سے اختلاف کے باعث استعفیٰ دے کر لاہور چلے گئے۔

چراغ حسن حسرتؔ جسمانی خدو خال سے جس قدر سڈول، صحت مند، بلند قامت، بارعب وجیہہ، اور پُرکشش شخصیت کے حامل تھے اس سے کہیں زیادہ قد آور شخصیت سند باد جہازی کو حاصل ہوئی۔ سند باد جہازی کی تحریر ایک ایسا سمندر ہے جس سے تشنگان علم و ادب مسلسل اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔ اور ان تشنگان علم و ادب کا تعلق کسی ایک خطہ یا ملک تک محدود نہیں۔ کیونکہ غیر منقسم ہندوستان کو حسرتؔ کی جنم بھومی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ادیب یا فنکار کسی ایک سرحد کا اسیر نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک پل ہے جو دونوں ملکوں کو ایک ساتھ جوڑتا ہے۔ نئی دنیا اور رسالہ آفتاب اور دیگر متذکرہ اخبارات و رسائل میں آج بھی ان کی تحریریں اپنی انفرادیت اور جامعیت کی عکاس ہیں۔

روشؔ صدیقی جیسے عالم، اہل زبان کو کون نہیں جانتا، جو دہلی آل انڈیا ریڈیو سے برسوں تک وابستہ رہے۔ اتنے منفرد تھے کہ ان کے قلم اور زبان سے بڑے بڑے ادیب و شاعر گھبرا جاتے تھے۔ لیکن جب ان کا سامنا حسرتؔ جیسی شخصیت سے ہوا تو اعتراف کر لیا کہ حسرتؔ کے علمی پایہ کا دوسرا شخص دہلی میں کیا بلکہ کہیں بھی نہیں۔ سعادت حسن منٹو جیسے عظیم افسانہ نویس وطنز نگار جن کے نشتر سے صحافت کے شہسوار مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، عبد المجید سالکؔ، جوشؔ ملیح آبادی، جیسی قدر آور شخصیات بھی نہیں بچ سکتی تھیں۔ ان کا جب حسرتؔ سے سامنا ہوتا تو کباب ہو جاتے۔ برٹش سرکار کے فوجی اخبار کی ادارت حسرتؔ نے کی تو برما کے محاذ پر دوسری جنگِ عظیم کے دوران BBC کے نمائندہ بھی رہے۔ انہوں نے شہرۂ آفاق کتاب Lawrance of Arabia کا اُردو ترجمہ کر کے ایک بہت بڑا احسان کیا ہے۔

مرحوم لال چند کپور برادر اکبر دیانند کپور حسرتؔ صاحب سے اپنی ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

ایک بار حسرتؔ صاحب ان کے ہاں بیٹھے تھے کہ انہوں نے پوچھا حسرتؔ صاحب ریل میں تھرڈ کلاس میں ہی سفر کیوں کرتے ہیں حالانکہ فوجی مراعات کے مطابق آپ 'اے' کلاس میں بیٹھنے کے حق دار ہیں۔

حسرتؔ صاحب مسکرائے اور فرمایا کہ فرسٹ کلاس میں سفر کروں جہاں گونگے ہوتے ہیں۔ میں ادیب ہوں، طنز نگار ہوں، مجھے اپنے زندہ کردار تھرڈ کلاس میں ہی ملتے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا موتی لعل کپور صاحب نے اپنی کتاب ''روشن چراغ'' میں حسرتؔ صاحب کے چند خطوط چھاپ کر ادب کی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ خطوط سے حسرتؔ صاحب کی طرزِ تحریر، زندگی کے ادوار، اس زمانہ کے حالات و واقعات پر بہت زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ حسرتؔ صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار ان اشعار سے ہوتا ہے۔

اے عشق جنوں پرور اتنا تو کیا ہوتا — جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دعا ہوتا

امید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی — وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا

غیروں سے کہا تم' غیروں سے سنا تم نے — کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا

ٹھاکر پونچھی۔ پونچھ کے مشہور ڈوگرہ خاندان کے چشم و چراغ اور وزیر بھیم سین، اکاؤنٹس آفیسر پونچھ کے فرزند، جو بعد میں ہجرت کر کے برسہا برس تک آل انڈیا ریڈیو دہلی اور آخری ایام میں ریڈیو کشمیر جموں سے وابستہ رہے۔ اُردو ادب کے مشہور و معروف ڈرامہ نویس، ناول نگار، افسانہ نگار، جموں شہر میں ایک جیپ حادثے میں موت کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ ان کی تحریروں میں یہاں کے دیہات کی سوندھی سوندھی خوشبو اور پونچھ کے مناظر اور ماحول کی وہ مہک نہیں ملتی جو کرشن چندر کے افسانوں کی زینت ہے۔

مہندر ناتھ، کرشن چندر کے چھوٹے بھائی، کرشن چندر کی طرح بہت زیادہ شہرت تو نہیں پا سکے لیکن ان کے افسانوں کو پڑھ کر انسان سوچنے لگتا ہے کہ کہیں وہ کرشن چندر سے آگے تو نہیں تھے۔ مہندر ناتھ کی اہلیہ مرحوم لالہ رام لعل مینی کی دختر ہیں۔ کرشن اور مہندر کی بہنیں سرلا دیوی اپنے بھائیوں کی طرح اُردو ادب کی دنیا میں ستارہ بن کر ابھریں اور اپنا لوہا منوالیا۔

1947ء سے قبل اور بعد کی ادبی محفلوں کی زینت، مقبول شعراء، ادیب، قلمکار، سرفراز حسین تحسین جعفری، فرزند علی عباس شاہ یاسؔ، (میرے اُستاد) امام دین، سرون ناتھ آفتابؔ، دینا ناتھ رفیقؔ، محمد سعید بخاری (جنکی شفقت و تربیت نے مجھے بنایا، سنوارہ اورنکھارہ) دوارکا ناتھ حاذقؔ، گردھاری لعل برقؔ، اکالی درشن سنگھ، شیو لعل آزادؔ، رنجیت سنگھ نازؔ، بلدیو راج رہبرؔ، جن کی حسین یادیں پونچھ شہر کی ثقافتی، تمدنی زندگی کا اظہار کرتی

ہیں۔ کیسے کیسے ہیرے تھے جن کو وقت اور تقسیم وطن نے کھالیا

؎ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

جب 1949ء میں مایوسی وقنوطیت کے بادل چھٹ گئے۔ زندگی نئی ڈگر چلنے لگی تو گیتا بھون پونچھ میں سکھدیو تھیٹر کل کلب کے زیر اہتمام ''پکار'' ڈرامہ کھیلا گیا۔ جس کی ڈائریکشن چوہدری کانشی رام پوری نے دی Savior of Poonch بریگیڈیئر پریتم سنگھ اپنے رفقاء کار کے ہمراہ اس ڈرامے کو دیکھ رہے تھے۔ پونچھ والوں کی بہادری سے وہ متاثر تھے ہی لیکن اسٹیج پر پونچھیوں کی فنکارانہ صلاحیتوں کو دیکھ کر وہ محو حیرت رہ گئے۔ بابو عبد الرمضان میر، دشنت پوری، چوہدری چرن داس کپور، میوزک ڈائریکٹر ڈاکٹر ارجن ناتھ مصری، میرا رفیق خاص ہرکشن رینہ، لچھمن داس کپور، مہندر ناتھ نندن، شیو لعل آزاد، مہاراج کشن فوطیدار، راج پال کپور، اور بندۂ ناچیز نے بھی اس ڈرامے میں کام ہی نہیں کیا بلکہ اس کلب کو بھی خوب ترقی دی۔ بعدازاں چوہدری دینا ناتھ رفیق، ماسٹر جیا لال رینہ، ماسٹر ٹھاکر گردھاری لعل، کیول کرشن کپور نے بھی کلب میں اچھا خاصہ نام کمایا۔

پنجابی اور پہاڑی کے شاعر درشن سنگھ اکالی نے غریبی میں شہنشاہی کا لطف اٹھایا۔ کبھی اپنی اَنا کو نہ چھوڑا۔ درشن سنگھ آوارہ کی مشہور پنجابی نظم، شکوہ کے رنگ میں لکھتے رہے۔ ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔

مرحوم دینا ناتھ رفیقؔ کہنہ مشق شاعر واستاد رہے ہیں اور بقول معلم شیرازیؒ شیر صرف بڑے جنگلات کے ہی بادشاہ نہیں ہوتے بلکہ چھوٹے جنگلات میں بھی اکثر پیدا ہوتے ہیں۔ دینا ناتھ رفیق اس کی زندہ ونمائندہ مثال تھے۔ ان کے کلام کو سننے کے لئے ہر کوئی بیتاب رہتا۔ رفیق نے اپنے بہترین کلام کے لئے کلچرل اکادمی جموں وکشمیر سے انعام بھی حاصل کیا۔ صاحبِ موصوف کو زبان پر دسترس، بامحاورہ اُردو کا استعمال اور استعاروں پر کافی گرفت حاصل تھی۔

موتی لعل کپور، فرزند کہنہ مشق صحافی جناب دیانند کپور، محکمۂ اطلاعات جموں وکشمیر سے بحیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے۔ غزل سے زیادہ انہوں نے نظم میں طبع آزمائی کی۔ میرے رفیق، مہرے ہمسفر، شاعر، قلمکار نے سرزمین پونچھ کو الوداع کہہ کر اپنا وہار جموں میں پرانی یادوں کو سینے سے لگائے گمنام زندگی گزار رہے ہیں کیونکہ بینائی نے جواب دے دیا ہے۔

بلدیو راج رہبر ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں جوڈیشل کلرک تھا لیکن شاعری ان کی رگ رگ میں دوڑ رہی تھی۔ رنگِ تغزل سے عیاں ہوتا تھا کہ شاید لکھنو یا دہلی میں جنم لیا ہو۔ رہبرؔ جس محفل یا مشاعرے میں جاتے محفل کو لوٹ لیتے۔ رہبر کی ناکام ازدواجی زندگی نے اتنے نشتر لگائے کہ زخموں کی مرہم شراب میں ڈھونڈنے لگے۔ حالانکہ

رہبر کو اپنی اہلیہ سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ رہبر کو اگر پونچھ کا مجاز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر رہبر نے جو لکھا اسے سنبھال کر نہ رکھا، چلتے پھرتے سگریٹ کی ڈبیوں پر لکھا اور ضائع کر دیا۔ محفل میں آتے ہوئے قدم لڑکھڑا رہے ہوتے۔ ترنم میں جب وہ غزل سناتے تو گمان ہوتا کہ بکّل اُتسا ہی کلام سنا رہے ہیں۔ رہبر کے کلام میں کسک، درد، خلش، اور سماج پر طنز کی گہرائی ہے۔ غزل سب پر جلد ہی حاوی ہو جاتی ہے لیکن غزل پر صرف کچھ شعراء ہی حاوی ہو سکتے ہیں۔ جو غزل چاہتی ہے، کہلوا لیتی ہے مگر بہت کم شعراء کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وہ جو چاہیں غزل سے کہلوا لیں اور رہبر ان ہی عظیم لوگوں میں شامل تھے۔ ایک بار ایک مشاعرے میں جناب رام لعل کپور کی صدارت میں پروفیسر کے این پنڈتا، جو کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے، بے ساختہ کہہ اٹھے کہ یہ کلام نہیں یہ تو الہام ہے۔

قبل اس کے کہ موجودہ نسل کے نوجوان نسل کے ادباء و شعراء اور صحافی حضرات کا تذکرہ کروں۔ تاریخ کے حوالے سے ایک گمنام مگر عظیم شخصیت جس کی جنم بھومی خطہ ارض پونچھ ہے اور جس نے مرحوم سر سید احمد خان بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شانہ بشانہ اور بعد میں تعلیم نسواں کی اہمیت، افادیت اور جامعیت کا احساس کر کے اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اور عبداللہ گرلز کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم کا روشن مینارہ تھے اور اپنی تاریخ آپ تھے۔ میری مراد شیخ عبداللہ ممتاز بہن، سابق پرنسپل گرلز کالج، والد سجاد حیدر، سابق فارن سیکریٹری حکومتِ ہند کے نانا سے ہے۔ شیخ عبداللہ مشرف بہ اسلام ہونے سے قبل ٹھاکر داس ساسن، مہتہ گورکھ سنگھ براہمن موضع بھاتی تحصیل سُدھنتی پونچھ کے فرزند اکبر تھے۔ جس نے مارچ 1995ء میں 95 سال کی عمر میں علی گڑھ میں وفات پائی۔ جس کے تین بھائی بالترتیب ہری سنگھ، تارا سنگھ، لچھمن سنگھ تھے۔ ہری سنگھ کا پوتا سریندر سنگھ تلوار پونچھ میں سیاسی سرگرم رکن ہے اور تارا سنگھ کا نواسہ ایڈوکیٹ موہن سنگھ تھا اور اس کی یہ خوش بختی تھی کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے اس نے اپنے خاندان کی معروف تاریخ ساز شخصیت کے جنازے کو کندھا دیا۔

نند گوپال باوا، ایڈیٹر ہفت روزہ ''عوامی لہر'' جموں نے ابتدائی تعلیم پونچھ میں ہی پائی مگر قسمت آزمائی کے لئے کتنی مشکلات سے منزل بہ منزل گزرنا پڑا یہ بذاتِ خود ایک طویل داستان حیات کی صبر آزما اور حوصلہ مند تاریخ ہے۔ ان کی کہانیوں کے متعلق ادبی رسالہ نوری چھم کے شمارے ملنے کے باعث کچھ لکھنے سے قاصر ہوں۔

پرتپال سنگھ بیتاب (آئی اے ایس) پونچھ کے ایک سپوت ہیں۔ اعلیٰ تعلیم اور نوکری کی وجہ سے جموں گئے تو وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ شاعری کا فن ان کو فطری طور ودیعت ہے۔ اپنی خداداد صلاحیتوں و جبلتوں کے باعث آج اندرون ریاست ہی نہیں بلکہ بیرون ریاست بھی اپنے منفرد اسلوبِ بیان، کلام کی پختگی، گہرائی و گیرائی کے اثر و نفوذ کی وجہ سے بجا گماں ہوتا ہے کہ یہ تارہ کہیں ماہِ کامل نہ بن جائے۔

اگرچہ الفاظ بے جان ہوتے ہیں مگر بیتاؔب کے احساس وتخیل کی حرارت نے ان میں جان اور موزونیت پیدا کر دی ہے۔فن کا مقصد کسی تجربے کو مکمل کرنا نہیں بلکہ اس کے امکانات کو روشن کرنا ہے۔اور بیتاؔب کے کلام کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے حساس ضمیر سے بوندیں علم وعرفان کی چھلنی سے چھن چھن کر صفحۂ شوق پر صورتِ شبنم گرتی ہیں تو ان بوندوں کو آفتاب کی شعاعوں کی تپش بھی تعلیم فنا نہیں دے سکتی۔اور یہ بوندیں جب دریا کی صورت رواں دواں شاعر کے کلام سے عیاں ہوتی ہیں تو تب ان کے اشعار میں اور نکھار آ جاتا ہے۔یہ تخلیقی اعتماد بہت ہی کم شعراء کو نصیب ہوا ہے۔مگر بیتاؔب کو یہ فن خدائے بخشندہ کی دین ہے۔موجودہ دور میں بیتاؔب نے سچی اور کھری شاعری کے خزانے میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

محمود الحسن محمود اور مسعود الحسن مسعود حقیقی برادران نے شاعری کو دودھ کی گھٹی میں پایا ہے۔ چراغ حسن حسرتؔ مرحوم کے بھانجے ہر محفل میں فیضی اور ابوالفضل کی طرح چھا جاتے ہیں۔محمود متانت اور بردباری کے پیکر ہیں اور مسعود ظالم سماج کے ناقد، فطرت میں بغاوت اور لاابالی پن، طنز ومزاح کا شاہ، میر تقی میرؔ کی طرح درد وکرب سے سرشار، دونوں بھائیوں کا تشخص منفرد، ان کی شاعری متحرک فن ہے اور ان کے حساس ضمیر کی آواز اور تخیل کی بلندی وفن دل میں گہرا اثر ونفوذ پیدا کرنے کے معانی کی حسین تصویر ہے۔ان کی شاعری میں ایک فن کار جس کے پیچھے ایک بھرپور اور مکمل انسانی وجود کھڑا ہے ان کی شاعرانہ زندگی کی اک تفسیر بن جاتا ہے۔زبان اور فنی عبور کے ساتھ ساتھ الفاظ کے انتخاب کا ملکہ اور استعاروں کے باسلیقہ استعمال کا ہنر ان کو ودیعت ہوا ہے اور دونوں اپنے ثقافتی ورثے میں اضافہ کرر ہے ہیں۔

شام سندر آنند لہرؔ ہائی کورٹ میں ایک لیڈنگ ایڈوکیٹ ہیں۔ پونچھ میں گریجویشن کرنے کے بعد جموں میں قانون کی ڈگری حاصل کی اور پھر وہیں کے ہو گئے۔شاعری بھی بہت اچھی کر لیتے ہیں لیکن ان کا سارا دھیان افسانہ کی طرف ہے۔ان کے افسانوں میں روزانہ زندگی کے چربے محسوس ہوتے ہیں۔گردونواح کے حالات کی شبیہ ہوتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ آنند لہرؔ کے افسانوں میں ہندوستانی سماج کی دھڑکن صاف محسوس ہوتی ہے جو انسانی کردار کے روشن آئینے ہیں۔نفسیاتی امور پر موصوف کو زبردست عبور حاصل ہے۔

پہلے مایوسؔ اور اب مانوسؔ۔نوجوان نسل کا ابھرتا ہوا شاعر وادیب، اُردو و پہاڑی دونوں زبانوں ں میں خذف ریزے بکھیرتا ہے۔

محمد ایوب شبنمؔ۔ایک ادیب، طنز نگار، افسانہ نویس صحافی اور سیاسی میدان میں جذباتی سرگرم کارکن، منہ پھٹ اور بیباک، کبھی کبھار سیاسی کھلاڑی کو صاف گوئی اور بے باک تنقید کی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔جس کا شبنمؔ

کو تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ شبنم کی گزشتہ تیس برسوں پر پھیلی ہوئی صحرا نوردی اور سیمابی طبیعت نے ان کے ہم سفر رفقاء کار میں ایک حدِ فاصل کھڑی کر دی ہے۔ باوجود مخالفت اور نا مساعد حالات کے ''ستاروں سے آگے'' کی اشاعت ان کے حوصلہ اور صبر آزما زندگی کے حسین پہلو اجاگر کرتی ہے۔ اخبار نویسی اور سرنکوٹ کی سنگلاخ زمین ان کے خونِ جگر کی آمیزش سے زندہ و پائندہ ہے۔

نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اکثر رفیق و رقیب دونوں ان کے طنز کے نشتر کے وار سے اس قدر لہولہان ہوتے ہیں کہ لگتا ہے کہ شبنم ان کے غصے کی آگ میں جھلس کر رہ جائے گا۔ اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیئے جاتے ہیں

ان کا حساس دل و دماغ خواب آور گولیاں لے کر معاشرے سے فرار حاصل نہیں کرتا۔ ان کی انگلیاں معاشرے کی دکھتی رگوں پر ہوتی ہیں۔ جہاں معاشرے کے ساتھ چلنا ہے وہاں معاشرے کو ساتھ لے کر چلنے کی سعی کرتے ہیں۔ شبنم دکھی معاشرے کا بیباک ترجمان ہے۔ اکثر ادباء دورِ حاضر میں چڑھتے سورج کے پجاری اور کسی حد تک غلام بھی ہوتے ہیں۔ لیکن شبنم کی انقلابی طبیعت و اسلوبِ بیان معاشرے کی عکاسی کرتا ہے اور موجودہ سماج میں استحصال، ظلم و تشدد، ناانصافی کے خلاف شبنم کی تحریریں نقاب کشائی کرتی ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک فن سے وفا شعاری کا مطلب انسانی المیوں سے آنکھ بند نہ رکھنا، یہی مقصدِ حیات ہے اور المناک واقعات کو دیکھنا، محسوس کرنا اور پھر ان کا اظہار کرنا شبنم کا فن ہے۔ اور یہی اس کی معاشرتی ذمہ داری بھی ہے اور اسے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ اپنے ذہن پر قدغن لگانا خود معاشرے کے ارتقاء کو روکنے کے مترادف ہے۔

شبنم بطور ادیب، صحافی اور طنز نگار شدت سے اس بات کا قائل ہے کہ جہاں وہ ذہنی آزادی کا نقیب ہے وہیں وہ فکر و عمل کو کسی کا گرویدہ بنا کر رکھنا سچے اور کھرے ادب کی موت سمجھتا ہے۔ ایوب شبنم کے افسانوں کو پڑھتے وقت قاری محسوس کرتا ہے کہ دو آدمی آپس میں محوِ گفتگو ہیں۔ زبان رواں دواں ہے اور سادگی اس کا جوہر۔ ان کے افسانے نہ نوری ہیں نہ ناری۔ وہ آدم خاکی ہے، وجودِ خاک جس میں موجودہ سماج کے اندر جو امتیازات ہیں ان کو آشکار کرتا ہے۔ اس میں طنز بھی، نشتر بھی اور پوسٹ مارٹم بھی اور زخموں کی مرہم کاری بھی ہے۔

مالک رام آنند کی جنم بھومی بھی پونچھ تھی لیکن انقلابِ وقت نے ان کو بھی جموں رہنے پر مجبور کر دیا۔ مہاجر کی زندگی کن کٹھنائیوں سے گزر کر منزل کی طرف گامزن ہوتی ہے یہ ایک طویل اور صبر آزما داستانِ حیات ہے۔ ماحول نیا، لوگ نئے، معاشی تنگدستی اور ان حالات میں ادبی دنیا میں قدم رکھنا پتھر کا جگر چاہیے میر عشق میں آنند نے 1953ء میں شاعری شروع کی۔ وسیع تر مشکلات نے کلام شائع کرنے سے باز رکھا۔ ان کا

کلام ان کی زندگی کا عکاس تھا۔ نظم بھی لکھتے تھے اور غزل بھی۔ جب لکھتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ اُردو ان کی گھریلو زبان ہے۔اُردو ناول و افسانہ نویسی میں انہوں نے ملک بھر میں لوہا منوایا ہے۔دہکتے پھول شبنم آنکھیں 1962ء۔اپنے وطن میں اجنبی 1965ء۔جانے وہ لوگ کیسے تھے 1967ء وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں۔شہر کی خوشبو، تھوہر کے پھول وغیرہ انکے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد قاری برملا کہہ اٹھتا ہے کہ آنند کی عظمت کو سلام۔

بعد ازاں وکالت کے بعد میرا اہم پیشہ وکیل بن گیا لیکن 1965ء کے مخدوش حالات نے اسے بارڈر کراس کر کے میر پور میں رہنے پر مجبور کر دیا۔ طالب علمی کے زمانے سے وہ سیاست میں سرگرم تھا۔مگر اب معلوم ہوا کہ وہ ایک شاعر، ادیب بن گیا ہے اس کی تازہ کتاب .Kashmir in Stragulation نظروں سے گزری، مواد کے لحاظ سے کچھ تاریخی حوالے قابل ذکر ہیں البتہ مصنف کے خیالات سے اختلاف کی بہت گنجائش ہے۔کالابن تحصیل مہنڈر کے اونچے پہاڑوں کے دامن میں جنم لینے والا یہ شخص نہ صرف سیاست بلکہ ادبی ورثہ کو بھی وطن سے دور بے وطنی میں قائم رکھے ہوئے ہے۔

مضمون کی طوالت اجازت نہیں دے رہی کہ موجودہ نسل کے تمام ،مورخ ، صحافی ،طنز نگار ، افسانہ نویس ، ناول نگار ، شعراء وادباء کی تصویر کشی کر سکوں۔ نیز متذکرہ ادباء وشعراء جن کا ذکر ہو چکا ہے ان کے علاوہ درجنوں حضرات ایسے ہیں جن کا نہ تو کلام دستیاب ہے اور نہ ہی ان کی زندگی سے متعلقہ کوائف۔

مورخ خوشدیو مینی جیسا بے مثل ادیب اور شاعر، کہنہ مشق شاعر حسام الدین بیتابؔ ،نوجوان نسل کے نمائندہ اور جدجد لب ولہجے کے شاعر لیاقت جعفری اور شیخ خالد کرارؔ ،خورشید کرمانی ،اور بشیر بٹ اُردو کے اہل زبان شعراء جاوید راہیؔ ، شیخ آزاد احمد آزادؔ، محمد نذیر قریشی ، امتیاز نسیم ہاشمی ، بشارت حسین خان ، بشارت حسین جاذبؔ ، حسن الدین حسنؔ ، عنایت حسین تنویرؔ ، اعظم حسرتؔ ، بشیر الدین نسیم پونچھی ، غلام نبی شہبازؔ ، عبدالرشید فداؔ ، شبیر راتھر ، لیاقت حسین نیرؔ ، عبدالغنی جاگل ، جیسے جیالت انجانے آسمان ادب کے ستارے اپنی طرف راغب کر رہے ہیں کہ ہے کوئی ادب نواز جو ہمیں جان سکے ، پہچان سکے۔

صوفیانہ کلام کی ضیاء پاشیاں کرنے والے حضرات جو ہم سے بچھڑ گئے۔ جناب مولوی حبیب اللہ شاہؒ ، جناب سید حیدر شاہؒ ، جناب سائیں فقر دینؒ ، جناب قاضی حسن الدین ، سید حاکم شاہ قمر ، خدا بخش زارؔ ، شمس الدین مہجورؔ ، قاضی شہاب الدین وغیرہ۔ضرورت ہے کہ ان ہستیوں کے کلام اور زندگی کو تحقیق میں لایا جائے۔

خطۂ پونچھ کی تہذیب وتمدن کی کہانی دجلہ وفرات کے دو دریاؤں کے بیچ کی قدیم تہذیب کے ارتقائی

منازل کی شبیہ ہے۔ جو صدیوں تک مرکزی شاہراہ کی وجہ سے علم و ادب، تمدن وثقافت اور انقلابات زمانہ کی عکاسی کر کے منفرد تشخص کی پہچان رہی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر خاص کر پونچھ کے حالات بہت مخدوش، تلاطم خیز تبدیلیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہر طرف آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ خرمن امن جھلس کر رہ گیا ہے۔ ہر جانب بے گناہوں کے لہو کی لکیر قاتل کی نشاندہی کرتی ہے۔ سماج لہولہان ہے۔

مکیں میرے وطن کے جانے کن حادثوں میں بٹے ہوئے ہیں
کوئی سراپا لہو ہے دیکھو کسی کے بازو کٹے ہوئے ہیں

مگر آج بھی پونچھ کے غیور لوگ اپنے روایتی بھائی چارہ، انسان دوستی، اور قومی یکجہتی کی اقدار کو سینے سے لگائے خون جگر سے اس کی آبیاری کر رہے ہیں۔ موجودہ پیڑھی کے شعراء وادباء، فنکاروں، صحافیوں، جنکی یہ پوتر جنم بھومی ہے۔ کا فرض بن جاتا ہے کہ اس خطۂ منفرد، کو نہ صرف نظر بد سے محفوظ رکھیں بلکہ اپنے خون جگر، اپنی تخلیقات اور اپنے قلم کے شاہ پاروں سے اس کے حسن کو نکھار، جاہ وجلال، چمک کو ضیاء، بخشیں کہ آئندہ مورخ بھی دادِ تحسین دیئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس مٹی میں وہ خوشبو اور شیرینی ہے کہ جو یہاں آیا وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

میری دعا ہے کہ حدِ متارکہ کی یہ خونی لکیر مٹ جائے، برلن کی یہ دیوار گر جائے تا کہ ہم سب پھر ایک ہو جائیں، ہمارا درد ایک ہو جائے ہماری دوا ایک ہو جائے ☆☆☆

پُونچھ

کی تہذیب وثقافت

ڈاکٹر محمد صغیر خان

(پوٹھی بالا) راولاکوٹ (پاکستانی کشمیر)

تہذیب وثقافت

سرزمین پونچھ جہاں جغرافیائی، تاریخی، سیاسی، عسکری، معاشی، ادبی اور دیگر سماجی و معاشرتی حوالوں سے یہ خطہ تہذیبی وثقافتی اعتبار سے بھی دیگر علاقوں سے ممتاز ہے۔ بلند برف پوش پہاڑوں، گنگناتی آبشاروں، بل کھاتی ندیوں، لہلہاتے سبزہ زاروں، خوبصورت وادیوں، ٹھنڈے میٹھے چشمے اور جری جیالوں کا یہ مسکن ریاست جموں وکشمیر کے مغرب میں واقع ایک ایسا علاقہ ہے جہاں کی تاریخ بہت قدیم ومنفرد اور جغرافیہ انتہائی خوبصورت و اہم ہے تو یہاں کی ثقافت وتہذیب بھی اپنی مثال آپ ہے۔ تہذیبی وثقافتی طور پر انتہائی مالا مال اس سرزمین کے تمدن پر بحث سے

کچھ ان کے بارے میں:

ڈاکٹر محمد صغیر خان پوٹھی بالا، راولا کوٹ، پاکستانی کشمیر کے ایک نامور محقق اور ادیب ہیں۔ گزشتہ سالوں میں ان کی ایک نئی کتاب ''پونچھ کی تہذیب وثقافت'' شائع ہوئی۔ زیر نظر مضمون اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔ باوجود کوشش ان کے مکمل کوائف دستیاب نہیں ہو سکے۔ اس لئے ان کے متعلق انہی سطور پر اکتفا کرنا ہوگا

(محمد ایوب شبنمؔ)

پہلے ضروری ہے کہ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ تہذیب وثقافت کے معنی کیا ہیں اور کسی علاقے کی تہذیب وثقافت سے کیا مراد لی جاتی ہے۔

تہذیب وثقافت دو علیحدہ علیحدہ اصطلاحات ہیں۔ ''ثقافت'' کے لغوی معنی داناتا یا عقل مند ہونا، علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنا، کسی چیز کو تیزی سے سمجھ لینا اور اس میں مہارت حاصل کرنا، اور سیدھا کرنا ہیں۔ جبکہ عربی میں ''تہذیب'' کے لغوی معنی کسی درخت کو کاٹنا، تراشنا اور اس کی اصلاح کرنا یا سیدھا کرنا ہیں۔ مجازی معنوں میں یہ لفظ شائستگی، خوش اخلاقی اور اطوار وگفتار وکردار کی شائستگی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اہل تصوف کے نزدیک تہذیب کے معنی پاک کرنا، آلائش دور کرنا اور اخلاقی صفات سے مزین کرنا ہیں۔ ان اصطلاحات کے لغوی معنوں کو سامنے رکھتے ہوئے ممتاز ادیب ونقاد ودانشور جناب جمیل جالبی کہتے ہیں کہ لفظ ''ثقافت'' ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے جن کا تعلق ذہن سے ہے جبکہ تہذیب کا تعلق خارج اور ظاہر ہے۔ وہ تہذیب اور ثقافت کے مفہوم کو یکجا کر کے اسے بہتر انداز میں بیان کرنے کے لئے انگریزی لفظ ''کلچر'' کا استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ ایران میں ان اصطلاحات کے لئے آہنگ کی ترکیب استعمال کی جاتی ہے۔ یوں ہم تمدن، تہذیب، ثقافت، آہنگ اور کلچر کو باہم مترادف اصطلاحات قرار دے سکتے ہیں۔ مختلف مفکرین نے تہذیب وثقافت یا کلچر کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں کہ دنیا ساری کی لغات بھی لفظ کلچر کے واضح اور دوٹوک معنی بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ نہ صرف زندگی کی طرح وسیع ہے بلکہ زندگی کی ساری سرگرمیوں کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ کلچر میں تہذیب وعقائد، علوم واخلاقیات، معاملات اور معاشرت، فنون و ہنر، رسم ورواج اور ایسی ساری چیزیں شامل ہیں جن کا اکتساب معاشرے کے لئے ایک رکن کی حیثیت سے انسان کرتا ہے اور جن پر عمل کرنے اور اپنانے سے معاشرے کے متضاد اور مختلف افراد اور طبقے ایک دوسرے سے قریب آکر وحدت ویکجہتی میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ جس کے ذریعے معاشرے میں اچھے اور برے، خیر وشر، نیکی وبدی کے تصورات اور معیار جنم لیتے ہیں۔ کلچر میں زندگی کے مختلف مشاغل ہنر اور علوم کو اعلیٰ درجے پر پہنچانا۔ بری چیزوں کی اصلاح کرنا، تنگ نظری اور تعصب کو دور کرنا، غیرت وخودداری، ایثار ووفاداری، معاشرت میں حسن ولطافت، اخلاق اور تاریخ کو عزت اور قدر ومنزلت کو نگاہ سے دیکھنا اور ان کو بلندی پر لے جانا شامل ہے۔ معاشرے کے اس مجموعی طور عمل کا نام کلچر ہے۔ کلچر میں انسانی سرگرمیوں کے سارے بنیادی ادارے مثلاً مذہب، سیاست، معیشت، فنون، سائینس، تعلیم اور زبان وغیرہ آجاتے ہیں۔ جن میں طرزِ عمل اور طرزِ احساس دونوں آجاتے

ہیں۔

سید کامل القادری کے خیال میں ''ثقافت کا اصطلاحی مفہوم نہایت وسیع ہے۔اس کی ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ تمام انسانی سرگرمیاں اس کی تابع ہوتی ہیں۔مہد سے لحد تک کے تمام اعمال وافعال میں اس کا اثر ونفوز ناگزیر ہے.... باالفاظِ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت ہے جہاں کہیں اپنے داخلی محسوسات ونفسیاتی کیفیات نیز اپنے عزم واختیار کو ایک منضبط تصور کے تابع ظاہر کیا ہے، وہی اس کی ثقافت ہوئی''۔

فیض احمد فیضؔ اسی حوالے سے کہتے ہیں کہ ''بعض اوقات ہم کلچر سے محض روزمرہ رہن سہن اور طریق زندگی مراد لیتے ہیں۔بعض اوقات عقائد اور دین و مذہب اور بعض اوقات محض فن وادب لیکن یہ بات بہر حال صورت مسلمہ ہے کہ فوری تہذیب کے تعین میں ان اجزاء کا باہمی رشتہ ان کی اہمیت یا غیر اہمیت ان کی تقدیم وتاخیر کچھ بھی قائم کر لیجئے انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔اس مجموعے کے بنیادی اجزاء کیا ہیں؟

اول: وہ سب عقیدے قدریں، افکار، امنگیں یا آدرش جنہیں کوئی انسانی گروہ یا برادری عزیز رکھتی ہے۔

دوم: وہ آداب، عادات ورسوم اور اطوار جو اس گروہ میں رائج اور مقبول ہوتے ہیں۔

سوئم: وہ فن مثلاً ادب، موسیقی، مصوری، عمارت گری اور دستکاری جن میں باطنی تجربے، قدریں، عقائد وافکار ظاہری طور واطوار بہت ہی مرصع اور ترشی ہوئی صورت میں اظہار پاتے ہیں۔مولانا مودودیؒ کے نزدیک تہذیب، پانچ عناصر کا مجموعہ ہے۔

☆ اساسی عقائد وافکار ☆ ترتیب افراد ☆ نظام اجتماعی

ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں کہ ''جب میں کلچر کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو یہ ان محدود معنوں میں نہیں جو چھٹی کے دن میوزیم یا گیلری دیکھنے سے مراد ہو بلکہ اس وسیع معنوں میں ہے جو لوگوں کے ذہن کی نمائندگی کرتا ہو''۔

ڈاکٹر مبارک علی ایک امریکی ماہر بشریات ایڈورڈ ٹی ہال کی تعریف کو ثقافت کی بہت عمدہ تعریف قرار دیتے ہیں۔

ایڈورڈ ہال کے خیال میں ''کلچر'' تبادلۂ خیالات ہے۔یعنی لوگ اپنے کلچر کے ذریعے اپنے خیالات کو ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔ایک اور تعریف کے مطابق ''ثقافت معاشرے کی پیداوار ہے اور مادی اور اخلاقی اقدار کا مجموعہ ہے۔جسے نوعِ انسان نے تاریخ کی وسعتوں میں اپنے معاشرتی عمل کے دوران حاصل

کیا ہے۔جس میں تمام سائنسوں کے حاصلات ہیں اور جس کی تشکیل میں معاشرتی رشتوں کا احساس کارفرما ہوتا ہے''۔

ممتاز ادیب ودانشور آغا بابر کی رائے میں ''ہمارا کلچر کیا ہے، ہمارا کلچر سرسوں کا ساگ اور جوار کی روٹی ہے۔آپ کا چپراسی جب گاؤں جاتا ہے تو اسے واہاں سے کون سی چیز لانے کو آپ کہتے ہیں؟ کیوں کہتے ہیں؟اس لئے کہ ہمارا تہذیبی اشتراک جوش مارتا ہے۔ہم سرسوں کا ساگ اور جو کی روٹی لانے کو کہتے ہیں کہ یہ چیزیں ہمارے درمیان شئے مشترک ہیں۔زندگی کی یہی مشترکہ تہذیبی قدر ہے۔یہی قدر مشترک ہمارا کلچر ہے۔جو تہذیبی لحاظ سے مالک اور نوکر کے درمیان موجود ہے۔جس سے دونوں کو محبت ہے۔جس کے دونوں طلبگار ہیں۔امیر اور غریب جس تہذیب میں پلے بڑھے ہیں۔وہی تہذیب کلچر کہلاتی ہے''۔

کلچر یعنی تہذیب وثقافت کے معنی ومفہوم کو سمجھنے ے لئے جب ہم متذکرہ بالا مختلف طبقہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے مفکرین ودانشوروں کی آراء کا جائزہ لیتے ہیں تو عیاں ہوتا ہے کہ تہذیب وثقافت کسی علاقے میں رہنے والے تمام لوگوں کی زندگی سے متعلق عمومی رویوں، طرزِ عمل اور فکر واحساس کا نام ہے۔دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلچر بحثیت مجموعی معاشرے کی سب سرگرمیوں اور زندگی کی وسعتوں کا اجتماعی اظہار و بیان ہے۔کسی خاص علاقے کی تہذیب وثقافت اس علاقے کے لوگوں کے تمام تر فکری، روحانی، معاشی، سیاسی، علمی و ادبی افکار اور اعمال کا مجموعہ ہے۔یعنی کسی معاشرے میں رہنے والے انسانوں کی روزمرہ کی زندگی، ان کی فکری روش، روحانی احساس اور دوسرے جذبات واحساسات کے باہمی ملاپ سے اس معاشرے کی تہذیب وثقافت جنم لیتی ہے۔ثقافت صدیوں کے تاریخی اور معاشرتی عمل میں رہتے ہوئے لمبے عرصے تک جو سوچتا ہے۔جیسے کرتا ہے۔اور جس طرح کرتا ہے۔یہ سب مل کر اس کی ثقافت کا روپ اختیار کر جاتا ہے۔

پونچھ........چند جغرافیائی حقیقتیں

بلند برف پوش کوہساروں، فراخ و شاداب وادیوں، سرسبز جنگلوں، تنگ گھاٹیوں، لہلہاتے سبزہ زاروں، گنگناتی بل کھاتی ندیوں، اور سنگلاخ چٹانوں کی سرزمین پونچھ ایک طرف میر پور سے راجوری تک اور وہاں سے پیر پنجال تک پھیلی ہوئی ہے تو دوسری طرف اس کی سرحدیں وادیٔ کشمیر کے خوبصورت علاقہ گلمرگ سے ملتی ہیں۔پھر یہ علاقہ اوڑی، کھٹائی، چکار اور گڑی دوپٹہ تک پھیلا ہوا ہے تو اس کی وسعت دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ مظفر آباد تک ایک بڑے علاقے پر محیط ہے۔تقریباً سولہ سو مربع میل کے علاقے پر پھیلی ماضی کی اس ریاست یا جاگیر کے مشرق میں وادیٔ کشمیر ہے تو اس کے شمال مشرق میں مظفر آباد پایا جاتا ہے۔مغرب میں اس کی سرحدیں

پوٹھوار، مری اور ہزارہ کے کچھ علاقوں سے ملتی ہیں تو اسکے جنوب میں جموں ہے۔ 1947ء میں پونچھ کی کل آبادی تقریباً چار لاکھ اکیس ہزار سات سو افراد پر مشتمل تھی جن میں 95 فیصد سے زائد لوگ مسلمان تھے۔

1947ء میں جب ساری ریاست جموں و کشمیر تقسیم کے منحوس عمل کا شکار ہوئی تو اس علاقے کے سینے پر بھی یہ خونی لکیر کھینچ دی گئی۔ اس تقسیم کے دوران پونچھ کا اس وقت کا صدر مقام اور مرکزی شہر جو شہر پونچھ کہلاتا ہے اور نالہ بیتاڑ کے کنارے آباد ہے۔ مقبوضہ کشمیر کی حدود میں رہ گیا اور بہت سارے علاقے جن میں خاص کر تحصیل مہنڈر اور ملحقہ علاقے شامل ہیں۔ بھی پونچھ کا حصہ ہو گئے۔

1947ء میں مجاہدین کشمیر کی جدوجہد کے نتیجے میں آزاد ہونے والا خطہ پونچھ کافی عرصہ تک ایک ضلع کی صورت میں متحد رہا۔ اگرچہ اس دوران بھی پونچھ کا کچھ علاقہ کوٹلی کے ساتھ شامل کر دیا گیا تھا۔ پھر آبادی میں اضافے، انتظامی ضرورتوں اور سیاسی مصلحتوں کے تحت بقیہ پونچھ کو پہلے دو اضلاع پونچھ اور باغ میں تقسیم کر دیا گیا۔ اب کچھ عرصہ پہلے ضلع پونچھ کو ایک بار پھر متذکرہ بالا وجوہات کی بنا پر تقسیم کر دیا گیا ہے اور نیا ضلع سدھنوتی بنا دیا گیا ہے۔ اس وقت پونچھ کی انتظامی تقسیم یوں ہے (۱) ضلع پونچھ (۲) ضلع سدھنوتی (۳) باغ

ضلع پونچھ کا صدر مقام راولاکوٹ ہے۔ جبکہ اس کی تحصیلیں راولاکوٹ ہجیرہ اور عباس پور ہیں۔ ضلع سدھنوتی کا صدر مقام پلندری ہے جبکہ اس کی تحصیلیں پلندری اور...... ہیں۔ ضلع باغ کا صدر مقام باغ ہے۔ جبکہ اس کی تحصیلیں باغ، دھیرکوٹ اور حویلی ہیں جبکہ ماضی میں آزاد ہوئے پونچھ کی انتظامی تقسیم یوں تھی کہ اس کا صدر مقام راولاکوٹ تھا۔ جبکہ تحصیلیں، راولاکوٹ، باغ پلندری اور حویلی تھیں۔

پونچھ...... کیا نام ہے تیرا؟

دریائے جہلم سے لے کر پیر پنجال کے دامن تک پھیلا ہوا یہ خطہ ''پونچھ'' کیونکر کہلاتا ہے اس کے متعلق قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ جس طرح کشمیر میں ابتدائی انسانی آبادکاری اور اس علاقے کے نام کے حوالے سے مختلف روایات مشہور ہیں ایسا ہی پونچھ کے حوالے سے بھی ہے۔

ایسی ایک مشہور روایت کے مطابق وہ جگہ جہاں آج کل پونچھ شہر آباد ہے پہلے وقتوں میں وہاں ایک بڑی بستی ہوتی تھی جس میں گدڑیئے رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ گرمیوں میں اپنے مال مویشی اور بھیڑ بکریاں لے کر وادیٔ کشمیر سے ملحقہ بلند پہاڑی علاقوں کی طرف چلے جایا کرتے تھے۔ اور سردیاں شروع ہوتے ہی واپس نیچے آجایا کرتے تھے۔ (ڈاکٹر صابر آفاقی کے مطابق ریاست جموں و کشمیر میں یہ اعزاز بھی پونچھ کو ہی حاصل تھا کہ یہاں کی اسی فیصد آبادی موسم گرما میں سرسبز و شاداب ڈھوکوں اور ماہیلوں پر چلی جاتی تھی۔ گرمیوں میں بلند

پہاڑیوں پر عارضی طور پر منتقل ہونے کی روایت آج بھی یہاں موجود ہے۔ اور کافی تعداد میں لوگ بلندیوں پر واقع ڈھوکوں اور بہکوں میں اب بھی چلے جاتے ہیں) روایت میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار جب گدڑیوں کا قافلہ اسی سفر میں تھا تو آگے سے راجہ کشمیر کی سواری آ رہی تھی۔ قریب پہنچ کر راجہ کشمیر کی نظر قافلے میں شامل گدڑیوں کی خوبصورت لڑکی پر پڑی تو وہ اس کے لاثانی حسن کے مقابل دل ہار بیٹھا اور سو جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ راجہ نے اس لڑکی سے شادی کی خواہش ظاہر کی لیکن گدڑیے اسکے لئے تیار نہ تھے۔ راجہ کشمیر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کئی دن تک وہاں پڑاؤ ڈالے رہا۔ اور دونوں فریقوں کے درمیان اس معاملہ پر بات چیت جاری رہی۔ آخر گدڑیے اس شرط پر اپنی لڑکی کی شادی راجہ سے کرنے پر تیار ہوئے کہ اس مقام پر اس لڑکی کی یادگار کے طور پر ایک شہر بسایا جائے۔ چنانچہ راجہ کشمیر نے اس لڑکی سے شادی کے لئے بندھی جانے والے شرط کو پورا کرنے کے لئے نالہ بیتاڑ کے کنارے ایک عظیم الشان شہر آباد کیا اور اس کا نام پونچھ ٹھہرا۔

ایک دوسری روایت کے مطابق کہا جاتا ہے کہ اس علاقے کے لوگ موسم گرما میں جب کشمیر کی طرف ڈھوکوں، بہکوں میں جاتے تو گروہ در گروہ کشمیر کی وادی میں داخل ہو کر لوٹ مار کرتے تھے۔ یہ لوگ وحشی اور جنگجو تھے۔ اور ان پر قابو پانا آسان نہ تھا۔ ان کی اس غارت گری سے اہل وادی بہت ہراساں و پریشاں تھے۔ لہذا ان کو قابو میں رکھنے کے لیے راجہ کشمیر نے باتدبیران کی ایک خوبصورت لڑکی سے شادی کر لی۔ راجہ کشمیر نے ان لوگوں کو ممنون کرنے کے لئے دریا کے کنارے ایک بڑا شہر آباد کیا اور ان کے حوالے کیا۔ کہ یہ لوگ خوش رہیں، یوں یہ شہر پونچھ کہلایا۔ پھر اسی مناسبت سے سارا علاقہ ''پونچھ'' کے نام سے معنون ہوا۔

تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہیکہ پونچھ ریاست کا قدیم ترین شہر ہے۔ اگرچہ کچھ تاریخوں میں آیا ہے کہ اسے گونند خاندان کے راجہ بک (۶۳۷-۵۷۴ ق-م) نے تعمیر کروایا تھا۔ جبکہ زیادہ مورخین کی تحقیق کے مطابق یہ شہر کارکوٹ خاندان کے راجہ للتادتیہ (مکھتا پیڈ) نے ۶۹۵ء میں تعمیر کروایا تھا۔ کشمیر کی قدیم ترین تاریخ ''راج ترنگنی'' میں پنڈت کلہن نے لکھا ہے کہ راجہ نے پھل وصول کرنے کے لئے شہر پھل پور آباد کروایا۔ اور پتہ وصول کرنے کے لئے ''پرنوتسہ'' تعمیر کروایا۔

کشمیر کی قدیم تاریخ راج ترنگی میں پونچھ کے لئے ''پرنوتسہ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تو کشمیر کے فارسی مورخین نے اس کا تلفظ 'پونچ' اور ''پرنوتسہ'' لکھا ہے۔

کشمیری زبان میں پونچھ کو 'پرونٹھس'' کہا جاتا ہے۔ چین کے تانگ خاندان کی تاریخ جو بادشاہ شوئی چنگ کے شو کے عہد (۸۸۰-۹۴۶) میں لکھی گئی میں کشمیر کی پانچ ریاستوں کے تذکرے میں پونچھ کا نام ''پن نوتشہ

پنوچ، ہروخ اور پنوچہ'' لکھا گیا ہے۔

مشہور چینی سیاح ہیون سانگ جو ۶۳۳ء میں یہاں آیا نے اپنے سفر نامے میں اس علاقے کا ذکر خاصی تفصیل سے کیا ہے اس نے اس علاقے کا نام'' پن نوٹو'' لکھا ہے۔ پہلے زمانے میں اس علاقے کے لئے'' پنس'' اور'' پرنوس'' کے نام بھی استعمال ہوتے رہے۔ اور پھر اسے پونچھ پکارا جانے لگا۔'' پنس'، پرنوس اور پونچھ تینوں ہی ہم معنی نام ہیں'' پونچھ'' سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی کسی سلطنت کے اضافی یا خارجہ حصے کے ہوتے ہیں۔

پونچھ کی معنوی حیثیت کو دیکھتے ہوئے جب تاریخ کے ورق الٹے جاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کا پہلے مرکز لوہر کوٹ تھا جیسے البیرونی نے اپنی کتاب میں لوہارا لکھا ہے کچھ لوگ اسے لوہرا بھی کہتے رہے ہیں۔ یہ شہر موجودہ پونچھ شہر سے تقریباً 45 میل دور شمال مشرق میں لورن کے مقام پر آباد تھا۔ شواہد بتاتے ہیں کہ یہ ایک عظیم الشان سلطنت کا دار الحکومت یا صدر مقام تھا۔ میلوں پھیلا یہ شہر ایک عظیم تہذیب کا گہوارہ تھا۔ اس کے حوالے سے سید محمود آزاد تاریخ پونچھ میں لکھتے ہیں کہ جب دریا کے ءکنارے موجودہ پونچھ شہر آباد ہوا تو یہ لوہارا لوہر کوٹ کا اضافی اور خارجی حصہ قرار پایا۔ اور اسے یہ نام اہل کشمیر کی طرف سے نہیں بلکہ اہل لوہارا یا لوہر کوٹ کی طرف سے ملا۔ اور پونچھ کا الحاق سلطنتِ لوہر کوٹ کے ساتھ تھا۔ جس کا ذکر کشمیر کی تاریخ کے قدیم ماخذوں میں ہے۔ راج ترنگنی کے مطابق بھی لوہر کوٹ کا شہر موجودہ پونچھ شہر سے سینکڑوں سال پرانا تھا اور اس تمام پہاڑی علاقہ پر جو راجے اقتدار رکھتے تھے ان کا صدر مقام لوہارا یا لوہر کوٹ ہی تھا۔ جنہوں نے کشمیر پر بھی کافی عرصہ حکومت کی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ پونچھ سلطنت لوہارا یا لوہر کوٹ کا اضافی حصہ تھا۔ اور ممکن ہے کہ سردیوں کے دار الحکومت کے طور پر تعمیر ہوا ہو۔ (کشمیر میں وادی اور جموں کی گرمائی و سرمائی صدر مقام ممکن ہے اسی قدیم روایت کی ایک کڑی ہوں) اور اسی لحاظ سے پونچھ کہلایا۔

مشہور ادیب کرشن چندر پونچھ شہر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ خوبصورت روم سات ٹیلوں پر آباد ہے۔ جبکہ پونچھ شہر بارہ ٹیلوں پر آباد ہے۔ اسی لئے وہ مجھے روم سے بھی زیادہ خوبصورت لگتا ہے۔ اس کے ایک ٹیلے پر پونچھ کا پرانا قلعہ آباد ہے۔ دوسرے ٹیلے پر پونچھ کے شاہی محلات ہیں.... تیسرے ٹیلے پر وزیر وزارت کی کوٹھی ہے۔ چوتھے ٹیلے پر فوج کا پریڈ گراؤنڈ ہے۔ پانچویں ٹیلے پر سرکاری ہسپتال کی عمارتیں اور باغات ہیں۔ چھٹے ٹیلے پر کھوڑی ناڑ کے مضافات ہیں۔ یہاں پر ہی پہاڑی کی کھائی میں مخروطی شکل کا ایک ٹیلا ہے جسے لاکھارانی کا ٹیلہ کہتے ہیں۔ نویں ٹیلے پر شہر کا مرکزی حصہ ہے۔ جہاں تین اطراف میں ڈھلوان پر بازار بنا ہوا

ہے۔دسویں ٹیلے پر اعلیٰ حکام کی قیام گاہیں ہیں۔گیارہویں ٹیلے پر پانی کا بہت بڑا تالاب ہے جس سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔بارہویں ٹیلے پر فوارہ باغ ہے۔

بہرحال یہ بات تاریخی طور پر ہے کہ علاقہ قدیم زمانے سے ''پونچھ'' کے نام سے موسوم ہے۔

پونچھ...... تاریخ کے تناظر میں

خطۂ پونچھ میں پائے جانے والے تہذیبی آثار اگرچہ اس بات کے غماز ہیں کہ یہاں انسانی زندگی بہت پہلے سے وجود پذیر رہی ہے اور یہ کہ اس علاقے میں ابتدائی انسانی آبادکاری اور معاشرے کی تشکیل کے ڈانڈے برصغیر کے اس حصے جسے اب پاکستان کہا جاتا ہے۔کے ساتھ ملتے ہیں۔اور انہی شواہد کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ پونچھ ماضیٔ بعید میں نہ صرف دراڑوں، گونڈوں، بھیلوں، ستھیوں، باختریوں اور ہنوں کے قدموں کی چاپ سن چکا ہے بلکہ یہ سرزمین ان قدیم قبائل کی تہذیب کے ذائقے سے بھی آشنا رہ چکی ہے۔لیکن دشوار گزار، دور افتادہ پہاڑی علاقہ ہونے کے باعث یہاں کا قدیم تاریخی وتہذیبی سرمایہ اس انداز میں محفوظ نہیں رہ سکا۔کہ اس کی بنیاد پر اس کی قدیم تاریخ وتہذیب پر کما حقہٗ روشنی ڈالی جاسکے۔یہی وجہ ہے کہ دورِ قدیم سے لے کر دسویں صدی عیسوی تک کے پونچھ کے حالات پر روشنی ڈالنا آسان نہیں۔

کشمیر کی معلوم تاریخ میں سب سے پہلے جموں خاندان کا ذکر ملتا ہے۔جس کا زمانہ ۱۳۲۱ق م بتایا جاتا ہے ان کے بعد اوکند خاندان کا عہد آتا ہے۔اب پانڈو خاندان کے ۲۲ راجاؤں کا زمانہ آتا ہے پھر مالوہ خاندان یہاں کا حکمران ہوا۔اب باری گودھر خاندان کی آتی ہے۔اب ایک بار پھر جموں خاندان کے اقتدار کا زمانہ بتایا جاتا ہے۔پھر تاج گودھر خاندان کے حکمرانوں کے سر سجتا ہے۔اور ساتھ رشک اور کشک کے نام سامنے آتے ہیں۔متذکرہ بالا تمام ادوار میں تاریخ پونچھ کے ذکر سے خالی بھی ہے اور قاصر بھی۔اس کے بعد ایک بار پھر مالوہ خاندان کے ۲۱ راجاؤں کا طویل عہد شروع ہوتا ہے۔اس عہد کا پہلا حکمران گونند تھا۔ان میں سے بارہویں حکمران راجہ بک جو راجہ مہرہ کل کا بیٹا تھا کے عہد کے تذکرے کے دوران پونچھ پہلی بار تاریخ کے اوراق میں جگہ پاتا ہے۔اس حوالے سے تاریخ پونچھ کے مصنف سید محمود آزاد لکھتے ہیں کہ راجہ بک نے کشمیر کے جنوبی درہ میں پونچھ نام کا شہر آباد کیا تھا۔اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اس پہاڑی حصے کا پرانا دارالحکومت لوہارا یا لوہرن تھا۔اور موجودہ شہر پونچھ کا سنگِ بنیاد راجہ بک نے رکھا۔کشمیر کی تاریخ میں راجہ بک کا عہد ۶۳۷۔۵۷۴ ق م بیان کیا جاتا ہے۔مالوہ خاندان کے بعد اجین خاندان کشمیر کا حکمران ہوا۔اس کے بعد خاندان بجے کی باری آئی۔ازاں بعد تیسری بار مالوہ خاندان کشمیر کے تخت پر بیٹھا۔ان ادوار کی تاریخ بھی پونچھ کے تذکرے سے

خالی ہے۔

جدید تحقیق کے مطابق کشمیر کی مربوط سلسلہ وار تاریخ کا آغاز راجہ دولب وردن کے عہد سے ہوتا ہے۔ جو کارکوٹ بنسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ کارکوٹ خاندان ۶۱۷ء سے لے کر ۷۷۶ء تک کشمیر کا حکمران رہا۔ اس خاندان کے پانچویں حکمران راجہ للتادتیہ جو مکیتا پیڈ کے لقب سے مشہور تھا کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ نالہ بیتاڑ کے کنارے پونچھ شہر اسی کے عہد حکومت میں آباد ہوا۔ للتادتیہ کا عہد ۷۱۵ء سے ۷۵۶ء تک کے دورانیے پر محیط ہے۔ پنڈت کلہن نے اپنی تصنیف راج ترنگنی میں بھی یہی مذکور کیا ہے۔ (ترنگ چہارم اشلوک ۱۸۴) ممتاز محقق ڈاکٹر صابر آفاقی کی رائے بھی یہی ہے۔ کارکوٹ بنسی خاندان کے بعد خمار خاندان کشمیر پر حکمران ہوا۔ اس کے بعد مختلف حکمران جن میں راجہ پردہ گپت، راجہ کھمپہ گپت، راجہ ابھی مینو اور دیدارانی وغیرہ شامل ہیں۔ کشمیر کے حکمران رہے ان ادوار کی تاریخ میں پونچھ موجود و محفوظ ہے۔ غزنوی عہد میں پونچھ کے حکمران آگرہ راج تھے۔ ۱۰۰۵ء میں جب سلطان محمود غزنوی پونچھ یعنی لوہارا پر حملہ آور ہوا اور جو واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ ان کا مفصل تذکرہ تاریخ کے اوراق میں موجود ہے۔ ۱۰۱۳ء میں سلطان محمود غزنوی ایک بار پھر لوہارا (پونچھ) کی فتح کے ارادے سے اس کی سرحدوں تک آن پہنچا۔ لیکن شدید موسمی حالات اور بعض دوسرے عوامل کے باعث اسے ناکام لوٹنا پڑا۔ یوں محمود غزنوی باوجود شدید خواہش اور کوشش کے کشمیر کو فتح نہ کر سکا اور اس کے دونوں حملے ناکام ہوئے۔

دیدارانی کے بعد اننت دیو نے ۱۰۴۱ء میں حکومت سنبھالی، پھر راجہ کلش، راجہ ہرش، راجہ اوچل، ۵ راجہ سوسل، راجہ جے سنگھ، راجہ پرانو وغیرہ نے حکومت کی۔ مشہور کشمیری مورخ، پنڈت کلہن راجہ جے سنگھ (۱۱۳۵ تا ۱۱۶۵ء) کا ہمعصر تھا۔ اس نے راجہ جے سنگھ کے عہد کے متعلق خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس میں پونچھ کا تذکرہ بھی ہوا ہے۔ اس کے بعد اوپیا دیو خاندان کشمیر میں حکمران بنا۔ اس کا عہد ۱۱۷۷ء سے شروع ہوتا ہے اور کشمیر میں اسلامی عہد کے آغاز تک برقرار رہا۔ اس عہد کی تاریخ میں پونچھ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی خاندان کے آخری حکمران راجہ سہدیو کے زمانے میں کشمیر پر ذوالقدر خان تاتاری نے حملہ کیا۔ اور قتل و غارت گری کی انتہا کر دی۔ اس زمانے میں بے شمار لوگ قتل ہوئے اور ہزاروں نے بھاگ کر پونچھ کے پہاڑی علاقوں میں پناہ لی۔ کشمیر کی وادی میں یہ روایت عام ہے کہ گرمیوں کے موسم میں تاتاری کشمیر میں داخل ہوئے اور قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے بعد سردیوں میں واپسی کی راہ لی تو درہ بانہال سے گزر کر ان کا لشکر جو پچاس ہزار افراد پر مشتمل تھا جب علی آباد (پونچھ) کے قریب پہنچا تو وہ شدید برف باری کی نذر ہو گیا۔ اور محض چند سو افراد زندہ بچ

سکے۔ جو اس پہاڑی علاقے پونچھ میں ہی پناہ کے طالب ہوئے اور پھر رچ بس گئے۔ گویا پونچھ کی سرزمین ایک بار پھر اہل جبر کے لئے موت کی وادی بن گئی۔ جسے تاراج کرنا ان کے بس میں نہ ہوا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ پونچھ اور اہل پونچھ کا باغی موسم و مزاج صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اور آج بھی اپنی تاریخ گاہے گاہے دہرا دیتا ہے۔

جب ۱۳۲۵ء میں کشمیر میں اسلامی عہدِ حکومت کا آغاز ہوا اور تبتی شہزادہ رنچن شاہ سید عبد الرحمن بلبل شاہ کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہو کر صدر الدین کے نام سے پہلا مسلمان حکمران بنا تو کشمیر میں اسلام کی تبلیغ کا با قاعدہ آغاز ہوا۔ اس زمانے میں مبلغین اسلام کی بڑی تعداد کشمیر پہنچی۔ بعد میں ان کا دائرہ تبلیغ پونچھ تک وسیع ہوا۔ اور یوں پونچھ کی دھرتی اسلام کی ضیاء پاش کرنوں سے منور ہونا شروع ہوئی۔ ازاں بعد شاہ میری خاندان کے عہدِ حکومت کے ابتدائی دنوں میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پونچھ (لوہارا) کے حکمرانوں کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ اور یہاں کا ہر طاقت ور شخص اپنے علاقے کا حکمران بن بیٹھا۔ لیکن پھر سلطان علاوالدین اور بالخصوص سلطان شہاب الدین کے عہدِ حکومت میں کشمیر میں ایک مستحکم حکومت قائم ہوئی۔ اور پونچھ سمیت سارے نواحی علاقوں میں قانون کی عملداری شروع ہوئی۔ اسی زمانے میں امیر کبیر سید علی ہمدانی، کشمیر میں وارد ہوئے اور اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ ان کاوشوں سے پونچھ میں بھی سینکڑوں لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ سید علی ہمدانی کے ساتھ آنے والے مبلغین میں سے کچھ حضرات نے پونچھ کو ہی اپنا مرکز بنایا اور یہاں پر ہی تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ سلطان سکندر کے عہد میں پونچھ میں اسلام بہت تیزی سے پھیلا۔ اب سلطان زین العابدین بڈشاہ کا عہد آتا ہے۔ یہ کشمیر کا زریں دور تصور کیا جاتا ہے۔ بڈھ شاہ کے عہدِ حکومت میں پونچھ اگر چہ کشمیر کا حصہ رہا، لیکن یہاں کے گکھڑ راجاؤں نے اس زمانے میں خوب طاقت حاصل کر لی تھی۔ بعد ازاں سلطان حسن شاہ کے دور میں کشمیر افراتفری و بے چینی کا شکار رہا۔ اور یہاں خانہ جنگی کے دور کی سی کیفیت رہی۔ خانہ جنگی کے دوران فریقین کی فوج کا بڑا حصہ اہل پونچھ پر ہی مشتمل ہوتا تھا۔ سلطان حسن شاہ کے بعد سلطان فتح شاہ کشمیر کا حکمران ہوا۔ اس کے دور میں کشمیر کا تھوڑا سا علاقہ شاہ کے زیر نگیں رہا۔ بقیہ علاقہ کے خود سر قبائل اپنے علاقوں میں خود مختار ہو چلے تھے۔ اب سلطان محمد شاہ کا زمانہ آتا ہے، پھر سلطان فتح کا دور، ان ادوار میں پونچھ کا خصوصی تذکرہ تاریخ کا حصہ ہے۔

ازاں بعد جب مرزا حیدر دوغلات نے کشمیر پر حملہ کیا اور توشہ میدان سے گزر کر کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ تو پونچھ کے پہاڑی علاقوں کے خود مختار سرداروں نے مرزا حیدر دوغلات کے ساتھ الحاق کر لیا۔ مرزا حیدر دوغلات نے اپنی کتاب ''تاریخ رشدی'' میں پونچھ کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

اب کشمیر میں چک عہدِ حکومت کا آغاز ہوا۔ ان حکمرانوں کے دور میں شیعہ سنی فسادات کے بعد جب ملک میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا تو پونچھ ایک بار پھر خود مختار ہو چلا اور پونچھ کے مختلف قبائل نے اپنے اپنے علاقوں میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کر ڈالیں۔ یہ عہد پونچھ کی تاریخ ایک لحاظ سے تاریک عہد کہا جا سکتا ہے۔ اسی زمانے میں اہل پونچھ باہمی جنگ وجدل کا شکار رہے۔ اور کشت وخون جاری رہا۔

چکوں کے بعد مغل شہنشاہ اکبر نے کشمیر کو فتح کیا تو پونچھ بھی اسی کی عملداری میں چلا گیا۔ اس عہد کی تاریخ میں پونچھ کا تذکرہ تفصیل سے موجود ہے۔ اکبر کے بعد جہانگیر حکمران بنا۔ جہانگیر سے پونچھ کو خاص تعلق رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا تزکِ جہانگیری میں پونچھ کا ذکر خوبصورت پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ جہانگیر اکثر بہرام گلہ اور علی آباد کے راستے کشمیر جایا کرتا تھا۔ اس نے نوری چھم کے مقام پر ایک خوبصورت سرائے یا بیٹھک تعمیر کروائی تھی جس کے نشانات ابھی تک موجود ہیں۔ یاد رہے کہ کشمیر کے سفر سے واپسی پر جہانگیر کی موت بھی پونچھ کی سرحد پر واقع ہوئی تھی۔

ازاں بعد ہاشم خان ۱۹۰۹ء میں کشمیر کا گورنر بنا پھر صفدر خان، احمد بیگ، دلاور خان اور اعتقاد خان وغیرہ یہاں کے حکمران ہوئے۔ یہ عہد ۱۶۲۴ء تک کا ہے، اس دوران پونچھ پر راٹھور خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ اور کشمیر کے ساتھ اس کی علاقائی وسیاسی حد بندی کی گئی۔ یہ حد بندی آج بھی موجود ہے۔ راٹھور خاندان کے حکمرانوں میں سراج دین، راجہ عبدالرزاق، راجہ فتح محمد، راجہ رستم، راجہ شیر باز اور راجگان سدھرون وغیرہ اہم رہے ہیں۔

سکھوں کا عہدِ حکومت (۱۸۳۹ء تا ۱۸۳۹) کشمیر کی تاریخ میں اپنی افراتفری، ظلم وجبر اور آپ راجی کے حوالے سے اہم ہے۔ یہ ہماری ملکی تاریخ کا ایک افسوس ناک باب ہے جس کے اثرات اب تک موجود ہیں۔ اس دور میں راٹھور خاندان پونچھ میں اپنی طاقت کھو چکا تھا اور اس کی حکومت سدھرون تک محدود ہو گئی تھی جب کہ پونچھ کے باقی علاقے پر یہاں کے مختلف طاقتور قبائل نے اپنی حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ اسی وجہ سے اس دور کو آپ راجی کا دور کہا جاتا ہے۔ پونچھ کی تحصیل سدھنتی پر سدھنوں کو اقتدار حاصل تھا۔ اسطرح تحصیل باغ کے بالائی حصے پر ملدیال قبیلے کا راج تھا جبکہ غربی و شرقی باغ کے بعض علاقوں میں تیزیال، کھکھے، ڈھونڈ، نارے، اعوان، سید، منہاس، تھکیال اور گکھڑ وغیرہ اثر قائم کئے ہوئے تھے لیکن مجموعی طور پر برتری ملدیال قبیلے کو ہی حاصل تھی۔ تحصیل حویلی کا ایک حصہ بھی ملدیال سرداروں کے قبضے میں تھا جبکہ باقی علاقوں پر دولی، گوجر، تیڑوا اور دوسرے قبائل قابض تھے۔

سکھوں کے عہد میں گلاب سنگھ جو جموں کے ڈوگرہ کشور سنگھ کا بیٹا تھا نے دربار لاہور کی اعانت وسرپرستی بلکہ سرفرازی کے باعث خاص مقام وطاقت حاصل کر لی اور اقتدار سنبھال لیا۔ دوسری طرف مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دھیان سنگھ کو بھمبر اور چبال وغیرہ کے علاقے دیئے اور اس کے بیٹے ہیرا سنگھ کو جو مہاراجہ کا خاص چہیتا تھا کو پونچھ اور جسروٹہ کے علاقے بخش ڈالے اس زمانے میں پونچھ پر عملاً اہل پونچھ کا قبضہ وحکمرانی تھی۔

اب ڈوگرہ برادران نے ان آزاد قبائل کو مفتوح بنانے کے متعلق سوچنا شروع کیا لیکن اس میں انہیں سخت مشکل پیش آئی۔ مشہور انگریز مصنف سمتھ اپنی کتاب ''رینگ فیملی آف لاہور'' میں لکھتا ہے کہ ''جموں کے ڈوگرہ برادران کی نظریں ان آزاد قبائل پر لگی ہوئی تھیں اور وہ انہیں اپنے تسلط میں لانا چاہتے تھے وہ بظاہر انہیں لاہور دربار کا مطیع کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کا منشا یہ تھا کہ آزاد قبائل کو اپنی غلامی میں جکڑ لیں۔ مگر انہیں جلد ہی احساس ہوگیا کہ ان قبائل کو اپنے تابع کرنا آسان نہیں جتنا وہ سمجھتے تھے اس مقصد کے حصول کے لئے رنجیت سنگھ ڈوگرہ برادران کے کہنے پر ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر راولپنڈی کی طرف روانہ ہوا اور کری کے مقام پر جو اس علاقے کا Gate Way ہے پڑاؤ کیا اور پھر اپنی 150 توپوں سے پہاڑی علاقے پر شدید گولہ باری کی اور ازاں بعد یلغار کر کے اس علاقے پر کسی حد تک قبضہ کر لیا۔ یہاں کے علاقے کے لوگوں کو مطیع رکھنے کے لئے ان کے ایک سردار شمس خان کو یرغمال کے طور پر دھیان سنگھ کے ہاں ملازم رکھا گیا کہ اسطرح سدھن قبیلہ جو زیادہ سرکش و بے حد باغی ہے کو قابو کیا جا سکے۔ شمس خان نے جلد ہی راجہ کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اس عہد میں سرحد کے علاقے میں سکھوں کے خلاف جگہ جگہ بغاوت شروع ہوئی اور انہیں کئی جگہوں پر شکست بھی ہوئی۔ جس کی وجہ سے پونچھ کے باغی قبائل جو وقتی طور پر مغلوب تو ہوئے تھے لیکن ہر وقت اپنی آزادی کے لئے بے قرار رہتے تھے، نے سکھوں کے خلاف بغاوت کر دی اس وقت شمس خان جو راجہ سے رخصت لے کر اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔ گلاب سنگھ نے اس کی اور اس کے خاندان کی گرفتاری کا حکم دیا۔ یہی وقت تھا جب چنگاری شعلہ بن گئی۔ سارا پونچھ بغاوت پر آمادہ ہوگیا۔ جموں کی فوج جس کی قیادت اودھم سنگھ کر رہا تھا کو سدھنوتی میں پے در پے شکستیں دی گئیں۔ لہذا گلاب سنگھ ایک بڑی فوج کے ساتھ خود اس علاقے کا رخ کرنے پر مجبور ہوا۔ گلاب سنگھ ہزاروں کے لشکر کے ساتھ اس علاقے پر حملہ آور ہوا۔ لیکن کامیابی کو مخدوش پا کر اس نے رشوت، لالچ اور دباؤ جیسے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کئے۔ اس نے اعلان کیا کہ جو شخص ایک باغی کا سر کاٹ کر لائے گا اسے پانچ روپے انعام دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد اس کی فوج نے ہزاروں بے گناہ معصوم باشندوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ اس دوران عورتوں بچوں اور بوڑھوں تک کو معاف نہیں کیا گیا۔ گلاب سنگھ نے ایک طرف عوام پر ظلم کا ہر وار آزمایا تو دوسری

طرف شمس خان کی گرفتاری پر بھاری انعام و لالچ دینے شروع کئے لیکن اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ کافی دنوں بعد وہ دھوکے سے شمس خان، راجولی خان اور ان کے ساتھیوں کو شہید کرانے میں کامیاب ہوا۔ اور شمس خان کا سر کاٹ کر لوہے کے پنجرے میں ڈال کر پونچھ کے ایک پہاڑی درے ''ادھ ٹھک'' کے مقام پر رکھوادیا کہ لوگوں کو خوفزدہ کیا جا سکے۔

یوں شمس خان شہادت کا رتبہ پا کر امر ہو گیا۔ اور تاریخ کا روشن باب ٹھہرا۔ شمس خان کی یاد میں آج بھی لوگ پونچھ میں رزمیہ گیت گاتے ہیں اور اپنے ہیرو کو لوگ برابر صدیوں بعد بھی خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

سردار شمس خان کی شہادت کے بعد بھی یہ تحریک برابر جاری ہی۔ اس تحریک کی قیادت سردار سبز علی خان اور سردار ملی علی خان کر رہے تھے۔ ان کے بیسیوں ساتھی اس عمل میں ان کے شریک کار تھے۔ گلاب سنگھ شمس خان کی شہادت کے بعد اپنے طور پر یہ سمجھ رہا تھا کہ اب بغاوت ختم ہو چکی، لہذا جب وہ پشاور واپس جا رہا تھا تو اسے سدھن قبائل کی بغاوت کی خبر ملی۔ لہذا وہ جلد ہی بہت بڑا لشکر لے کر سدھنوتی پر حملہ آور ہوا۔ اور بہت سخت مقابلے اور قتل و غارت کے بعد اس تحریک کے مرکزی کرداروں سردار سبز علی خان اور سردار ملی خان کو گرفتار کر سکا اور بعد میں اس نے سبز علی خان اور ملی علی خان اور ان کے دیگر ساتھیوں کی زندہ کھالیں اتارنے کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل میں منگ کے مقام پر ان حریت پسندوں کی کھالیں بڑی بے دردی سے اتاری گئیں۔ اس حوالے سے گلاب نامے کا مصنف لکھتا ہے ''ایک روز سبز علی اور ملی علی خان کی کھالیں سینہ تک ادھیڑ دی گئیں۔ خون ان کے تمام بدن سے رس رہا تھا۔ تو انہوں نے درخواست کی کہ انہیں بیوی بچوں کو دیکھنے کی ایک لمحہ کے لئے اجازت دی جائے مگر ان کی درخواست منظور نہ ہوئی۔ جب اس کی کھال حلق تک اتاری گئی تو اس نے پانی مانگا، ابھی ایک ہی گھونٹ پیا تھا کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔ اس کے باقی ساتھیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا گیا۔ پھر ان کا گلہ کاٹ دیا گیا ان کی کھالوں کو سروں کے ساتھ دوبارہ جوڑ کر ان میں گندم کا بھوسہ بھرا گیا اور لوگوں کو عبرت دلانے کے لئے ان کھالوں کو سولی پر رکھا گیا'' یاد رہے کہ اس زمانے میں پونچھ کی نصف سے زائد آبادی شہید کر دی گئی۔ لیکن یہاں کے لوگوں نے ظلم کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اگر چہ اس طرح ڈوگر نے وقتی طور پر بغاوت دبانے میں کامیاب ضرور ہوئے لیکن آزادی کی چنگاری یہاں برابر سلگتی رہی۔

اب ۱۸۴۶ء کے بدنام زمانہ معاہدۂ امرتسر کے ذریعے کشمیر پر ڈوگرہ راج کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں پونچھ میں ایک جاگیر کے طور پر کشمیر کا حصہ رہا لیکن گلاب سنگھ کے علاوہ موتی سنگھ، بلدیو سنگھ، سکھدیو

سنگھ، جگدیو سنگھ وغیرہ کا سنگھاسن قائم رہا۔ دوسری طرف پونچھ کے عوام کی جدوجہد بھی جاری رہی۔ اس کا ایک رخ راجہ بلدیو سنگھ کے عہد میں ''تحریکِ حقوقِ ملکیت'' کی صورت میں ۱۸۹۹ء میں ظاہر ہوا۔ یاد رہے کہ اس وقت پونچھ میں حق ملکیت اراضی راجہ کے نام ہوتا تھا۔ جب مقامی لوگ محض کاشتکار کے طور پر زمینداری کرتے تھے۔ اس ظلم کے خلاف اہلِ پونچھ نے سردار بہادر علی خان کی قیادت میں علمِ بغاوت بلند کیا اور طویل قانونی جدوجہد کے بعد سردار بہادر علی خان لاہور ہائی کورٹ سے حق ملکیت کا مقدمہ جیتنے میں کامیاب ہوئے۔ اس تحریک میں سردار بہادر علی خان کو اپنے قبیلے سدھن کے علاوہ پونچھ کے دیگر قبائل کا تعاون بھی حاصل رہا۔ سردار شمس خان شہید، سردار سبز علی خان شہید، سردار ملی علی خان شہید، کی طرح سردار بہادر علی خان بھی پونچھ کی تاریخ کا ہمیشہ زندہ رہنے والا کردار ہیں لوگ انہیں آج بھی خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اور ان سے کس قدر محبت کرتے ہیں اس کا اندازہ لوک گیتوں سے ہوتا ہے جو پونچھ کے گاؤں گاؤں، گھر گھر آج بھی سردار بہادر علی خان کی یاد میں گائے جاتے ہیں۔

ریاست پُونچھ

کے۔ڈی مینی

پونچھ پہاڑی قبائل کی سب سے پرانی ریاست رہی ہے۔جس کا ذکر پرانے زمانے کی کتابوں میں وروابھسیار کے نام سے ہوا ہے۔جس کا حدودِ اربع دریائے جہلم اور دریائے چناب کے تمام بالائی پہاڑی علاقوں پر مشتمل تھا ۔جس میں راجپوری (راجوری) کالجر (کوٹلی) بھمبر اور پونچھ کے علاقے شامل تھے۔دراوابھیسار کا قدیم مذہبی کتابوں میں بھی ذکر ملتا ہے۔جن میں نیل مت پران، مہابھارت، کلہن کی راج ترنگنی، تاریخ الہند۔سکندر کے ساتھ آئے ہوئے یونانی مورخ آریانہ سٹیریو اور ہیون سانگ کے سفرنامے شامل ہیں۔ان کتابوں میں پونچھ کو مختلف ناموں سے لکھا گیا ہے۔جیسے پرنا اتسو۔پن نُت سو۔مرر او ابھیسار۔ابھیسار پرنست پولست نگر۔رستم نگر۔لوہر کوٹ۔پرونتس۔پرونس۔اور پُونچھ وغیرہ۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پونچھ کو عہدِ قدیم میں دراو ابھیسار کہا جاتا تھا۔یہ نام دو مقامی

کچھ ان کے بارے میں:

نام : خوشدیو مینی

قلمی نام: کے ڈی مینی

ولدیت: شری دیوندر مینی

پیدائش: یکم اکتوبر 1947ء بمقام فضل آباد' سرنکوٹ

تعلیم: ایم ایس سی (اراضی)

ادبی زندگی کا آغاز: ستاروں سے آگے میں غزل کی اشاعت کے ساتھ۔

تصانیف: نثر و نظم ،آخر میں ملاحظہ کریں

پیشہ: کشمیر ایڈمنسٹریٹو آفیسر (ریٹائرڈ)

ذریعۂ اظہار: انگریزی' اُردو، پہاڑی، گوجری

موجودہ پتہ: محلہ جرنیلا، پونچھ (جموں و کشمیر)

جنگجو قبائل یعنی دراو۔ اور ابھیسار پہاڑی قبائل کو ملا کر وجود میں آیا تھا جو اس علاقے کے اصل باشندے تھے۔ دراو اور ابھیسار قبائل کی بہادری کے تذکرے مہابھارت کی جنگ میں بھی ملتے ہیں۔

سکندر کے حملہ کے وقت یعنی 326 ق م میں بھی اس علاقے کو دراو ابھیسار کہا جاتا تھا جس کے دار الخلافہ کا نام بھی ابھیسار پرست تھا۔ سکندر کے ساتھ آنے والے مورخ آریانہ اور سٹیریو لکھتے ہیں کہ 326 ق م میں شمالی ہندوستان میں تین بڑی ریاستیں تھیں یعنی، تکشلا، ہزارہ اور ابھیسارہ۔ جن کی سرحدیں ایک دوسرے ملتی تھیں۔ جب سکندر نے حملہ شروع کیا تو تکشلا کے راجہ انبھی نے سکندر سے صلاح کر لی۔ ہزارہ کے راجہ پورس نے مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ جبکہ ابھیسار کے راجہ بُدھسٹر نے آخر وقت پر غیر جانب دار رہ کر اپنی ریاست کو تباہی سے بچایا تھا۔ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ اگر راجہ بُدھسٹر نے اپنی ہمسایہ ریاست ہزارہ کے راجہ پورس کا ساتھ دیا ہوتا تو تاریخ کچھ اور ہوتی۔

633ء میں ہیون سانگ کشمیر جاتے ہوئے پہاڑی قبائل کے علاقہ پونچھ سے بھی گزرے تھے انھوں نے پونچھ کو کشمیر کا حصہ بتایا ہے۔ وہ علاقے کے عوام کے بارے میں اپنی کتاب ''دی ٹریولر آف یانگ سُو'' میں لکھتے ہیں کہ پونچھ کے پہاڑی قبائل اپنے گھروں کے ساتھ باغ لگاتے ہیں۔ گنے کے کھیت لگاتے ہیں۔ گندم اُگاتے ہیں اور بڑھیا قسم کی کافی کی پیداوار بھی کرتے ہیں۔ (یہاں کافی سے مراد مقامی چائے مصلون سے ہے جو کتھئی رنگ کی ہوتی ہے اور ذائقے میں کافی سے ملتی جلتی ہے) لوگ بڑے ذہین، بہادر اور سلجھے ہوئے ہیں۔ اور سوتی دھاگے کے لباس پہنتے ہیں۔ عقیدے کے لحاظ سے بدھ مت پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن آگے چل کر نویں صدی عیسوی تک بدھ مت ناپید ہو جاتا ہے۔ جب سارے ہندوستان کی طرح کشمیر اور پونچھ کے لوگ بھی شنکر آچاریہ کے ویدانت سے متاثر ہو کر ہندو مت اختیار کر لیتے ہیں۔

پونچھ ریاست کا باقاعدہ آغاز 850ء میں ہوتا ہے جب مقامی پہاڑی سردار جو کہ گھوڑوں کا سوداگر تھا کشمیر کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اپنی حکومت قائم کر لیتا ہے۔ پھر پہاڑی ہندو راجے لوہر کوٹ یعنی لورن کے مقام پر ایک زبردست قلعہ تعمیر کر کے حکومت شروع کر دیتے ہیں۔ کلہن کی راج ترنگنی کے مطابق جس بھی راج کا اقتدار لوہر کوٹ پر ہو جاتا تھا۔ اصل میں وہی کشمیر کا حکمران مانا جاتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں کشمیر میں داخل ہونے والی اہم شاہراہ توش میدان کے پہاڑی سلسلوں کے عین جنوب میں اس قلعے کی اہمیت اسے کشمیر کا دروازہ بنا دیتی تھی۔ لوہر کوٹ پونچھ شہر سے 31 میل شمال مشرق میں واقع ہے۔

لوہر کوٹ میں ۸۵۰ء سے ۱۴۵۲ء تک پہاڑی ہندو راجاؤں کا راج رہا جن میں سنگھ راج کشتی راج،

ملارجن، لوتھن اور سسل وغیرہ شامل ہیں۔ پہاڑی راجہ سنگھ راج نے کابل کے راجہ بھیم شاہی کی دختر سے شادی کی ہوئی تھی جس کے بطن سے 'درا' کا جنم ہوا جس کی شادی کشمیر کے راجہ کیشم گپت سے ہوئی تھی۔ کیشم گپت کے انتقال کے بعد ۹۸۰ء میں 'درا' کشمیر کی مہارانی بنی اور اُس نے ۱۰۰۳ء تک کشمیر پر حکومت کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں پونچھ کے پہاڑی راجے کابل اور کشمیر کے راجاؤں کی ٹکر کے راجے مانے جاتے تھے۔ اسی زمانہ میں لوہر کوٹ کے تحت علاقہ منڈی، سُرن، پونچھ اور سدھرون وادی ہوتی تھی۔

ریاست پونچھ پر پہاڑی ہندو راجاؤں کا دور ۱۴۵۲ء تک چلتا ہے۔ جب کشمیر کے سلطان بڈشاہ اسے اپنی مملکت میں ضم کر کے مقامی حکومت کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اُس کے بعد ۱۵۹۶ء میں یہ علاوہ نومسلم سراج الدین راٹھور کو شہنشاہ اکبر عطا کر کے اسے راجگی کا پروانہ دیتے ہیں اور سراج الدین کہوٹہ گاؤں سے موجودہ شہر پونچھ میں آکر پہاڑی مسلمان راجاؤں کی حکومت قائم کرتے ہیں۔ ان پہاڑی مسلمان راجاؤں نے ۱۷۹۲ء تک حکومت کی، ان راجاؤں میں راجہ عبدالرزاق، راجہ رستم خان اور خان محمد خان قابل ذکر ہیں۔ ان پہاڑی راجاؤں کے دور میں پونچھ کا راج وادئ لورن، گاگریاں، وادی منڈی، سدھروں، مہنڈر باغ اور پلندری تک پھیلا ہوا تھا۔ ۱۸۱۹ء میں جب مہاراجہ نے پونچھ کے گجر سردار روح اللہ خان سے اقتدار چھین کر یہاں خالصہ حکومت کی بنیاد ڈالی تو پہاڑیوں نے اس بیرونی اقتدار کو قبول نہ کیا۔ اور ۱۸۳۷ء میں شمس خان ملدیال کی قیادت میں زبردست بغاوت کر دی۔ شمس خان نے اپنے آپ کو پونچھ کا راجہ بنا دیا۔ اس بغاوت کو دبانے کے لئے جموں کے راجہ گلاب سنگھ کو ایک بڑی فوج کے ساتھ پونچھ آنا پڑا اور چار ماہ تک پونچھ کی خاک چھاننے کے بعد مخبروں کی اطلاع پر شمس خان اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کرا کے ان کے سروں کو نیزوں پر آویزاں کر کے لاہور بھیجا۔ شمس خان کی موت کے بعد پہاڑی تلوار کو بری طرح توڑ دیا گیا اور پہاڑی تشخص کو مٹانے کے ہر حربے کو استعمال میں لایا گیا۔

۱۸۴۶ء کے معاہدۂ امرتسر کے بعد مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۱۸۵۲ء میں راجہ موتی سنگھ (بھتیجے) کو پونچھ کا راجہ بنا کر بھیجا اور پھر ۱۹۴۷ء تک پونچھ ڈوگرہ عہد کے تحت رہا لیکن اس دور میں بھی پونچھ میں پہاڑی عوام اپنی پہچان اور شناخت کی لڑائی برابر لڑتے رہے۔ اور مشکل سے مشکل دور میں بھی پہاڑیوں نے اپنا حوصلہ نہیں کھویا، ہمت نہیں ہاری اور اپنے وقار پر آنچ تک نہ آنے دی۔

ڈوگرہ عہد کے دور میں ریاست پونچھ تحصیل باغ، سدھنتی، مہنڈر، حویلی اور علاقہ تھکیالہ پڑاوہ پر مشتمل تھی۔ اسی دور میں ۱۹۱۷ء اور ۴۲۔۱۹۳۹ء میں دو عالمگیر جنگیں ہوئیں جن میں پہاڑی قبائل کے شیر دل جوانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور آبادی کے تناسب سے پورے ہندوستان میں پونچھ ریاست کے پہاڑیوں نے سب

سے زیادہ ان لڑائیوں میں حصہ لیا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر تقریباً ۶۰ ہزار پہاڑی جوان جنگ میں حصہ لینے کے بعد واپس لوٹے تھے۔ چونکہ ان نوجوانوں نے دنیا دیکھ لی تھی اور اپنے حقوق کے بارے میں روشناس ہو چکے تھے اس لئے پونچھ کے طول وعرض میں پہاڑیوں نے اپنے حقوق اور جائز مانگوں کے لئے مقامی ڈوگرہ راج کے خلاف جدوجہد شروع کردی تھی۔ جن کی رہنمائی جناب غلام حیدر جنڈالوی، محمد عبد اللہ مغل گڑھی، پیر نثار حسین وغیرہ کررہے تھے۔ ادھر ترلوٹی باغ کے سردار ابراہیم خان پونچھ واپس آچکے تھے۔ اگرچہ وہ سرینگر میں پریکٹس کرتے تھے لیکن مقامی لوگوں اور رہنماؤں سے ان کا برابر رابطہ تھا۔

اسی دوران ملک آزاد ہوا۔ آزادی ملنے کے ساتھ ہی ۱۵،۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دو ملک یعنی بھارت اور پاکستان وجود میں آگئے۔ ریاستوں کو دونوں میں سے کسی ایک ملک کے ساتھ الحاق کرنے کا اختیار انگریز حکومت نے دیا مگر مہاراجہ ہری سنگھ نے دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی الحاق نہ کیا۔ ان حالات میں پاکستان کے رہنماؤں نے کشمیر کو حاصل کرنے کے لئے تین نکاتی فوجی پلان مرتب کیا۔ یعنی اپنی فوج کے میجر جنرل اکبر خان کو کٹھوعہ سے میرپور تک کے علاقوں میں آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ جو جنرل طارق کے نام سے دو ہزار سول کپڑوں والے فوجیوں کی قیادت کررہے تھے۔ سردار ابراہیم خان کو پونچھ کے ۶۰ ہزار ریٹائرڈ فوجیوں کی شیرازہ بندی اور پھر بغاوت پر آمادہ کیا۔ اور صوبہ سرحد میں ریٹائرڈ میجر خورشید انور سے کہا گیا کہ وہ تیس ہزار آفریدی، مسعودی اور دیگر قبائل کو لے کر براستہ جہلم ویلی روڈ کشمیر کی طرف بڑھے اور حملے کا دن ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء مقرر کیا گیا۔

سردار ابراہیم خان ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء کو کشمیر سے روانہ ہوئے۔ ۲۳ اگست کو وہ کوہ مری میں پاکستانی افسروں اور ہزارہ کے راجہ یعقوب خان سے ملے اور پونچھ میں بغاوت کا منصوبہ تیار کیا۔ ۲۳ اگست ۱۹۴۷ء کو نیلہ بٹ کے مقام پر سردار عبدالقیوم خان نے ایک تشدد آمیز جتھے کی قیادت کی۔ ۲۷ اگست کو سردار ابراہیم خان نے ہزارہ میں راجہ یعقوب خان سے دوبارہ ملاقات کر کے ہتھیاروں اور اسلحہ بارود کو پونچھ علاقہ میں بھیجنا شروع کیا۔ اسی روز سید نذیر حسین ایڈوکیٹ نے پونچھ شہر میں پوسٹ آفس پر پاکستانی جھنڈا لہرایا اور غائب ہو گئے اور ۳۱ اگست کو ستی اور ڈھونڈ پہاڑی قبائل نے علاقہ باغ میں زبردست ہنگامہ کیا۔ اور ۲۰ پہاڑی مارے گئے۔ اس طرح پونچھ میں بکھرے بکھرے ڈوگرہ سپاہی مقابلہ سے کترانے لگے۔ ادھر سردار ابراہیم خان کو ساٹھ ہزار ریٹائرڈ فوجیوں کے علاوہ پاکستانی فوج کے ایک بریگیڈ کی حمایت بھی مل گئی جس کی قیادت بریگیڈیر حیات الدین کررہے تھے۔ اسطرح ڈوگرہ فوج کی بکھری ہوئی دو بٹالین کے لئے ناممکن ہو گیا کہ وہ اتنے بڑے حملے کا مقابلہ کرتیں چنانچہ انہوں نے مرحلہ وار علاقہ باغ میں کرنل مملوک سنگھ ہنگل اور پلندری میں بریگیڈیر کرشن سنگھ قیادت کررہے تھے۔ ۲۱

اکتوبر کو قبائلیوں اور مقامی ریٹائرڈ فوجیوں نے پاکستانی فوج کی قیادت میں ڈوگروں پر یلغار شروع کردی۔ اور ۲۵ اکتوبر تک پلندری کا علاقہ ان کے قبضے میں چلا گیا۔ ۲۵ اکتوبر شام کو پلندری میں ایک آزاد کشمیر حکومت کا اعلان کردیا۔ بعد میں یہ حکومت پونچھ کے ہی ایک اور قصبہ تراڑکھل میں منتقل ہوئی۔ اور پھر باغیوں نے پونچھ شہر پر یلغار شروع کردی اس دوران ڈوگرہ فوجی اکتوبر کو چڑالہ سے نومبر کوراولاکوٹ ،نومبر کو ہی باغ سے پسپا ہوکر پونچھ آگئے۔

اُدھر 27 اکتوبر 1947ء کو ہندوستانی فوج کے پہلے دستے کے اُترنے کے بعد جوابی حملہ شروع ہوگیا اور 14 نومبر تک پاکستانی فوجی افسروں کی قیادت میں لڑ رہے قبائلیوں کو وادی سے نکال کر اوڑی سے پرے دھکیل دیا گیا۔

اُدھر جموں میں جنرل کلونت سنگھ اور اوڑی میں بریگیڈیر سین کو حکم دیا گیا کہ 19 نومبر کو جموں نوشہرہ کی طرف سے اور اوڑی کی جانب سے پونچھ کی طرف کوچ کیا جائے اور پونچھ کو ملک کے ساتھ ملا دیا جائے۔ اس طرح بریگیڈیر پران چپ نے جموں سے مہم شروع کی اور 26 نومبر تک کوٹلی پہنچ گئے لیکن اسی روز 26 نومبر کو میرپور پر پاکستانی فوج کا قبضہ ہوگیا اور حملہ آور جھنگڑ کی طرف بڑھنے لگے۔ ان حالات میں کوٹلی پر قبضہ برقرار نہ رہ سکا اور فوج واپس جھنگڑ آگئی جہاں پاکستانی فوج نے پے درپے حملوں میں ایسا الجھایا کہ اس بریگیڈ کی پونچھ کی طرف پیش قدمی رک گئی اور اس کالم کی تمام تر توجہ نوشہرہ کے دفاع پر لگ گئی۔

دوسری جانب 19 نومبر کو اوڑی سے براستہ حاجی پیر پونچھ کی طرف پیش قدمی ہوئی اور فوج حاجی پیر عبور کر کے رات کو علی آباد آگئی۔ 2 نومبر صبح کہوٹہ کی طرف مارچ ہوا لیکن چھانجل کے مقام پر پُل جل جانے کے باعث یہ بریگیڈ پونچھ نہ پہنچ سکا اور صرف ایک بٹالین کرنل پریتم سنگھ کی قیادت میں پونچھ کے دفاع کو مضبوط کرنے کی غرض سے پیدل چل کر پونچھ آگئی جبکہ باقی فوج اوڑی چلی گئی۔

اُس وقت پونچھ شہر کا ہر طرف سے سردار ابراہیم خان کے جوانوں اور پاکستانی فوج نے محاصرہ کیا ہوا تھا۔ صرف ڈیڑھ مربع میل علاقے کو چھوڑ کر باقی تمام علاقہ باغیوں کے قبضہ میں تھا جنھوں نے تراڑکھل میں آزاد کشمیر حکومت قائم کی ہوئی تھی۔

ان حالات میں بریگیڈیر پریتم سنگھ نے دو ڈوگرہ بٹالینوں اور ایک کماؤں بٹالین کے علاقہ مقامی پہاڑی نوجوانوں پر مشتمل دو ملیشیا بٹالین تیار کیں۔ 10 دسمبر تک ہوائی گراؤنڈ تعمیر کر کے ایک طرف 35 ہزار رفیوجیوں کے لئے جموں جانے کا راستہ کھولا تو دوسری جانب راشن پانی اور اسلحہ بارود کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا

اسی دوران 28 نومبر کو دہلی میں ڈیفنس کمیٹی کی میٹنگ میں پنڈت نہرو نے ناراضگی ظاہر کی کہ ہماری فوجیں دومیل تک کیوں نہیں گئیں اور اوڑی میں ہی رُکی ہوئی ہیں۔ اس میٹنگ کی روشنی میں جنرل راک ہرٹ اور جنرل رسل نے نیا فوجی منصوبہ بنایا جس کے تحت نوشہرہ میں جموں بریگیڈ کو رکنے کے لئے کہا گیا اور پونچھ شہر سے فوج اور رفیوجیوں کو اوڑی منتقل کرنے کی تجویز دی گئی تا کہ دومیل کی طرف بڑھا جاسکے۔ یہ منصوبہ 6 دسمبر کو جموں میں ڈیفنس کمیٹی کی میٹنگ میں جنرل رسل نے پنڈت جواہرلعل نہرو کے سامنے رکھا۔ اس میٹنگ میں مہاراجہ ہری سنگھ اور بخشی غلام محمد بھی شامل تھے۔ جنرل رسل نے کہا کہ ہم دومیل کی طرف تبھی پیش قدمی کر سکتے ہیں اگر پونچھ سے دستبردار ہو جائیں۔ اس تجویز کی پنڈت جواہرلعل نہرو نے سخت مخالفت کی اور کہا کہ پونچھ سے پسپائی ہمارے لئے سب سے زیادہ ہزیمت کا باعث ہوگا اور قبائلیوں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے۔ ادھر رفیوجیوں کے ساتھ جو سلوک ہوگا اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اس لئے تمام تر توجہ پونچھ کے دفاع پر مرکوز کر کے اُسے بچایا جائے۔ لیفٹیننٹ جنرل کلونت سنگھ نے کہا کہ وہ اپنی پوری طاقت لگا کر پونچھ کے محاصرے کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس طرح 6 دسمبر 1947ء کا دن پونچھ کی تاریخ میں اہم دن تھا۔ جب پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنی تمام دفاعی کمانڈ کی تجویزوں کو رد کرتے ہوئے ایک مضبوط سیاسی عزم کا اظہار کیا اور افواج کو حکم دیا کہ وہ کسی بھی صورت میں پونچھ کا دفاع کرے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دومیل کی طرف بڑھنے کے بجائے ہماری دفاعی افواج پونچھ کے تحفظ اور اس کا محاصرہ ختم کرنے پر لگ گئیں۔

پنڈت جواہرلال نہرو کے سیاسی فیصلے کے بعد پونچھ کے دفاع پر توجہ مرکوز کر دی گئی اور محاصرہ توڑنے کے منصوبے مرتب ہونے لگے۔ اسی دوران دسمبر 1947ء کے آخر میں اور پھر 25 جنوری کی رات اور 17 مارچ کو پاکستانی افواج کی جانب سے ایک بریگیڈ فوج کے تین بڑے حملے پونچھ شہر پر ہوئے جن کی قیادت بریگیڈیر سعادت الدین اور کرنل رحمت اللہ کر رہے تھے۔ لیکن پونچھ شہر میں ڈوگرہ و کماؤں یونٹوں کے ساتھ ساتھ مقامی پہاڑی نوجوانوں کی دو بٹالین ملیشیا فوج نے اس عزم اور بہادری سے مقابلہ کیا کہ تمام وسائل کے باوجود پاکستان شہر کے دفاع کو توڑنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس بارے میں پاکستانی فوج کے انگریز کمانڈر رسل ہیٹ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ ''پونچھ شہر کی حفاظت کے لئے تین ہزار ہندوستانی سپاہی موجود تھے اور تین ہزار کے قریب مسلح پاکستانی فوجی بھی شہر پر قبضہ کے لئے لڑ رہے تھے جنہوں نے شہر کو چاروں اطراف سے گھیرا ہوا تھا۔ وہ کئی دنوں تک پونچھ کے محاذ پر ہندوستانی فوجیوں سے لڑتے رہے لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اس کی بڑی

وجہ ہندوستانی فوج کے کمانڈر بریگیڈیر پریتم سنگھ تھے جنہوں نے مشکل سے مشکل وقت میں ہمت نہیں ہاری۔ چونکہ انہیں مقامی پہاڑی نوجوانوں کا ساتھ بھی حاصل تھا اس لئے تقریباً گیارہ ماہ تک محاصرے میں رہ کر بھی محاذ پر ڈٹے رہے۔

اسی دوران نوشہرہ سے ہندوستانی فوج نے پونچھ کی جانب پیش قدمی جاری رکھی اور 19 انفنٹری بریگیڈ نے ایک زوردار حملے میں 18 اپریل 1948ء کو بروالی، 10 اپریل کو چنگس پاکستانی فوجوں سے چھین کر 13 اپریل کو بیساکھی کے دن راجوری شہر پر قبضہ کرلیا اور پاکستانی کمانڈر کرنل اسلم خان اپنی فوج کے ساتھ گوردھن علاقے سے پسپا ہوکر رام گڑھ کی طرف نکل گیا اُس وقت پاکستان کا تین بریگیڈ پونچھ کے جنوب میں بریگیڈیر حیات الدین کی قیادت میں سرگرم تھا۔ اور مہنڈر میں پاکستان کا ٹارزن بریگیڈ جما ہوا تھا۔ جس کی قیادت کرنل رحمت اللہ کر رہے تھے۔ جبکہ رام گڑھ راجوری میں راج بریگیڈ متعین تھا۔ پاکستان نے پونچھ کا محاصرہ توڑنے کی تمام کوششوں کو ناکام کرنے کا عزم کیا ہوا تھا۔ ان حالات میں میجر جنرل آتما سنگھ نے اپریشن گلاب کے تحت تھنہ منڈی کی طرف کوچ کیا۔ بریگیڈیر یارو ناتھ سنگھ نے جون کو تھنہ منڈی اور 16 جون کو دہرہ گلی پر قبضہ کر لیا 17 جون کو یہ کالم درابہ پہنچی اور اسی روز بریگیڈیر پریتم سنگھ نے سرنکوٹ پر قبضہ کرکے راجوری پونچھ کا عارضی ملاپ ممکن بنا دیا۔ لیکن سڑک کے نہ ہونے کے باعث اس علاقے میں فوجی چوکیاں قائم نہ ہوسکیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ 22 جون کو راجوری والی کالم براستہ بھمبر گلی جب واپس راجوری پہنچی تو پاکستانی فوجوں نے سارے علاقے پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔

ان حالات میں پونچھ پھر ملک سے کٹ گیا اُدھر اگست 1948ء میں یو این او میں جنگ بندی کا پرستاؤ پیش ہوگیا۔ ہندوستان جانتا تھا کہ جنگ بندی سے پہلے پونچھ کا رابطہ ملک سے بحال کر دیا جائے۔ چنانچہ سیاسی قیادت نے فوج کو حکم دیا کہ جتنا جلد ممکن ہو پونچھ سے رابطہ قائم کرلیا جائے۔ لیفٹیننٹ جنرل سری نیگیش کو آپریشن ''ایزی'' نام دیا گیا اور دو بریگیڈ فوج نے بریگیڈیر یارو ناتھ سنگھ اور بریگیڈیر امراو سنگھ کی قیادت میں پونچھ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اس حملے میں لیفٹیننٹ کرنل جگجیت سنگھ اروڑہ بھی شامل تھے (جنہوں نے 1971ء میں بنگلہ دیش آزاد کرایا تھا) چنانچہ 14 اکتوبر کو پیر بڈیشر 28 اکتوبر کو پیر کلیو 8 نومبر کو بھمبر گلی اور پھر 21 نومبر کو ٹوپا اور ڈنہ پیر چوٹی پر قبضہ کر لیا گیا۔ ادھر پونچھ سے بریگیڈیر پریتم سنگھ کے دستوں نے جھلاس، کرشنا گھاٹی کھنیتر، منڈی ساوجیاں پر قبضہ کرنے کے بعد 21 نومبر کو ڈنا پیر کے مقام پر راجوری والی کالم سے ملاپ کر کے پونچھ کو باقی ملک سے ملا دیا۔ اور پونچھ میں محصور 30 ہزار رفیوجیوں کو بچالیا۔

یکم جنوری 1949ء کو جنگ بندی لاگو ہو گئی۔اور فوجیں جہاں پر تھیں وہیں مورچہ بند ہو گئیں۔ریاست کی دو مغربی تحصیلیں باغ، سدھنتی، آدھی تحصیل حویلی، مہنڈر کے کچھ گاؤں اور تھکیالہ پڑاوہ کے سات گاؤں پاکستان کے قبضہ سے آزاد نہ کرائے جا سکے اُدھر حاجی پیر کا علاقہ یعنی علی آباد، کہوٹہ، چھانجل اور وادی سدھرون کے پاکستانی قبضے میں رہ جانے کے باعث پونچھ کا کشمیر سے دھار استہ کٹ گیا کیونکہ پختہ سڑک اسی راستے کشمیر جاتی تھی اور اوڑی کا پہاڑی قبائل کا علاقہ پونچھ سے صرف 42 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔دوسری جانب مدار پور والے راستے سے کوٹلی اور میر پور جانے والی سڑک بھی ''آزاد کشمیر'' میں چلی گئی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ پونچھ کا رابطہ تمام اہم شاہراہوں سے ٹوٹ گیا تھا اور پہاڑی قبائل کا مرکز پونچھ دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ایک حصہ سرحد کے اس طرح اور دوسرا حصہ سرحد کے اس طرف۔علاقہ بٹنے کے ساتھ ساتھ گھر کنبے اور خاندان بھی بٹ چکے تھے۔
مہنڈر کے راجپوت پہاڑی قبائل جو سردار کہلاتے ہیں آدھے اُس پار تھے اور آدھے اس پار۔اس طرح منڈی کے دُلی اور پیر خاندان اور بگیال درہ کے بگیال، اور کھڑی اور جھلاس اور بلنوئی کے سُدھن اور پٹھان خاندان اب ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔اُن کی آپس میں رشتے داریاں اور برادری اور بھائی چارے اور خون کے رشتے تو تھے مگر سیاست نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا۔اور درمیان میں ایک ایسی سرحدی لکیر کھینچ دی جہاں ہر روز خون نچڑتا ہے۔حملے اور بمباری ہوتی ہے۔مقابلے اور سازشیں ہوتی ہیں۔اور پستے ہیں پہاڑی قبائل اور ان کے ہمسایہ قبائل جو پچھلے پچاس سال سے زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہے ہیں۔اور یہ تو حقیقت ہے کہ پرندے جب زخمی ہو جاتے ہیں تو اُن کی اُڑان متاثر ہوتی ہے۔
آزادی سے پہلے پہاڑی قبائل کی ریاست پونچھ کا علاقہ 1667 مربع میل ہوتا تھا جبکہ اس وقت ہمارے قبضے والے پونچھ علاقہ کا رقبہ 567 مربع میل ہی رہ گیا ہے۔ضلع کا صدر دفتر پونچھ شہر میں قائم ہے جو سرحد سے صرف دو میل کے فاصلے پر ہے۔اور ہر روز سرحد کے آس پاس ہونے والی گولہ باری پہاڑی قبائل کے اہم ثقافتی، تاریخی اور سماجی مرکز پونچھ کے امن وسکون پر حاوی رہتی ہے۔پونچھ سے 248 کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع ہے۔اس وقت رقبے کے لحاظ سے پونچھ ریاست کا سب سے چھوٹا ضلع ہے جس کو تین اطراف سے لائین آف ایکچول کنٹرول نے گھیرا ہوا ہے۔یہ سرحد ساوجیاں سے لے کر تارکنڈی تک 102 کلومیٹر رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔مہنڈرا اور اُس کے نواحی گاؤں، میں آب وہوا گرم ہے جبکہ سرنکوٹ منڈی اور ساوجیاں کے موسمی حالات کشمیر سے ملتے جلتے ہیں اسی لئے اس علاقے کو چھوٹا کشمیر بھی کہا جاتا ہے، یہاں "60 کے لگ بھگ بارش ہوتی ہے۔پہاڑی چوٹیوں پر برف جبکہ وادیوں میں فطرت کی گل کاریاں اور سبزہ زاریاں اپنا رنگ دکھاتی ہیں۔

ضلع پونچھ انتظامی حد بندی کے تحت 1967ء میں وجود میں آیا تھا۔ اس وقت ضلع 178 گاؤں۔ 115 پنچائتوں، 51 پٹوار حلقوں، آٹھ نیابتوں، پانچ بلاکوں اور تین تحصیلوں پر منقسم ہے۔ 2001ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع پونچھ کی آبادی 3.71 لاکھ ہے۔ جبکہ پڑھنے لکھے لوگوں کی شرح 51.07 فیصد ہے۔ 74 فیصدی عوام کا انحصار زراعت پر ہے۔ ضلع میں 89 فیصد مسلمان جبکہ گیارہ فیصد ہندو اور سکھ لوگ بستے ہیں۔

☆☆☆

کے ڈی مینی کی تصانیف:

تاریخ پونچھ (اُردو)۔ پونچھ تاریخ وثقافت کے آئینہ میں (اُردو)۔ چادر (اُردو افسانے)۔ گپیں (اُردو طنزیہ و مزاحیہ انشائیے)۔ اُڈیکاں (پہاڑی افسانے)۔ رمزاں (پہاڑک لوک ادب) تاریخِ شاہدرہ شریف (اُردو)۔ تاریخ راجوری (اُردو، انگریزی)۔ چاند کے ساتھ ساتھ (اُردو شاعری)۔ سنگن (پہاڑی شاعر)۔ پہاڑی قبائل، تاریخ اور تشخص (اُردو)

پہاڑی۔ایک تعارف

ایم۔این۔قریشی، درآبوی

ابتدائیہ:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔تفکر کے لئے دماغ، احساس کے لئے قلب، سماعت کے لئے کان، دیکھنے کے لئے آنکھ، سونگھنے کے لئے ناک، چلنے کے لئے پانو، کام کے لئے ہاتھ اور بولنے کے لئے زبان عطا کی ہے، دماغ خیالات کا، قلب احساسات کا اور زبان الفاظ کا منبع ہے۔زبان ہی انسان اور حیوان میں حدِ فاضل قائم کرتی ہے۔زبان ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے دل کے گوشوں میں چھُپی ہوئی کیفیتیں آسانی سے دوسروں پر ظاہر کرتا ہے۔دُنیا میں ہر طرف زبان ہی کے جلوے اور زبان ہی کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔زبان کی رنگا رنگی اور اس کے گونا گوں مظاہر دیکھ کر ایک صاحبِ نظر نے کیا خوب کہا ہے!

کچھ ان کے بارے میں:

نام: محمد نذیر قریشی

قلمی نام: ایم این قریشی

ولدیت: لعل دین قریشی

تاریخ پیدائش:

2 نومبر 1941ء۔ بمقام درآبہ، سرنکوٹ

تعلیم: ایم اے

اُردو۔سماجیات، نفسیات، دینیات، فارسی، آنرز، عربی۔

تصانیف: متعدد نصابی کتب

پیشہ: ریٹائرڈ ماسٹر

موجودہ پتہ: موضع درآبہ، تحصیل سرنکوٹ، پونچھ

فون: 01965230433

خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود، گل کوزہ/خود بہرِ خریداری بازار بیامد

زُبان کی تخلیق

زبان کب، کیسے اور کیوں کر وجود میں آئی، اس کا کوئی قطعی زمانہ متعین کرنا اور رائے قائم کرنا مشکل ہے۔لیکن قیاس بتاتا ہے کہ ابتدائی انسان نے اپنی ذاتی، سماجی اور معاشی ضروریات اور جذباتی کیفیات کے اظہار کے لئے جسمانی اشاروں، تصویروں، آوازوں اور علامتوں سے کام لیا ہوگا۔ پھر اُن کے معانی متعین کئے ہوں گے۔آخر میں علامتوں کو حروف کی شکل دے کر اُن کے نام یا آواز مقرر کی ہوگیں۔اُن حروف کو جوڑ کر الفاظ اور جملے بنائے ہوں گے۔اور بہت بعد میں بول چال کی زبان نے تحریری شکل اختیار کی ہوگی۔ایک تحقیق کے مطابق انسان فطرت سے کوئی خاص زبان لے کر پیدا نہیں ہوا۔ بکہ سماجی اور معاشی ضروریات، طبعی حالات، موسمی تقاضوں اور ماحول نے مختلف انسانی گروہوں کو مختلف قسم کے خیالات، جذبات، احساسات، خواہشات اور ارادوں کو ظاہر کرنے کے لئے اشارے، تصویریں، آوازیں اور علامتیں دیں۔ پھر انھیں مختلف قسم کی صوتی علامتیں یا حروف مقرر کرنے پر مجبور کیا۔ظاہر ہے کہ جب حروف نے جنم لیا تو اُن کو ملانے سے الفاظ بنے، پھر مرکبات سامنے آئے۔اس طرح حروف، الفاظ اور مرکبات سے زبان کا ڈھانچہ تیار ہوا اور زبان معرض وجود میں آ گئی۔

اولادِ آدم سطح ارضی پر عام ہونے کے بعد اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے مختلف سمتوں میں پھیل گئی اور الگ الگ گروہوں میں بٹ کر، مختلف خطوں اور بستیوں میں آباد ہو کر مختلف شکلوں میں اپنے خیالات کا اظہار کرتی رہی۔اس طرح مختلف ماحولوں میں مختلف زُبانیں وجود میں آئیں۔اور ہر گروہ نے اپنے مخصوص جغرافیائی یا طبعی خطے میں اپنی اولاد کے لئے مختلف لسانی ماحول تشکیل دے دیا۔مختلف خطوں اور ملکوں میں بسنے والے انسانی گروہوں کی ان زبانوں میں مختلف تاریخی، جغرافیائی اور طبعی ماحول کے تفاوت کے زیرِ اثر اگر چہ نمایاں فرق موجود ہے۔تاہم کہیں کہیں ان میں کچھ ایسی یکسانیت بھی نظر آ رہی ہے کہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جس طرح رنگ، نسل، ذات اور مذہب کی تمیز کے باوجود کرۂ ارض کے انسان اولادِ آدم ہونے کے ناطے سے آپس میں ایک طرح کی قُربت رکھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح دنیا بھر کی مختلف زبانیں ماخذ کے لحاظ سے ایک ہی سرچشمہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

کسی زبان میں جس قدر الفاظ زیادہ ہوں اُسی قدر وہ اظہارِ خیال کی وسعتوں کی بنا پر علمی اور ادبی زبان بننے کے قابل سمجھی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ الفاظ گھڑ لینا کسی خاص آدمی کا کام نہیں بلکہ الفاظ ہمیشہ عوام کی صفوں

سے آتے ہیں۔عوام میں مختلف قسم کے پیشہ ور، تاجر اور کاری گر ہوتے ہیں، اُن ہی کی محنت، عرق ریزی اور رگوں میں دوڑنے والے گرم خون پر قوم اور ملک کی اقتصادی خوشحالی، سماجی بہبود اور ترقی کا دارومدار ہوتا ہے۔ زندگی جب تہذیب وتمدن کے اعتبار سے ترقی کے مختلف مراحل سے گزرتی ہے تو زُبان کے دامن میں نئے سکے ڈالتی چلی جاتی ہے۔ یہ سکے زبان کے بازار کو رونق اور سرمایہ بخشتے ہیں۔ ادھر بازار میں کاروبار کی گرمی آجاتی ہے اور اُدھر زبان کے چمن پر بہار کی تمام رعنائیاں چھا جاتی ہیں۔ اسی فطری اصول کے تحت پہاڑی نے بھی ترقی کے مراحل طے کئے۔

پہاڑی اور دُنیا کی زبانوں کے خاندان

دنیا میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں، اُن کی گروہ بندی دو طرح کی جاتی ہے۔ ایک لفظی اور صرفی خصوصیات کے لحاظ سے اس کو بھی دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا حصہ اُن زبانوں کا ہے۔ جو یک لفظی ہیں۔ اور جن کے اساسی یعنی بنیادی الفاظ شکلی تبدیلیوں کے ذریعہ اپنے مفہوم میں اضافہ اور تغیر وتبدل نہیں کرتے، بلکہ مفہوم ہر حالت میں یکساں رہتا ہے۔ ان زبانوں میں تمام الفاظ عموماً آزاد ہوتے ہیں۔ اور اُن میں سابقوں اور لاحقوں کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ اور ان کے بغیر ہی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

دوسرا حصہ اُن زبانوں کا ہے، جن میں الفاظ اپنیہ شکلیں بدلتے رہتے ہیں اور اُن کے ساتھ مفہوم بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سابقوں اور لاحقوں کے ذریعہ اُن کے معانی میں طرح طرح کے پہلو پیدا کئے جاتے ہیں۔ ایک ہی لفظ اصل یا مصدر ہوتا ہے۔ اُسی سے بہت سے الفاظ نکالے جاتے ہیں اور اُن سے طرح طرح کے مفہوم ادا کئے جاتے ہیں۔

دوسری دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کی طرح گروہ بندی، نسلی اور تاریخی تعلقات کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔ اس بنا پر دُنیا کی زبانوں کو آٹھ بڑے خاندانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جب کہ بعض ماہرین کے مطابق یہ تعداد بارہ ہے۔ لیکن آٹھ بڑے خاندانوں پر سب کا اتفاق ہے۔ دنیا کی زبانوں کے آٹھ بڑے خاندان درج ذیل ہیں:

(۱) سامی خاندان۔ (۲) ہند چینی خاندان)۔ (۳) بانتو خاندان۔ (۴) امریکی خاندان۔ (۵) ملایا خاندان۔ (۶) مونڈرا خاندان۔ (۷) دراوڑی خاندان۔ (۸) ہند یوروپی خاندان

دوسرے لسانی خاندانوں کے مقابلہ میں ہند یوروپی خاندان نہایت وسیع ہے کہ زمین کے نہایت اہم حصے پر پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان میں مونڈرا اور دراوڑی کے علاوہ سب سے زیادہ اسی خاندان کی زبانیں بولی جاتی

ہیں۔یوروپ کی اکثر زبانوں انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اٹالوی، پُرتگالی، یونانی وغیرہ کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔

چونکہ پہاڑی کا تعلق ہندیوروپی خاندانِ سے ہے اس کا ذکر حسب ذیل ہے:

ہندیوروپی........ہندایرانی..........ہندآریائی

ہندآریائی آگے پانچ گروہوں میں تقسیم ہوجاتی ہے:

ہندآریائی

شمال مغربی ـــــ جنوب مغربی ـــــ وسطی ـــــ مشرقی ـــــ جنوبی

ان میں سے پہاڑی زبان کا تعلق جنوب مغربی گروہ سے ہے۔

جنوب مغربی گروہ

راجستھانی ـــــ پہاڑی

پہاڑی آگے تین شاخوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔

پہاڑی

مشرقی پہاڑی ـــــ وسطی پہاڑی ـــــ مغربی پہاڑی

مشرقی پہاڑی سے دوشاخیں نکلتی ہیں

مشرقی پہاڑی

نیپالی ـــــ گھڑکھالی

وسطی پہاڑی سے بھی دوشاخیں نکلتی ہیں

وسطی پہاڑی

کمایونی ـــــ گھڑوالی

مغربی پہاڑی مندرجہ ذیل شاخوں میں تقسیم ہوجاتی ہے

مغربی پہاڑی

چمبالی ـــــ جونساری ـــــ سرموری ـــــ منڈیالی ـــــ دیگر تقریباً سترہ بولیاں

ہند آریائی

آریا حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اُس وقت یہاں دراوڑ قوم آباد تھی۔ آریوں نے اس قوم کو شکست دی اور دراڑوں کی بہت بڑی تعداد نے دکن میں پناہ لی، آریا شمالی ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ آریا ہندوستان میں ایک بار ہی نہیں بلکہ کئی گروہوں میں وارد ہوئے۔ آریا ہندوستان میں آتے رہے اور مختلف علاقوں میں پھیلتے رہے۔ وہاں سے دراوڑ آہستہ آہستہ ہٹتے رہے اور آریا آباد ہوتے رہے۔ اس طرح آریا شمالی ہندوستان کے پہاڑی علاقوں اور مغربی علاقوں میں بھی آباد ہو گئے۔ لہٰذا ہندوستان میں ہند آریائی کے ارتقا کو حسبِ ذیل ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ہند آریائی

قدیم ہند آریائی ________ وسطی ہند آریائی ________ جدید ہند آریائی

۱۔ قدیم ہند آریائی

قدیم ہند آریائی کو حسبِ ذیل دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے

(الف) ویدک سنسکرت۔ 1500 ق م سے 1000 ق م تک۔

(ب) کلاسکی سنسکرت۔ 1000 ق م سے 500 ق م تک

۲۔ وسطی ہند آریائی

وسطی ہند آریائی کو حسبِ ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے

(الف) پالی :500 ق م سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش تک

(ب) پراکرت :مولودِ عیسیٰؑ سے 500ء تک

(ج) اَپ بھرنش :500ء سے 1000ء تک۔

اشوک نے پالی اور پراکرت زبان کا استعمال کر کے اپنے فرامین اور مذہبی اصول ملک میں لاٹوں اور چٹانوں پر جگہ جگہ کندہ کرائے۔ اس سلسلہ میں اشوکی پراکرت بہت مشہور ہے۔ جس کو شِلا لیکھی پراکرت بھی کہتے ہیں۔ اَپ بھرنش بھی مختلف گری پڑی بولیوں کا مجموعہ ہے۔ اَپ بھرنش سب سے پہلے شمالی مغرب کی زبان ظاہر ہوتی ہے۔ ماہرینِ زبان نے حسبِ ذیل سات اَپ بھرنشیں فرض کی ہیں۔

شورسینی، پیشاچی، براچڈا، کھس، مہاراشٹری، اُردماگدھی، ماگدھی

۳۔جدید ہند آریائی

اس کا زمانہ 1000ء سے لے کر حال تک کا ہے۔ جدید ہند آریائی کی گروہ بندی حسبِ ذیل ہے:

جدید ہند آریائی

۱۔ بیرونی ۲۔ وسطی ۳۔ اندرونی
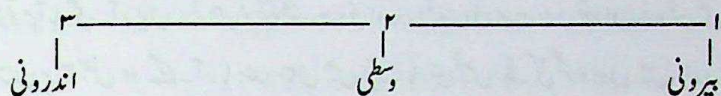
ان تینوں جدید آریائی زبانوں کا تعارف حسبِ ذیل ہے:

۱۔ بیرونی ہند آریائی

۱۔ شمال مغربی ۲۔ جنوبی ۳۔ مشرقی

شمال مغربی

لہندا — سندھی
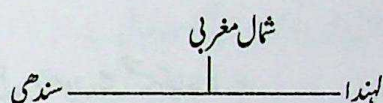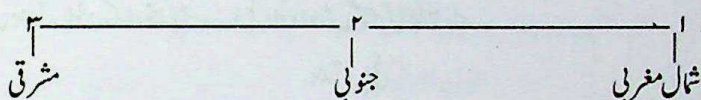
جنوبی

مراٹھی

مشرقی

اُڑیا بہاری بنگالی آسامی

۲۔ وسطی جدید ہند آریائی

۱۔ مغربی ہندی ۲۔ پنجابی ۳۔ گجراتی
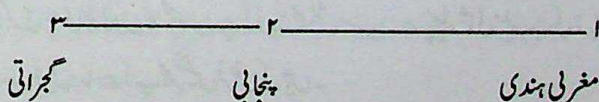
۳۔ اندرونی جدید ہند آریائی
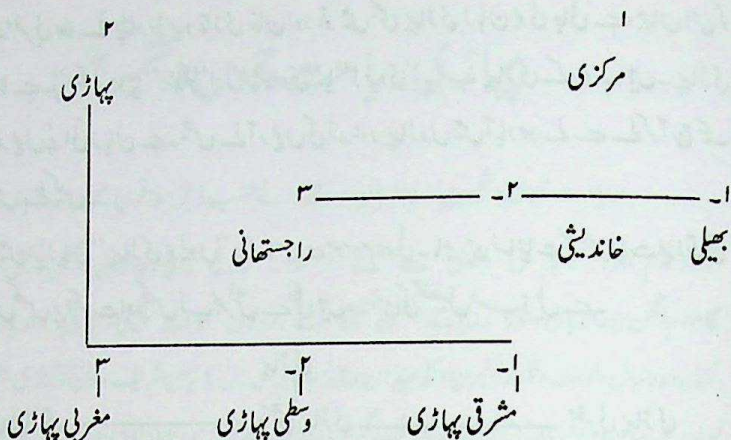
مندرجہ بالا جدولوں اور تقسیم کا مقصد یہ ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ ہند آریائی گروہ سے ہماری پہاڑی زبان کا تعلق کیا ہے، کہاں سے ہے اور کس طرح ہے؟ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ ہماری پہاڑی زبان کا تعلق براہ راست جدید ہند آریائی کی اندرونی شاخ سے ہے۔

پہاڑی کی اصل

بعض ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ پنجابی، سندھی اور مراٹھی کی طرح پہاڑی بھی اسی گروہ کی ایک شاخ ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے پہاڑی کو ''پراکرتوں'' میں شامل کیا ہے اور اُنھوں نے پہاڑی کا علاقہ ہندوستان کا جنوب مغربی حصہ یعنی گجرات، راجستھان اور ان کے گرد ونواح کا علاقہ بتایا ہے۔ جو کسی صورت میں بھی صحیح نہیں ہے۔ ایک اور ماہر لسانیات مسٹر بین نے پہاڑی زبان کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے (الف) مشرقی پہاڑی، جس کا علاقہ نیپال اور گورکھپور بتایا ہے (ب) مرکزی پہاڑی، جس کا علاقہ گھڑوال اور ڈیرہ دُون بتایا ہے اور (ج) مغربی پہاڑی، جس کا تعلق ہماری زیر بحث پہاڑی سے ہے۔ اس تقسیم کے مطابق مشرقی پہاڑی سے مراد موجودہ نیپالی زبان ہے، مرکزی پہاڑی سے مراد گھڑوالی اور کمایونی ہے جو اُتر پردیش کے پہاڑی خطوں میں بولی جاتی ہے۔ جب کہ پہاڑی زبان کی نہایت اہم اور واضح شکل مغربی پہاڑی ہے، جو ہماچل پردیش، کے مغربی حصوں کُلّو، کانگڑہ، چمبا اور ریاست جموں وکشمیر کے اضلاع کٹھوعہ، جموں، اُودھم پور، ڈوڈہ، راجوری، میر پور، پُونچھ، مظفر آباد، بارہمولہ، سرینگر اور اننت ناگ میں بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کوہ مری، وادئ کاغان، ہزارہ اور دریائے سندھ کے مشرقی کناروں پر بھی یہ زبان کثرت سے بولی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی

دریائے سندھ کے مغربی علاقے پشار، ڈیرہ غازی خان اور بنّو میں بھی پہاڑی زبان بولی جاتی ہے، جہاں اس کو ''ڈیروی'' کہا جاتا ہے۔ ''ہنکو'' ہو یا ''ہندکو'' اور ''پٹھواری'' یا ''ڈیروی'' یہ سب پہاڑی کے روپ ہیں۔ پہاڑی کوئی نئی نہیں بکہ صدیوں پُرانی زبان ہے۔ جس نے آریوں کی آمد اور پہاڑوں میں آباد ہونے سے لے کر آج تک مختلف ارتقائی منزلیں طے کیں۔

ابتدا میں یہ زبان'' پہاڑی بولیوں'' کے نام سے موسوم ہوئی۔ ماہرین لسانیات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ پہاڑی بولیاں کھس پراکرت اور کھس اَپ بھرنش سے نکلی ہیں، ۔جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

پہاڑی

مشرقی پہاڑی ——— وسطی پہاڑی ——— مغربی پہاڑی

وسطی پہاڑی

کمایونی ——— گھڑوالی

مغربی پہاڑی

چمبالی ——— جونساری ——— سرموری ——— منڈیالی

ان کے علاوہ مغربی پہاڑی کی سترہ بولیاں اور بھی ہیں۔جن کا تعلق پہاڑوں اور ڈھلوانوں میں بسنے والوں سے ہے۔اس میں شک نہیں کہ ان کے لب ولہجہ اور لپی میں فرق ہے، لیکن ان سب کا تعلق پہاڑی زبان سے ہے۔

پہاڑی ریاست جموں وکشمیر میں

ریاست جموں وکشمیر پہاڑی زبان بولنے والے حسبِ ذیل علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔وادی کشن گنگا(نیلم)اور گُریز کی وادی سے لے کر علاقہ پھولی والی،جانوالی،مچھل،کیل،شاردا جی،کھری گام،چانگن،دواریاں،اور دریائے کشن گنگا کے دونوں طرف پھیلی ہوئی وادیاں،سُرگن، جمعہ گنڈ،دودنیال،لوات،نگدر،کیرن،کٹھ میدان،نالۂ جاگیراں میں کائیاں شریف،کوٹن،گنڈی شاہی،آٹھ مقام اور لیواہ وغیرہ۔وادی کرناہ میں ٹیٹوال،نالۂ لُب گراں کے علاقے ٹنگڈار،لیپاوادی،دریائے جہلم کے کناروں اور ضلع مظفر آباد کا علاقہ لچھراٹ،نوشہرہ،نوسہری،بھٹکہ،علاقہ کوٹلی،کوہالہ،ڈنہ،چکار،نالہ بونیار،پہلی پورہ،وادی چناب کے علاقے رام بن،بانہال،ڈوڈہ،بھدرواہ،کشتواڑ،چھاترو،پاڈر،وادی مڑواہ،ضلع اُودھم پور کے علاقے چینی،ڈوڈہ وبسنت گڑھ،بلاور،اور ریاسی میں ضلع کٹھوعہ اور ضلع جموں میں ڈوگری کے ساتھ پہاڑی بھی بولی جاتی ہے۔ضلع راجوری،میرپور،مظفر آباد،اور پُونچھ میں پہاڑی زبان بولنے والوں کی کثیر تعداد آباد ہے۔صوبہ کشمیر میں ضلع بارہمولہ،سرینگر،اننت ناگ اور پلوامہ میں پہاڑی زبان بولی جاتی ہے،مختصر یہ کہ ریاست کا کوئی کونہ ایسا نہیں جہاں پہاڑی زبان بولی اور سمجھی نہ جاتی ہو۔

پہاڑی اور ضلع پونچھ

تاریخ شاہد ہے کہ آریا ہندوکش کے راستے سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔اُن کے یہاں آباد ہونے کے بعد ایک نیا دور شروع ہوا۔آریا جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو یہاں ان کا سامنا دراوڑ قوم سے ہوا۔جو ایک مہذب قوم تھی،مگر ان کے مقابلے میں آریوں میں جنگی مہارت کہیں زیادہ تھی۔اس وجہ سے آریوں نے دروروں کو شکست دی اور ان کی کثیر تعداد نے دکن میں پناہ لی۔آریا گروہ در گروہ ہندوستان میں آتے رہے اور ہندوستان شمالی پہاڑی علاقوں اور مغربی علاقوں میں آباد ہوتے گئے۔اس طرح ایک نئی زبان کے لئے میدان ہموار ہوگیا۔ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں آباد ہونے والے پہاڑی قبیلوں نے ایک نئی زبان کو جنم دیا۔جو آگے چل کر ہنکو،ہندکو،پٹھواری،ڈیروی اور پہاڑی کہلائی۔ڈاکٹر گریرسن اور ڈاکٹر قادری زور نے پہاڑی کو پہاڑوں میں بسنے والے کھاشہ قبیلوں کی زبان قرار دیا ہے۔جو ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے تھے۔

تاریخ کی اوراق گردانی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وادیٔ کشمیر کے معرض وجود میں آنے سے پہلے بھی وادی کے آس پاس کے پہاڑوں اور دُور دراز کونوں میں انسانی آبادی موجود تھی۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُن انسانی بستیوں میں راجوری، پُونچھ اور کرناہ وغیرہ کی بستیاں بھی شامل تھیں، جن کا ذکر ہمیں صرف کشمیر کی پرانی تاریخ ''راج ترنگنی'' ہی میں نہیں بلکہ اُن سے بھی پرانی کتابوں یعنی پرانوں میں بھی ملتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ پُونچھ بھی قدیم زمانے سے آباد ہے۔

ریاست پُونچھ میں پہاڑی زبان کب سے بولی جانے لگی اور یہ کتنی پُرانی ہے۔ یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے لیکن اس زبان کا ایک سرا آریوں کی آمد کے بعد پہاڑوں میں بسنے والے کھاشہ قبیلوں کی زبان کھس پراکرت اور اَپ بھرنش سے جا ملتا ہے اور دوسرا سرا مہاراجہ اشوک کی پراکرت پالی سے۔ اشوک نے جب بدھ دھرم اختیار کیا تو اُس نے بدھ مت کے پرچار کے لئے پالی پراکرات کا استعمال کیا۔ پالی کے علاوہ مہاراجہ اشوک کے زمانے میں سارے پہاڑی خطے میں پہاڑی زبان رائج ہو چکی تھی۔ پہاڑی کے علمی اور ادبی ہونے کا ثبوت ہمارے پاس شاردا پیٹھ کا قیام ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مہاراجہ اشوک بدھ مت پھیلانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ شاردا پیٹھ میں اُس وقت کے مشہور عالم اشوگوش اور ناگ ارجن بدھ مت کی تعلیم دینے پر معمور تھے۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت کی ضروریات کے مطابق پہاڑی زبان کا ایک اپنا رسم الخط تھا۔ بدھ مت اس پہاڑی خطے کا ایک حصہ پونچھ بھی تھا۔ آج بھی یہاں بُدھ مت کے اثرات پہاڑی ثقافت میں نمایاں ہیں۔ چونکہ شاردا پیٹھ دریائے کشن گنگا اور دریائے مدھومتی کے جوڑ پر قائم کی گئی تھی۔ اس لئے وہاں سے پُونچھ میں آنا جانا ایک معمول تھا۔ اس لئے اس زمانے میں پہاڑی زبان ریاست پُونچھ میں بھی خوب پروان چڑھی۔ بے شک پہاڑی زبان کی لپی (رسم خط) الگ الگ تھی لیکن ذخیرۂ الفاظ مشترک تھا۔ اشوک نے پہاڑی زبان کی تحریر کے لئے شاردا لپی ایجاد کی جسے شیلا لیکھی بھی کہتے ہیں، مہاراجا اشوک کا زمانہ ۲۷۳ ق م سے ۲۳۲ ق م تک رہا۔ اُس نے اکتالیس سال حکومت کی۔ اشوک کے دورِ حکومت میں پونچھ میں پہاڑی زبان کو بہت بڑا فروغ ملا۔ اُس کے بعد بدھ مت کو پھیلانے میں کنشک نے بہت بڑا کام کیا۔ جس کے دورِ حکومت میں بھی دیگر علاقوں کے علاوہ پونچھ میں بھی پہاڑی زبان کو ترقی کرنے اور پروان چڑھنے کے مواقع ملے۔ کنشک کا عہدِ حکومت ۱۲۵ سے ۱۶۵ء تک چالیس سال رہا۔ کیونکہ اس زمانے میں کشمیر میں داخل ہونے کے راستے درہ حاجی پیر، توش میدان اور رتن شاہ سے براستہ پیر پنچال تھے، اس لئے ان گزرگاہوں کی وجہ سے علاقہ پونچھ میں پہاڑی زبان کو ترقی کرنے کے مواقع ملے۔

تاریخ کے مطابق پُونچھ میں پہاڑی ہندو راجاؤں کا عہدِ حکومت ۸۵۰ء سے ۱۴۵۲ء تک رہا۔ اس

وقت پونچھ کی راجدھانی لوئر کوٹ موجودہ لورن تھی۔ اُن پہاڑی راجاؤں کے عہدِ حکومت میں پہاڑی زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس دور میں بھی پہاڑی زبان علاقہ پونچھ میں خوب پھیلی اور ترقی کی راہ پر گامزن رہی۔

پُونچھ کا مقدر اس وقت مزید چمکا جب شہزادہ سلیم نے سراج الدین کو پونچھ پر حکومت کرنے کا پروانہ دے کر روانہ کیا۔ سراج الدین کہوٹہ کے راستے سے پُونچھ پہنچا۔ اس نے آتے ہی ۱۵۹۴ء میں لوئر کوٹ (لورن) سے دارالخلافہ منتقل کر کے شہر پونچھ کو اپنا دارالخلافہ بنا کر تقریباً پچاس سال پونچھ پر حکومت کی۔ اس طویل مدت میں پہاڑی زبان کو ترقی کرنے کے زیادہ مواقع ملے۔ مسلمان راجپوت راجاؤں کے عہدِ حکومت میں پونچھ میں پہاڑی زبان نے ناقابلِ فراموش ترقی کی۔

مسلمان دورِ حکومت میں ۱۵۹۴ء سے ۱۸۱۹ء تک پونچھ کا علاقہ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک مشرقی حصہ، جس پر پنج سراں کے جاگیرداروں کی حکومت تھی اور دوسرے پونچھ کا باقی ماندہ علاقہ، جس پر راٹھور راجپوت مسلمان حکومت کرتے تھے۔ لیکن ان دونوں حکومتوں کے دورِ حکومت میں پہاڑی زبان نے خوب ترقی کی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۸۱۹ء سے ۱۸۵۰ء تک پونچھ پر لاہور دربار کی حکومت رہی۔ جو مہاراجہ رنجیت سنگھ سے شروع ہو کر راجا دھیان سنگھ تک رہی۔ ۱۸۵۰ء میں پونچھ کا راج راجا موتی سنگھ کو ملا۔ جو ۱۹۴۷ء تک سرکاری زبان چاہے فارسی ہو اس کے ساتھ پنجابی اور ڈوگری کا چلن بھی رہا ہو۔ لیکن عوام کی زبان پہاڑی ہی رہی۔ لوگ پہاڑی زبان ہی میں شعروشاعری کرتے رہے۔ اس طرح پہاڑی زبان ترقی کی منزلیں برابر طے کرتی رہی۔

ہندوستان انگریزوں کی غلامی سی بے شمار قربانیوں کے بعد ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا۔ لیکن جاتے وقت بدبخت انگریز جہاں ہمارے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر گیا۔ بدقسمتی سے ہماری ریاست پونچھ بھی سیاسی لکیر سے دو حصوں میں بٹ گئی۔ تحصیل باغ اور تحصیل سدھنوتی پوری، تحصیل حویلی آدھی اور تحصیل مہنڈر کا تھوڑا سا حصہ، اور تھکیالہ پرواہ پرگنہ پورا پاکستان کے کنٹرول میں چلا گیا۔ ہمارے پاس صرف ڈیڑھ تحصیل باقی رہی۔ یہ سیاسی لکیر علاقے کو تو دو حصوں میں تقسیم کر گئی۔ لیکن پہاڑی زبان کو تقسیم نہیں کر سکی۔ پاکستان کے کنٹرول والے علاقے میں بھی پہاڑی زبان کی وہی اہمیت اور وہی چلن ہے جو ہمارے یہاں ہے۔ دونوں طرف پہاڑی زبان کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے لئے برابر کام ہو رہا ہے۔ شاعر اور ادیب اپنی محنت سے ادبی شہ پارے منظرِ عام پر لا رہے ہیں۔

ریاست پونچھ کی تقسیم کے بعد اب پونچھ سکڑ کر ایک ضلع رہ گیا ہے۔ جس کی صرف چار مختصر تحصیلیں مہنڈر، سرنکوٹ، حویلی اور منڈی ہیں۔ جو ایک سو چوہتر گانو پر مشتمل ہیں۔ پیر پنجال کے دامن میں پوشانہ سے لے کر بلنوئی اور سلوتری تک اور گگڑیاں سے لے کر بھروتی اور بنجنی تک پونچھ ضلع کا کوئی گانو ایسا نہیں جس میں پہاڑی

زبان بولی اور سمجھی نہ جاتی ہو۔ حالیہ مردم شماری کے مطابق ضلع پونچھ کی اٹھاون فیصد آبادی پہاڑی زبان بولتی ہے۔ عوام میں رابطے کی زبان بھی پہاڑی ہے اور اکثریت کی مادری زبان بھی پہاڑی ہے۔ پہاڑی ضلع پونچھ کی پہچان ہے۔

ضلع پونچھ میں تھکیال، ڈومال، فیروزال، جرال، بھگیال، منگرال، ناگرتھال، چب، چاڑک، گکھڑ، اعوان، بیگ، منہاس اور جنجوعہ وغیرہ راجپوت ذاتوں کی مادری زبان پہاڑی ہے۔ جب کہ سید، قریشی، مغل، سدھن، پٹھان، شیخ، دت، وید، سوری، کپور، پوری، چڈا، آنند، پھول، بالی، چھبیر، کیسر، شرما، کھجوریہ وغیرہ قومیں بھی پہاڑی بولتی ہیں۔ ان کے علاوہ لون، ڈار، وانی، میر، خواجہ، دیوان، ماگرے، تانترے، چک، گنائی، راتھر، بانڈے، نائیک، رینا، مصری، بٹ، کار، کول در اور زُتشی وغیرہ کشمیر ذاتیں بھی کشمیر زبان کے ساتھ ساتھ پہاڑی زبان بھی بولتی اور سمجھتی ہیں۔ ان کے علاوہ گوجر قوم کی کثیر تعداد پہاڑی سمجھتی اور بولتی ہے۔

پہاڑی زبان ضلع پونچھ میں رہنے والوں کی مشترکہ میراث ہے اور بلا امتیاز مذہب وملت اہل پونچھ کو پہاڑی زبان بولنے پر ناز ہے۔ ضلع پونچھ میں اب پہاڑی زبان وادب کی ترقی کے لئے انجمنیں قائم ہیں۔ جو پہاڑی زبان کو فروغ دینے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں۔ ضلع پونچھ میں مقالے، انشائیے، ڈرامے اور شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ یہ بات یقین اور اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ ضلع پونچھ میں پہاڑی زبان کا مستقبل روشن ہے۔

سیاسی اعتبار سے پہاڑی عوام کی فلاح اور پہاڑی زبان کی ترویج واشاعت کے لئے سرگرم عمل افراد اب ریاست جموں وکشمیر کی قانون ساز اسمبلی تک رسائی حاصل کر چکے ہیں اور روز افزوں اس کاز کے لئے مسلسل متحرک ہیں۔ ان میں جناب سید مشتاق احمد شاہ بخاری (ایم ایل اے سرنکوٹ) اور جناب غلام محمد جان (ایم ایل اے حویلی) قابل ذکر ہیں۔ ان سے قبل رفیق حسین خان اور نثار احمد خان صاحب (سابقہ ممبران اسمبلی) اس کے لئے تگ ودو کر چکے ہیں۔

☆☆☆

پُونچھ میں گوجر قبائل

محمد ایوب شبنم

گوجر کون ہیں، کیا ہیں؟ سابقہ ریاست پونچھ میں کب اور کہاں سے آئے ہیں یہ جاننے کے لئے آیئے ذرا تاریخ کی ورق گردانی کی جائے............ تاریخ دان وی اے سمتھ ۴۲۸ء میں گوجر قوم سے متعلق کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں میں لفظ حزر اور جیٹو پر بحث کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی کھوج سر پیر کے بغیر ہے۔

کرنل ٹاڈ ایک اور تاریخ دان اپنی پیش کش میں گوجر قبائل کو یونانی قرار دے کر اپنی کم علمی کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں، لگتا ہے کہ بجائے ٹھوس بنیادوں پر تحقیق کرنے کے انہوں نے قیاس سے کام لیا ہے۔ جبکہ گوجر قبائل کا یونان سے کوئی لینا دینا نہیں۔

گوجر قبائل جارجیائی ہیں یا گرجستان سے آئے ہیں اس دعویٰ کو بھی بہت سارے مورخین نے بے بنیاد قرار دیا ہے، کچھ کا کہنا ہے کہ گوجر اور ہن قوم ایک ہی ہے اور ان کی اولادوں کو راجپوت اور جاٹ قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ عظیم جنگ مہابھارت میں ہن قوم کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ گوجر اور ہن بھارت کی ہی قدیم ترین نسلوں میں سے ہیں اور یہ قوم اکثر زمانوں اور اکثر بھارتی علاقوں پر حکومت یا اپنی موجودگی ظاہر کرتی نظر آتی ہے۔

''گوجر اتہاس'' کے مورخ کا استدلال ہے کہ کشان گوجر تھے اور ہن ان کی ہی شاخ تھی۔ اگر چہ ہون بدھ مذہب کے پیروکار تھے مگر اس زمانہ میں کشان اور تمام گوجر ویدک مذہب کے ماننے والے تھے اور کھشتری گوجر کہلاتے تھے۔

حافظ عبدالحق تاریخ گوجراں میں فرماتے ہیں کہ ''شجروں اور تواریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گوجر قبائل

بیرون ملک سے نہیں آئے بلکہ ہندوستان کی ہی قدیم نسلوں میں سے ہیں''۔

مشہورِ زمانہ راجہ دشترتھ یا ان کے بیٹے مہاراج رام چندر جو ہندو قوم کے لئے پوجنیے بھی ہیں، سورج ونشی گوجر تھے اور ان کے زمانے کے پانچ ہزار برس بعد کرشن جی مہاراج یادو ونشی تھے اور ان دونوں ونشوں کا گوجر قبائل سے ہونا سچائی کے قریب تر نظر آتا ہے۔اور خود ہندوؤں کے مقدس پران یہ گواہی دے رہے ہیں کہ کرشن جی مہاراج گوجر تھے اور گوجر ایک قوم ہے۔

''جنرل کوننگ گام'' جو قوموں کی تواریخ پر گہری نظر رکھنے والوں میں کافی مشہور ہیں تحریر کرتے ہیں کہ گوجر قبائل کا تعلق گرز بردار قبیلہ سے ہے جو مشہور جنگجو قبیلہ رہا ہے۔اور لفظ گُرز کی وجہ سے ہی یہ نام گوجر سے موسوم ہو گیا تھا۔گوجر، گُجر، گورجر، گرجارا، گجراتر، گوچر، گرجا اور گُور یہ سب الفاظ گوجر قبائل سے ہی منسوب ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔جبکہ خزرا اور جذر الفاظ کی سچائی سے متعلق تواریخ میں شہادتوں کا فقدان نظر آتا ہے۔

تاریخ کی روشنی میں یہ قبائل یا قوم درۂ خیبر سے لیکر سوات، لاہور، اجمیر، گجرات، کاٹھیاواڑ، قابل بونیار، قنوج، آسام، چین اور کشمیر وغیرہ تک پھیلی نظر آتی ہے ۵۰۰ء سے لیکن ۱۳۰۰ء تک یہ قبائل بھارت پر حکمرانی کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن مورخین نہ تو اس قوم یا قبائل کے وردو ہند یا وردو کشمیر کا کوئی زمانہ تعین کر سکے ہیں اور نہ ہی ان کے اصل کے متعلق دعویٰ سے کسی فیصلے پر پہنچ سکے ہیں۔

مولانا عبد المالک بہاولپوری ''تاریخ شاہان گجر'' جو بہت ساری تواریخ کا نچوڑ ہے میں گجروں کے وردوِ ہند اور ان کے اصل وطن پر کسی حد تک روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بجیر یہ خزر جس کو غلط العام بحر خزر بھی لکھتے ہیں کیونکہ عربوں نے گوجر قوم کو ہمیشہ خزر لکھا ہے اور یہ مان لیا ہے کہ یہ قوم وسط ایشیا کے خانہ بدوش ترکی خاندان جو دوسری صدی عیسوی میں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے تھے اور ان میں سے ''یو چی'' قبیلہ جو شکست کے بعد وادی سیحون کی طرف نکل جاتا ہے اور وہاں دوبارہ طاقت پکڑ کر ایک مضبوط حکومت قائم کر لیتا ہے۔اس حوالے سے کچھ مورخین کا خیال ہے کہ گجر ستھیا یا سیتھن نسل سے ہیں، ۲۴۲ء تا ۵۰۰ء قبل مسیح بدھ مذہب کے عروج و زوال کے زمانے میں سیتھن قوم افغانستان کو روندتی ہوئی دیولان اور کوہِ سلیمان سے گزر کر ہندوستان میں داخل ہو گئی تھی اور چونکہ براہمن مذہب تلوار زنی اور گوشت خوری کی اجازت دیتا تھا گوجروں میں (سیتھن نسل) نے بُدھ مذہب کے بجائے براہمن مذہب کو ہی اختیار کر لیا۔تلوار باز لوگ کھشتری کہلانے لگے، تجارت پیشہ ولیش جبکہ کچھ قبائل مسلسل گجر ہی کہلاتے رہے۔پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی تک گجرات، کاٹھیاواڑ اور جنوبی ہند کے دیگر علاقے میں گجر حکمرانی کرتے رہے، جنوبی ہند کے خاندان چوڑا، ڈلبھی بھی گجر حکمران تھے۔اور اسی طرح کشمیر

کے علاوہ ریاست پونچھ میں بھی سانگو گوجر قوم حکمران رہی۔

پونچھ میں گوجر قوم یا قبائل کا دور

پونچھ کی گوجر قوم کے متعلق کوئی واضح تاریخی دستاویز سامنے نہیں آئی اور اگر کسی نے کوشش کی بھی ہوگی تو وہ ماضی کے دھندلکوں میں گم ہوگئی لہذا اب صرف کسی حد تک قیاس کے حوالے سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پونچھ میں گوجروں کا ورود کب اور کیسے ہوا۔ اور اُن کی کیا کارکردگی رہی؟

تاریخ کے کچھ صفحات ظاہر کررہے ہیں کہ پنجاب کے گردونواح علاقوں میں سے پونچھ ہی گوجروں کا مشہور مرکز تھا........... اور یہ اُس وقت کی بات ہے جب پونچھ پونچھ نہیں تھا اور نہ ہی رستم نگر بلکہ پرنس کہلاتا تھا اور اس کا دارالخلافہ لوہرکوٹ یا لوہرین تھا جو موجودہ زمانے میں لورن کہلاتا ہے۔ مشہور مورخ البیرونی، مصنف تاریخ فرشتہ اور دیگر مورخین لکھتے ہیں کہ محمود غزنوی نے کشمیر پر حملہ آور ہونے سے پہلے ہی لوہرکوٹ میں شکست کھائی۔ محمود غزنوی کے کشمیر پر حملہ کرنے کی غرض سے لوہرکوٹ میں ہی شکست کھائی جس کی وجہ یہاں کا مضبوط قلعہ اور اسی تندمزاج، جنگجو اور بہادر قوم کی کارکردگی تھی، مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بھی ابتداء میں جب پونچھ کو ۱۸۱۳ء میں تاراج کرنے کی کوشش کی تو وزیر روح اللہ خان جو اس وقت کا باصلاحیت اور طاقتور حکمران تھا نے رنجیت سنگھ کی افواج کا حملہ پسپا کردیا اور مجبوراً اس کو ۱۸۱۲ء میں ۳۰ جولائی کو محاصرہ چھوڑنا پڑا۔

تاریخ شاہان گجر، تاریخ فرشتہ اور تاریخ گوجر، گوجری زبان وادب میں درج ہے کہ کشمیر کے راجہ بہادر خان کو ایک سازش کے تحت جب زہر دیکر مار دیا گیا تو اس کے وزیر روح اللہ خان نے میدان صاف دیکھ کر اپنے بیٹے امیر خان کو پونچھ کے تخت پر بٹھا دیا اور خود وزیر بن کر حکومت کرنے لگا اس طرح پہلی بار پونچھ میں گجروں کی حکومت قائم ہوئی۔

مصنف تاریخ شاہان گُجر رقم طراز ہے کہ گوجر قوم کی بہت سی اقسام کی ذاتیں اور گوتیں ہیں اُن میں سے سانگو قبیلہ مشہور ہے جس کا نامور حکمران روح اللہ سانگو تھا جو ۱۷۹۷ء سے ۱۸۱۹ء تک حکومت کرنے کے بعد فوت ہوگیا۔ اُسی دور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دھوکہ بازی کے ذریعے مہاراجہ گلاب سنگھ کو پونچھ پر حملہ کرنے کو کہا جس نے حملہ کرکے پونچھ کو فتح کرلیا اور روح اللہ کے پوتے میر باز خان کو ساتھ لے کر لاہور چلا گیا جہاں میر باز کا قتل ہوگیا اور اس طرح سانگو خاندان کا شاندار زمانہ ختم ہوگیا۔ آج بھی اس خاندان کی نسل کھنیتر لسانہ اور کلائی وغیرہ میں آباد ہے۔

سابقہ ریاست پونچھ کی چار تحصیلوں، حویلی، مہنڈر، باغ، سدھنتی علاوہ ازیں تھکیالہ پڑواہ اور کرلوپ

کے پرگنوں میں سے تحصیلات حویلی اور مہنڈر میں گوجر قوم کثیر تعداد میں تھی اور آج بھی ہے۔ اس قوم کی کئی گوتوں کے نام پر ابھی تک گاؤں آباد ہیں مثلاً بانڈی چیچیاں، ڈنہ دھکڑاں، ڈنہ ڈوئیاں، موہری میلواں، گورسائی گورسیاں پھامڑاہ ناڑ وغیرہ۔

یہ قوم صدیوں سے زراعت پیشہ ہے۔ مال مویشی پالنا ان کی ضرورت کے علاوہ شوق بھی ہے یہ قوم تعلیم کی طرف دھیان نہیں دے سکی لیکن اب تعلیم کی طرف ان کا میلان بڑھتا چلا جارہا ہے یہ قوم زیادہ تر امن پسند، سادہ لوح، صابر اور قانع ہے یہی وجہ ہے کہ گوجروں کے اندار بڑے اولیاء اور فقیر پیدا ہوتے ہیں کیونکہ غیر متکبر اور سادگی پسند لوگ ہی خدا کے نزدیک ہوتے ہیں، مالی طور پر بھی یہ قوم دوسری اقوام کی نسبت مویشی وغیرہ کی وجہ سے مالدار ہوتی ہے، مرکزی وریاستی سرکاروں نے اب ان کو شیڈیول ٹرائب کا درجہ دے کر ان کے معیارِ زندگی کو سدھارنے کے لئے کافی تگ ودو شروع کردی ہے۔

پونچھ میں گوجروں کی مشہور گوتیں یا قومیں

کوہلی یا کولی: تاریخی پس منظر میں اس قوم کے مورث اعلیٰ کا نام راجہ کوہل بتایا جاتا ہے۔ یہ سورج ونشی خاندان سے تعلق رکھتے تھے یا ہیں اکبر اعظم کے زمانے میں گوجر کوہلی صوبۂ گجرات صوبہ یا دکن کے بہترین سپاہی مانتے جاتے تھے اور وہ اکثر اکبر کے فوجی قلعہ جات کے محافظ بنائے جاتے تھے۔ پونچھ میں گوجر کوہلی مواضبات، کنوئیاں، کلائی، لسانہ، چنڈک، دندی دھڑا، موہڑہ بچھائی، سمہوٹ، کلر کٹل، کھڑی کڑمڑا، کھیتاں، در آبہ، سمڑی خواجہ، سیالاں، ہاڑی بڈھا، گونتھل، سنگلانی، مڑہوٹ وغیرہ میں آباد ہیں۔

تکشک، تاس یا تاک: تاریخ شاہان گجر میں اس گوت کا تفصیل سے ذکر موجود ہے۔ سابقہ جموں یا حالیہ جموں میں گوجروں کی یہ گوت موجود ہے ۱۳۱۱ء میں اس گوت کا ایک ہندو راجہ مسلمان ہوگیا تھا، اس گوت کی حکومت گجرات میں رہی، پونچھ میں جو گجر تاس موجود ہیں وہ دراصل تانک یا تاک لفظ سے ہی یاد کئے جاتے ہیں، اس گوت کے لوگ ٹوپی، بنلیاز، پھاگلہ، ڈھینگلا پونچھ میں آباد ہیں۔

کھٹانہ گوجر: گجرات پنجاب کے بندوبست ۶۵-۱۸۵۲ء نے اس گوت کو کھٹانہ گجر لکھا ہے، راویان نے اس خاندان کو راجہ جے پال اور پانڈوں کے سلسلہ نسب سے منسلک ظاہر کیا ہے گوجروں کا کہنا ہے کہ اس گوت کے بزرگوں نے حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری لاہوری کے ہاتھ پر بیعت لے کر اسلام مذہب

اختیار کیا تھا، کھٹانہ گوجر اپنے آپ کو پنوار راجپوت بھی بتاتے ہیں۔ پونچھ میں کھٹانہ گوجروں کی آبادی مواضیات، کنوئیاں، چنڈک، چک کترو، ٹھیرا ٹوپہ، کلر موہڑہ، کلر کلل، مڑہوٹ، دندی دھڑا، لسانہ، سنئی، بچیانوالی، شیندرہ، بھینچھ، کلائی ڈوڈی وغیرہ میں آباد ہے۔ گوجروں کی دیگر گوتیں چیچی، ٹھیکریہ، گورسی، کالس، بجاڑ، بکہن سب کھٹانہ قوم کی ہی شاخیں مانی جاتی ہیں۔

دیدڑ گوجر: پونچھی دیدڑ گوجر اپنی گوت کی جو وجہ تسمیہ بیان کرتے ہیں وہ بعید از قیاس ہے۔ البتہ مصنف تاریخ شاہان گجر نے اس وجہ تسمیہ کو درست قرار دیا ہے۔ اس گوت کا وارث راجہ دیدڑ کی اولاد تھا۔ کھاری گجر، بیسی (مہیسی) گوتیں دیدڑ گوجر کی گوت سے ہی وجود میں آئی ہیں۔ یہ گوت تحصیل سدھنتی، حویلی، مہنڈر میں پائی جاتی ہے۔ گونتھل، مڑہوٹ، مڑاہ، دھڑا فتح پور وغیرہ ان کے مشہور گاؤں ہیں۔

چیچی گوجر: اس خاندان کے کسی جدِ امجد کا نام چیچی تھا جس کی وجہ سے یہ چیچی کہلانے لگے۔ یہ سورج ونشی خاندانوں سے ہیں، چوہدری محمد حسین بی اے تاریخ گجراں میں لکھتے ہیں کہ چوہانوں کے چھوٹے سے قبیلے کا نام چیچی تھا اور اسی سے یہ گوت چیچی کہلانے لگی۔ راجوری کے مولوی مہر دین قمر فرماتے ہیں کہ چیچی گوجر مہارانہ لکھن رائے کی اولاد سے ہیں جو اُمیچ میں ساحل سمندر پر واقع ہے۔ حکومت کرتے تھے لہٰذا اسی اُمیچ سے وہ چیچی مشہور ہوئے۔

بھٹی گوجر: یہ راجپوت گوت بھی ہے اور گجر بھی۔ یہ قوم، کنوئیاں، بھینچ، کھیتر، کلر کلل، پوٹھہ، سانگلہ، مڑہوٹ، کولیاں، بچیانوالی، درآبہ، سہڑی خواجہ، کلائی، شاہ پور وغیرہ میں بس رہی ہے۔

پسوال گوجر: ضلع گجرات میں یہ اپنی گوت پسوہل بتاتے ہیں، وہ اپنے آپ کو عربی النسل کہتے ہیں، اس گوت کے لوگ آج بھی دھڑہ موہڑہ، فتح پور، کھیتر، شاہ پور، کلر کلل، دہڑہ سمہوٹ، فضل آباد، سمہوٹ، سنئی، سیالاں، سانگلہ، دندی دھڑا وغیرہ میں بس رہے ہیں۔

بھُملا یا بھوملہ گجر: ضلع گجرات پنجاب کے کچھ لوگ اپنے آپ کو راجہ جگدیو کی نسل سے منسلک بتاتے ہیں جو بعد ازاں مسلم مذہب میں داخل ہوگئے، پونچھ میں ان کو آج بھی بھملہ ہی کہتے ہیں۔ اس گوت کی نسل، شاہ پور، نوناں بانڈی، بانڈی چیچیاں، ہاڑی بڈھا، درہ سانگلہ میں آباد ہے۔

گورسی گجر: اس گوت کا مورثِ اعلیٰ بھی کھٹانہ تھا، یہ لوگ محمود غزنوی کے دور میں مسلمان ہوئے یہ لوگ گورسائی، سنئی، موہڑہ بچھائی، ہاڑی، دھڑہ موہڑہ، ترانوالی، پھاگلہ، سنئی، مڑاہ، گونتھل وغیرہ میں بس رہے ہیں۔ اس قوم کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ بابا نندمہر کی اولاد سے ہیں، جن کا بڑا بیٹا جمنا کے کنارے گائیں چراتا تھا، لہٰذا اس کا نام گئیو جی پڑ گیا اور پھر گئیو جی سے گورسی میں تبدیل ہوگیا۔

کالس گوجر: اس قوم کا مورثِ اعلیٰ کھٹانہ یا کٹانہ تھا کیونکہ یہ کھٹانہ گوجروں کی ہی ایک شاخ ہے اس قوم کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ پنجاب کے راجہ جے پال کی اولاد سے ہیں۔
گوجروں کی یہ گوت سنگھوٹ، سرنکوٹ، لسانہ، نیڑیاں، گورسائی، گونتھل کھنیتر اور بھینیچھ میں آباد ہے۔

بجاڑ گوجر: ضلع گجرات میں بجاڑ نام کا ایک گاؤں آباد ہوا تھا جس کی وجہ سے اس گوت کا نام بجاڑ پڑ گیا ان کا مورثِ اعلیٰ بھی کٹانہ یا کھٹانہ تھا اور یہ بھی راجہ جے پال کی اولاد بتائی جاتی ہے۔ اس گوت کے لوگ، دھڑہ موہڑہ، موہڑہ بچھائی، سمہوٹ، جنڑانوالی، سرنکوٹ، بچیانوالی، ہاڑی، کالا بن، اڑی، چھترال، کلائی، منگناڑ، وغیرہ میں آباد ہیں۔

جاگل یا جنگل: ضلع ہزارہ میں ایک گاؤں کا نام جاگل ہے۔ ممکنات میں سے ہے کہ یہ قوم وہاں سے آ کر پونچھ میں آباد ہوئی ہو۔ ہاڑی بڈھا میں یہ قوم جنگل کہلاتی ہے۔ جبکہ پھامڑاہ ناڑ مہنڈر میں جاگل کے نام سے مشہور ہے۔ کلر موہڑہ، جنڑانولی، گورسائی، پراٹ، نکہ منجیاڑی شاہ پور حویلی اور قصبہ میں بھی جاگل لوگ کافی تعداد میں بس رہے ہیں۔

بڈھانہ گوجر: تاریخ گوجراں میں بڈھانہ کے بجائے بھٹانہ درج ہے پونچھ میں اس قوم کو بڈھانہ ہی کہتے ہیں، بن پت میں تقریباً سارا گاؤں بڈھانہ گوت کا ہے، علاوہ ازیں یہ لوگ سنئی اور پٹھانہ تیر اور کالا بن میں آباد ہیں۔

کسانہ گجر: ہن اور کشان گجروں کی دو مشہور قومیں ہیں، کسانہ کشن خاندان کا ہی بگڑا ہوا نام معلوم ہوتا ہے۔ یہ قوم دوسری صدی عیسوی میں ہندوستان میں داخل ہوئی۔ پونچھ میں کسانہ گجر موضع بھینیچھ، مڑاہ، مڑہوٹ، کھیتاں، درآبہ، درہ ڈلیاں، کھنیتر، کلائی، موہڑہ بچھائی، فضل آباد مڑاہ میں آباد ہیں۔

بھروال گجر: یہ لوگ بھی سورج ونشی کہلاتے ہیں ان میں سے کسی شخص نے جب مذہب اسلام اختیار کیا تو ان کو باہروالا سمجھا جانے لگا اور اس باہروالا سے بھروال کہا جانے لگا اس گوت کے لوگ سمہوٹ گاؤں میں موجود ہیں۔

لوریا یا لوہر گجر: کھاروا اور لور گجروں کو بھاٹ اور میراثی بتایا جاتا ہے، تاریخ گوجراں میں لور کو لوہرا اور لاوا بھی کہا گیا ہے۔ چادھری، کسیرا، کمہار، میروی، سراندے، کپینی سب ان ہی گوجروں کی شاخیں ہیں پونچھ میں یہ قوم لوہر کہلاتی ہے منگناڑ میں رہتی ہے۔

کٹاریہ گوجر: کہتے ہیں کسی عورت نے اپنا تحفظ کٹار اوزار سے کیا تھا جس کی وجہ سے وہ کٹاری کہلائی اور بعد میں کٹاریہ کے نام سے قوم وجود میں آگئی۔ اس نسل کے لوگ، سانگلہ، سیالاں، مڑاہ، پھاگلہ، سرنکوٹ، جنڑانوالی، دھندک اور تڑانوالی کا تقریباً سارا گاؤں آباد ہے۔

آوانہ گوجر: یہ قوم حضرت اعوان کتب شاہ کی اولاد سے بتائی جاتی ہے اور شاید اسی وجہ سے ان کو آوانہ کہا جانے لگا اس گوت کا کہنا ہے کہ آوانہ یا اعوان ایک ہی نام ہے۔ چونکہ حضرت اعوان کتب شاہ شادی کر کے اس گوجر خاندان میں زم ہو گئے تھے لہذا ان کی ہی نسبت سے اعوان کہلانے لگے۔ اس گوت کے لوگ سنئی، کلر کٹل، کلائی، کلر موہڑا، کھنیتر میں بس رہے ہیں۔ گوجروں کی اور بھی بہت سی گوتیں ہیں جن کے اندراج سے مضمون طویل ہو جائے گا لہذا ان ہی مشہور گوتوں پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

گوجری زبان وادب

ہندوستان، کشمیر یا پونچھ میں داخل ہونے کے وقت گجر قوم گوجری زبان بولتی تھی یا نہیں ابھی تک تحقیق طلب ہے۔ کیا آریہ انڈک زبان بولتے تھے اور باقی زبانیں محض ہندوستانی تہذیب کے میل ملاپ سے وجود میں آگئیں جن کو پراکرت کا نام دیا جاتا ہے اور ان میں سے ایک شاخ اَپ بھرنش ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ گوجری زبان کا تعلق اسی اَپ بھرنش شاخ سے ہے جبکہ کچھ لوگ یہ بھی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ گوجر حکومتوں کے دور میں گوجری نے بہت ترقی کی سرکاری اور عام بول چال کی زبان بن گئی۔ اس دور کا گوجری ادب آج بھی کثیر تعداد میں ملتا ہے۔ گوجر حکومتوں اور گوجر اقوام کا زوال محمود غزنوی کے حملوں کے وقت سے شروع ہو گیا تھا۔ لیکن

چودہویں صدی عیسوی میں مغلوں کے حملوں کے وقت گوجر قوم اور گوجری زبان کا شیرازہ بری طرح بکھر گیا، گوجری زبان کے ادیب، شاعر ہجرت کر کے دکن کی طرف چلے گئے۔ جہاں پر وقت کے ساتھ ساتھ دکنی زبان بنی یا دکنی گوجری کی بنیاد پڑ گئی جو مدتوں گوجری کہلانے کے بعد ولی دکنی نے اپنے زورِ ادب سے اُردو کی جھولی میں ڈال دی۔ اس کے باوجود گوجری زبان پنجاب سے لیکر میوات، مدھیہ پردیش اور راجستھان کے علاقوں میں صدیوں تک بولی جاتی رہی، علاقائی لہجوں کی وجہ سے گوجری زبان میں سے بہت ساری بولیاں جنم لیتی رہیں۔ جیسے برج بھاشا، راجستھانی، کھڑی بولی، ہندوی، مغربی ہندی وغیرہ ان میں سے کچھ زبانوں کو سرکاری سرپرستی مل گئی جبکہ گوجری زبان کسمپرسی کا شکار ہوتی رہی۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں جن گوجری شعراء و ادباء کا کلام ملتا ہے۔ ان میں سے نون پونچھی، عبدل پونچھی، کافی مشہور ہیں، دوسرے قافلے میں شمس الدین مہجورؔ، حسن دین حسنؔ، خدا بخش زار، سائیں فقردین وغیرہ کا نام آتا ہے جبکہ نثر نگاری کی دنیا میں وزیر محمد ہکلہ مشہور تھے۔ نوجوان پیڑی میں محمد حسین سلیم، سکندر حیات طارق، نسیم پونچھی، جاوید راہیؔ، غلام سرور چوہان، ڈاکٹر محمد رفیق انجم، نور محمد نورؔ، شاہ نواز خان اور مہنڈر کالابن سے ہجرت کر کے راولاکوٹ مقبوضہ کشمیر میں جا بسے ایڈوکیٹ محمد شریف طارق شامل ہیں جن کا زورِ قلم جوانی پر ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ کیا کیا ادب پارے تخلیق کریں گے تاریخ ہی بتائے گی۔ کلچرل اکیڈمی جموں و کشمیر بھی گوجری زبان و ادب سے متعلق اپنی کوششوں کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اچھے اور کھرے ادب کو سنوارہ جائے اور سامنے لایا جائے۔ سیاسی میدان میں بھی گوجر قوم کے اندر نامور رہنما چوہدری محمد اسلم نے قانون ساز اسمبلی میں ایک لمبے عرصہ تک قوم کی قیادت کی ہے اور آئے دنوں بھارتی پارلیمان میں ممبر ہیں۔ تحصیل مہنڈر میں چودھری جاوید احمد رانا پچھلے پانچ سالوں سے ممبر اسمبلی ہیں جو گوجروں اور گوجری زبان کے لئے اچھا کام کر رہے ہیں۔ چوہدری لعل محمد صابر دوسری بار ریاتی اپر ہاؤس میں گوجروں کی نمائندگی کر رہے ہیں، حویلی پونچھ میں چوہدری محمد بشیر ناز اپر ہاؤس میں نمائندگی کر رہے ہیں۔ چوہدری مسعود احمد ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل پولیس جموں و کشمیر اس وقت بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے وائس چانسلر بھی ہیں ان کا ذکر نہ کیا جائے تو زیادتی ہوگی، کیونکہ وہ اس وقت گوجر قوم کے لئے سر سید احمد خان جیسی حیثیت رکھتے ہیں، آئے دن فوجر ٹرسٹ کے ذریعہ بھی وہ زبان و ادب اور گوجر قوم کے مسائل کے حل کے لئے زبردست جدوجہد کر رہے ہیں۔ چوہدری عبدالغنی ازہری جو گورسائی سے تعلق رکھتے ہیں اور 1980ء کے آس پاس عربی زبان کے کشمیر یونیورسٹی کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ رہے ہیں انہوں نے بھی اپنی قوم اور زبان و ادب کے لئے بہت کوششیں کی ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ آنے والا وقت اس قوم کو مزید عروج پر لے جائے گا۔ ☆☆☆

کشمیری زبان اور پُونچھ

تاریخ کے تناظر میں

خورشید کرمانی

کشمیری زبان کی اصل

بقول ایم این قریشی تاریخی اور نسلی تعلقات کے لحاظ سے دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کو آٹھ بڑے خاندانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جن میں سے ''ہند یورپی خاندان'' بھی ایک ہے جو نہایت وسیع ہے اور زمین کے نہایت اہم اور وسیع حصے پر پھیلا ہوا ہے۔ کشمیری زبان کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔
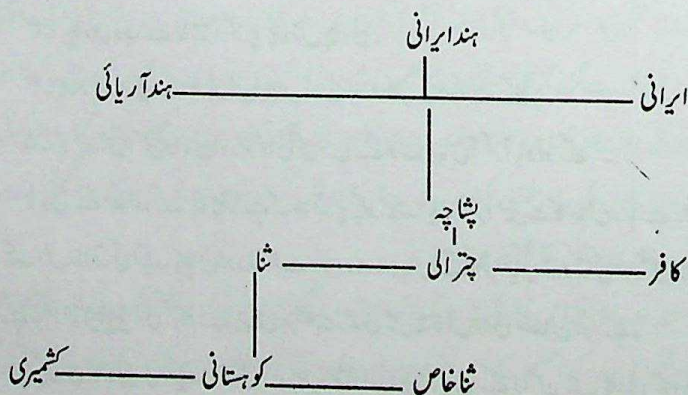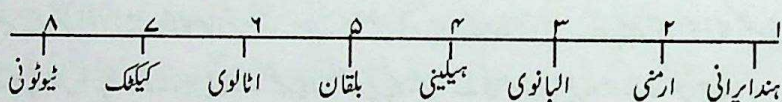
آریا کشمیر کے پہاڑی دروں سے یہاں وارد ہوئے۔اُن کی آمد سے پہلے کشمیر میں ناگا اور پشاچ قبائل آباد تھے۔جس کا ذکر ''نیل مت پوران'' میں ہے۔ان قبائل نے بڑی بہادری سے آریوں کا مقابلہ کیا۔لیکن آہستہ آہستہ آریوں کے قدم یہاں مضبوطی کے ساتھ جم گئے۔اصلی باشندوں میں کچھ تو مارے گئے اور جو باقی بچے وہ آریوں میں گھل مل کر ایک ہو گئے۔ناگا اور پشاچ قبائل جو زبان بولتے تھے وہ پشاچہ یا پشاچی زبان تھی۔جو تین حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ایک کافر، دو چترالی اور تین ثنا۔آگے بھی ثنا تین حصوں مین بٹ گئی۔ایک ثنا خاص، دو کوہستانی اور تین کشمیری، ماہرین لسانیات کے مطابق کشمیری ایک قدیم بولی ہے۔سنسکرت کی ہمعصر اور بہن ہے۔

تاریخ کے مطابق وادیٔ کشمیر کے معرض وجود میں آنے سے پہلے بھی وادی کے آس پاس پہاڑوں اور دور دراز کونوں میں ناگا اور پشاچ قبائل آباد تھے۔اُسی زمانے میں راجوری پونچھ اور کرناہ کی بستیاں بھی آباد ہوئیں۔

سلطان شہاب الدین 1337ء میں کشمیر کے تخت پر بیٹھا۔اس سے پہلے سارا کام سنسکرت میں ہوتا تھا لیکن اس نے 1338ء میں سنسکرت کی جگہ فارسی کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا۔زین العابدین 1423ء میں تخت نشین ہوا جو کشمیری زبان کا بہت بڑا عالم تھا۔ظاہر ہے اُس سے پہلے کشمیری زبان بہت ترقی کر چکی تھی۔بعض ماہرین کا خیال ہے کہ کشمیری زبان کا چلن ریاست پونچھ میں گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوا۔جب لوہر کوٹ اور کشمیر کے حکمرانوں میں جنگ کا محاذ گرم تھا۔جب کہ بعض ماہرین کے مطابق اس سے پہلے بھی اکا دُکا کشمیری بولنے والے پونچھ میں آچکے تھے۔ماہرین نے کشمیریوں کے پونچھ میں آنے کی حسبِ ذیل وجوہات لکھی ہیں۔

۱۔وادی کشمیر میں جنگ سے تنگ آکر پونچھ میں لوگوں نے پناہ لی۔

۲۔تلاش معاش میں لوگ کشمیر سے پونچھ آئے اور کچھ یہاں سے پنجاب گئے۔

۳۔بیگار کی وجہ سے عاجز آکر پونچھ میں پناہ لی۔

۴۔بھار برداری کے سلسلہ میں یہاں آئے اور ادھر کے ہو کر رہ گئے۔

۵۔پونچھ میں امن وامان اور خوشحالی تھی اس لئے لوگ یہاں آکر آباد ہو گئے''۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ علاقہ پونچھ ہمیشہ ایک منفرد حیثیت کا حامل رہا ہے۔قدیم دور سے لے کر آج تک اس علاقہ کی ایک پہچان اور شناخت رہی ہے۔یہاں کے جغرافیائی خدوخال اور طبعی حالات میں بھی انفرادیت ہے۔مگر 1947ء کی تقسیم سے یہاں ہر شعبۂ زندگی میں ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔

پونچھ پیر پنجال کی ایک برفانی و سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے دامن میں چھوٹی چھوٹی خوبصورت

وادیوں پر مشتمل علاقہ ہے۔ پونچھ مذہبی، لسانی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے ہمیشہ مشہور رہا ہے۔ یہاں مختلف مذہبوں، زبانوں، بولیوں اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے ہمیشہ ایک شاندار تہذیب وتمدن کو گلے سے لگا کر رکھا ہے۔ اس علاقے کے تقریباً ہر گاؤں میں مختلف زبان بولنے والے اور مختلف النسل لوگ بس رہے ہیں

پہاڑی اس علاقے کی رابطہ کی زبان ہے جس کو تقریباً اٹھاون فیصد سے زیادہ لوگ بولتے ہیں۔ دوسری بڑی زبان گوجری ہے اور تیسرا مقام کشمیری زبان بولنے والوں کا ہے۔ کشمیری زبان بولنے کا چلن آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے۔ اور بہت سے کشمیری خاندانوں نے مقامی اثرات خندہ پیشانی سے قبول کئے ہیں۔ اور مقامی بولیوں کے ریلے میں شامل ہوگئے ہیں۔ اس طرح کے بہت سے گاؤں اور محلے اب پہاڑی زبان بولتے ہوئے نظر آجاتے ہیں۔ جبکہ اُن کے آباواجداد کی زبان کشمیری تھی۔

کشمیری ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور صفت نسبتی ہے، کوئی قوم یا ذات نہ ہے لوگ علاقہ کشمیری میں رہتے تھے یا رہتے ہیں۔ چاہے وہ پہاڑی، گوجر یا راجپوت ہوں انہیں کشمیری ہی کہا گیا ہے۔ اس بات کی تائید ڈسٹرکٹ جج جہلم G.C Monggia کے عدالتی فیصلہ سے ہوتی ہے، فاضل جج لکھتے ہیں کہ لفظ کشمیری ایک جغرافیائی اصطلاح ہے کوئی ذات نہیں ہے۔ اس بات کی مزید تائید گلاسریز آف ٹیرٹریز کاسٹ فار پنجاب اینڈ نارتھ ویسٹ فرنٹیرز نامی کتاب کی جلد دوم سے بھی ہوتی ہے، سرجان مینورڈ کو بھی اس سے اتفاق ہے۔

ڈاکٹر بشیر احمد ماگرے کے ایک مضمون کے مطابق (مطبوعہ شمس بری شمارہ 2000ء مارچ 2001ء) کشمیریوں کی آمد پونچھ میں دوسو سے تین سو سال پہلے ہوئی تھی۔ درست نہیں ہے، راقم کی تحقیق کے مطابق یہ عرصہ پانچ سو سال سے زائد ہونا چاہیے کیونکہ اس کا اندازہ ذیل اقتباس سے ہوتا ہے۔

مغل بادشاہ اکبراعظم نے 1586ء میں کشمیر فتح کیا۔ کشمیر فتح ہونے کے بعد اکبراعظم نے براستہ نمک روڈ (مغل روڈ) کشمیر کا سفر کیا۔ اقبال نامہ اکبری میں اس سفر کی روداد درج ہے۔ جس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ ''بادشاہ راجوری سے گزر کر قاسم خان کے خیموں میں اترا جس کا کاروان راستوں کو صاف کرتا ہوا آگے چلتا تھا۔ یہاں سے کئی راستے تھے، ہر راستہ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ کار آگاہ اُن کو دیکھنے گئے انجمن رازگوئی جمع ہوئی تو طے پایا کہ درہ پیر پنجال کی راہ اختیار کی جائے۔ یہاں سے چل کر بادشاہ رتن پیر پیر پنجال کی تلہٹی میں پہنچا۔ یہاں سے کشمیری زبان بولنے والوں کا آغاز ہوتا ہے''۔

مندرجہ بالا اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ رتن پیر (دیرہ گلی) سے لے کر پوشانہ تک کے علاقہ میں اس وقت بھی کشمیری آبادی تھی۔ اور اکبراعظم کے اس سفر کو چار سو سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ بہرحال کشمیری لوگ

مختلف اوقات میں مختلف اسباب سے پونچھ میں آ کر بستے رہے۔کئی خاندان بغرض تجارت پونچھ میں آتے رہے۔اور رفتہ رفتہ یہیں کے ہو گئے۔ان تاجروں کے ساتھ بار برداری کی غرض سے مزدور لوگوں کی آمد بھی ہوتی رہی۔لہذا روزی روٹی کے مواقع پا کر ایسے لوگوں نے گاؤں میں اپنا مسکن بنالیا۔اور عام طور پر ایسی جگہوں پر آباد ہوتے رہے جہاں کشمیر سے ملتی جلتی آب وہوا تھی۔اس طرح روابط بڑھتے رہے۔اور دوسرے پیشہ ور لوگوں نے بھی یہاں آباد ہونا شروع کر دیا۔یوں آج تک یہ لوگ زراعت،مزدوری اور دوسرے پیشوں سے جڑے ہوئے ہیں۔لوہار،ترکھان،مرکبان،کمہار،نقاش،زینہ گر،وغیرہ جیسے پیشوں میں آج بھی کشمیری لوگوں کو ہی مہارت حاصل ہے۔کئی خاندان مغل حکومت کے دور میں پونچھ میں آ کر آباد ہوئے اس وقت چونکہ کشمیر کے لئے آمدورفت بذریعہ مغل روڈ ہی ہوتی تھی۔لہذا پونچھ کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔یہاں تجارت اور دوسرے پیشہ ور لوگوں کے لئے زیادہ مواقع میسر تھے۔بعض خاندان سکھوں کے دور میں بھی قحط یا دیگر مصائب کا شکار ہو کر پونچھ میں وارد ہوئے۔علاوہ ازیں ڈوگرہ حکومت میں اور خاص کر راجہ موتی سنگھ کی تحریک پر بہت سے کشمیری خاندان پونچھ آئے جن میں کشمیری پنڈتوں کے خاندان بھی تھے۔جنہوں نے پونچھ کی صنعت وحرفت،ثقافت وتمدن اور ادب میں ان مٹ نقوش چھوڑے۔پونچھ شہر میں آباد زیادہ تر کشمیری خاندان ڈوگرہ حکومت کے دور میں ہی آباد ہوئے ہیں۔بحوالہ محمد دین فوق مصنف تاریخ اقوام پونچھ مطبوعہ 1934ء میں اوراس کے مفصلات میں کشمیری مسلمانوں کی تقریباً پچاس ہزار آبادی تھی۔اگر فوق مرحوم کی فراہم کردہ اس تعداد کو مدِنظر رکھ کر اندازہ لگایا جائے اوراس میں کشمیری پنڈتوں کو بھی شامل کیا جائے تو کشمیریوں کی آبادی آج دوگنی سے بھی زیادہ ہے۔حالانکہ محمد دین فوق کی تحقیق کا دائرہ صرف حویلی تحصیل تک ہی محدود رہا ہے۔سرنکوٹ اور مہنڈر تحصیل کا تذکرہ فوق صاحب نے سرسری انداز میں کیا ہے۔مہنڈر،سورن اور حویلی تحصیلوں میں ایسے گاؤں ہیں جہاں کی کشمیری آبادی نے کشمیری زبان ترک کر دی ہے۔اروا ب گوجری اور پہاڑی زبان بولتے ہیں۔

کشمیری آبادی شہر کے علاوہ گاؤں بکھری ہوئی ہے۔''کاشر لوک علاقہ وادپھرِ ہ تہ کاشر زبان'' مصنف عبدالخالق زینہ گری مطبوعہ 1967ء میں پونچھ میں کشمیری آبادی والے گاؤں کی ایک فہرست دی ہے،جس میں زینہ گری صاحب نے منڈی،سورن،سہڑی چوہانہ،سہڑی خواجہ،چنڈک،لگڑیاں،ساوجیاں،چھیلا ڈھانگری،فتح پور،بائلہ،چکراڑہ۔بانڈی کماں خان کو اور کھیت کو کشمیریوں کے اکثریتی گاؤں بتا کر تحریر کیا ہے۔مگر زینہ گری کی یہ فہرست نامکمل نظر آتی ہے۔اور کسی حد تک غلط بھی۔راقم کی تحقیق کے مطابق،لگڑیاں،ساوجیاں،چھمبر،کناری،کھیت،ڈنوگام،بیدار بلنائی،جالیاں،راجپورہ،منڈی۔براچھڑ۔سٹیلاں،لورن کا تقریباً تمام علاقہ۔ونڈ تنتریاں

ونڈ لوہاراں۔ بیلہ بالا۔ کھڑپا۔ گئی گام۔ ہب۔ اراں ،سہڑی خواجہ۔ سہڑی چوہاناں۔ پوشانہ۔ بیر۔ رجاڑا۔ ڈوڈی، ۔ گاؤں ایسے ہیں جہاں کشمیری آبادی کا تناسب 70% سے بھی زیادہ ہے۔ مذکورہ بالا آبادیوں میں سے کچھ گاؤں ایسے بھی ہیں جہاں نوے فیصدی کشمیری آباد ہیں۔ علاوہ ازیں سیکلو۔ ساتھرہ۔ دھڑہ۔ فتح پور۔ بائلہ۔ اعظم آباد۔ اتولی۔ چھیلہ۔ ڈھانگری۔ منگناڑ۔

۔ چنڈک۔ چکترو۔ گل پور۔، شاہ پور۔ اڑائی۔ پلیرہ۔ بانڈی کماں خان۔ نابناں۔ لسانہ۔ ماہان۔ پوٹھہ۔

لٹھونگ۔ بھاگلہ۔ ہاڑی۔ کلرکٹل۔ فضل آباد۔ سمبوٹ۔ بھونی کھیت۔ تڑانوالی۔ بفلیاز۔ سرنکوٹ۔ سنئی۔ سیالاں۔ ایسے گاؤں ہیں جہاں دس سے لے کر پچاس فیصد تک کشمیری آباد ہیں۔ اس کے علاوہ تحصیل مہنڈر میں چھترال چونگاں۔ نڑول۔ منکوٹ۔ کوٹاں۔ دار گلون۔ گلوتہ۔ بھاٹہ دوڑیاں۔ سنگیوٹ اور اڑی میں بھی کشمیری آباد ہیں۔ موضع بھاٹہ دھوڑیاں میں کشمیری قوم کی آبادی 50% ہے۔ ان میں کچھ گاؤں ایسے بھی ہیں جن میں کشمیریوں کی زبان پہاڑی یا گوجری ہے جیسے سنئی، چھیلہ ڈھانگری۔ ،مستان درہ۔ اڑائی۔ دھارگلون۔ وغیرہ۔ پونچھ شہر میں کشمیریوں کے دو بڑے قدیم محلے موجود ہیں ان میں محلہ پنڈتاں۔ جہاں کشمیری پنڈت آباد ہیں اور محلہ شیخاں جہاں اہل تشیع کی آبادی ہے۔ علاوہ ازیں شہر کے باقی حصوں میں بھی بہت سے کشمیری آباد ہیں۔

کشمیریوں نے ضلع پونچھ کے ہر ایک شعبۂ زندگی میں اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔ ڈوگرہ حکمرانوں کے دور میں کشمیری پنڈتوں نے پونچھ کی ترقی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ کشمیری پنڈت ڈوگرہ حکومتوں میں نمایاں عہدوں پر فائز رہے۔ ڈوگرہ راجاؤں نے کشمیری پنڈتوں اور کشمیری مسلمانوں کو بھی جاگیریں عطا کیں۔ تعمیر وترقی جو ڈوگرہ راج اور اس کے بعد پونچھ میں وقوع پذیر ہوئیں۔ اس میں کشمیریوں نے سب سے زیادہ رول ادا کیا۔ کشمیری پوشاک (فرن، پٹو، کمبل) کشمیری وازوان (یخنی۔ رِستہ۔ گشتابہ وغیرہ) کشمیری کانگڑی سماوار۔ دوسرے برتن۔ کشمیری ساز چنگ ورباب۔ کشمیری گائین۔ چھکری۔ وغیرہ۔ پونچھ کے تمام پہاڑیوں، گوجروں اور دوسرے لوگوں کی زندگی کا اہم جزو بن چکے ہیں۔ عبدالخالق ٹاک زینہ گری مصنف کاشرزبان علاقہ وادپھیرہ تہ کاشرزبان کے مطابق پونچھ میں جتنے بھی پیشہ ور لوگ موجود ہیں ان میں اور ضلع بارہمولہ کے پیشہ وروں میں کوئی بھی فرق نہیں ہے۔ زینہ گری کے مطابق پونچھ میں سب سے زیادہ ہجرت ضلع بارہمولہ سے ہوئی ہے۔ اور یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے۔ بارہمولہ اور شوپیاں چونکہ پونچھ کے ساتھ جڑے ہوئے اضلاع ہیں۔ درہ توشہ میدان اور پیرگلی ہی کشمیر میں آنے جانے کی معروف گزرگاہیں رہی ہیں۔ لہذا ان اضلاع کا پونچھ میں سب سے زیادہ اثر ہے۔ بارہمولہ میں آج بھی پہاڑی لوگوں کی بڑی آبادی ہے۔

محمد دین فوق مصنف تاریخ اقوامِ پونچھ نے پونچھ کے کشمیری مسلمانوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اوّل جو شہر میں رہتے ہیں۔ دوسرے جو علاقہ منڈی میں رہائش پذیر ہیں۔ اور تیسرے جوار دگرد کے دیہاتوں میں رہائش پذیر ہیں۔

تاریخ اقوامِ پونچھ کی اشاعت کے وقت جو غالباً 1934-35ء میں ہوئی ہے تقسیم سے پہلے پونچھ شہر میں کشمیری مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد آباد تھی۔ جن میں رئیس۔ جاگیردار۔ اور نامور خاندان تھے۔ خاندان مفتیان۔ خاندان شیخ۔ اندار یہ سادات۔ خوجہ عبد اللہ جو، حبیب جُو جو بنجارہ خاندان خواجہ پختہ۔ ملک سید بٹ۔ ڈار۔ میاں نظام الدین وزیر پونچھ۔ خاندانا طبائے قریش، بانڈے۔ راتھر۔ میر۔ پیر۔ خاندان امیر علی شاہ جعفری۔ وغیرہ نامور اور مشہور تھے۔ مندرجہ بالا کشمیری خاندانوں میں سے شہر پونچھ میں اب صرف بانڈے گنائی، شیخ، میر اور کچھ راتھروں کی باقیات ہی بچی ہیں۔ باقی ماندہ خاندان 1947ء کے پر آشوب دور میں کسمپری کی حالت میں ہجرت کر چکے ہیں البتہ محلہ پنڈتاں اور محلہ شیخاں میں بدستور کشمیریوں کی آبادی ہے۔ کشمیری پنڈتوں میں زُتشی، سوپوری، مصری، بھان رینہ، ڈر، وغیرہ، خاندان قائم و دائم ہیں۔ بوہرہ پنڈتوں، کپور، سوری، اور پوری خاندان بھی پونچھ کے مشہور و معروف خاندان ہیں۔

سوشل اکنامکس ڈیولپمنٹ آف جے اینڈ کے مصنف این ایس گپتا اور این سی پر بھاکرن کے مطابق کشمیری پنڈتوں کے 133 گوتر ہیں۔ اور بوہرہ قوم کی کچھ ذاتیں کھتریوں میں شامل ہیں۔ اور کچھ کشمیری پنڈتوں میں۔ پونچھ شہر کا دوسرا بڑا محلہ شیخاں ہے جہاں ساری آبادی اہلِ تشیع کی ہے۔ موجودہ دور میں سادات، رضوی، بابا، نحوی، زینہ گر۔ ونتو۔ شیخ۔ صوفی۔ سلطان۔ اور میر ذاتوں کے لوگ یہاں آباد ہیں۔ پیشہ تجارت اور ملازمت ہے۔

منڈی میں اہلِ تشیع آباد ہیں جو سب کشمیری ہیں۔ یہ بانڈے، ڈار، گنائی، بانگن، گریستو، سادات صفیہ، سادات موسوی، اور بٹ ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پیشہ زیادہ تر تجارت ہی ہے۔

منڈی کے دوسرے کشمیری آبادی والے دیہاتوں میں جن کی فہرست درج کی جا چکی ہے۔ بٹ۔ ڈار۔ فراش۔

تانترے۔ قریشی۔ میر۔ راتھر۔ لون۔ پیر۔ سادات۔ وائین۔ بچھ۔ ملک۔ بیگ۔ زرگر۔ شیخ، ریشی وغیرہ اقوام آباد ہیں۔ مہنڈر اور سورن تحصیلوں کے کشمیری آبادی والے گاؤں میں بھی لگ بھگ ان ہی ذاتوں کے لوگ رہائش پذیر ہیں۔ کشمیر سے آکر یہاں پونچھ میں آباد ہونے والے ان لوگوں میں یہاں بہت نامور شخصیات پیدا ہوئی ہیں۔

جن کی وجہ سے نہ صرف پونچھ کا نام روشن ہوا۔ بلکہ ان شخصیات کے حوالے سے پونچھ کا ادب ،ثقافت ۔تہذیب اور تمدن ۔پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ۔ 1947ء سے پہلے اور بعد میں جو مشہور شخصیات پونچھ میں پیدا ہوئیں اُن کی فہرست طویل ہے ۔تاہم چند اہم ترین شخصیتوں کا ذکر ذیل ہے ۔

مفتی ضیاء الدین ضیاءؔ ، فارسی اور اُردو کے شاعر تھے ۔مسلم کانفرنس کشمیر کی زیرِ نگرانی جو سب سے پہلا اخبار ''صداقت'' سرینگر سے شائع ہوا تھا ۔اُس کے ایڈیٹروں میں آپ بھی شامل تھے ۔

میاں نظام الدین وزیر پونچھ ایک ادنیٰ ملازم تھے ۔ترقی کرتے کرتے وزیر اعظم کے عہدہ تک پہنچے ۔آپ کا شمار ریاست کے مشہور وزیروں میں ہوتا ہے ۔محمد دین فوق کے مطابق آپ کشمیری تھے ۔

دیا نند کپور ۔آپ ایک مشہور ادیب اور صحافی تھے ۔لاہور کے اخبار کشمیری کے معاون بھی رہے بعد میں پونچھ میں پریس قائم کیا ۔اور پربھات نام کا اخبار جاری کیا ۔

دینا ناتھ رفیق: آپ کا شمار پونچھ کے اہم ترین شعراء میں ہوتا ہے ۔آپ کا شعری مجموعہ ''سنبل و ریحان'' آپ کی حیات میں چھپ گیا تھا ۔آپ مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے اُستاد تھے ۔

پیر حسام الدین شاہ ۔آپ رئیس اعظم پونچھ تھے ۔نہایت ہی مشہور شخصیت تھے ، ۔خانقاہ محلہ پرانی پونچھ میں رہائش تھی ۔ بہت بڑے جاگیر دار تھے اور گدی نشین خانقاہ بھی تھے ۔

موتی لعل کپور ۔آپ دیا نند کپور کے صاحبزادے ہیں اور ایک اچھے ادیب بھی ہیں ۔ڈپٹی ڈائریکٹر انفارمیشن آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں

خواجہ عزیز دین ۔آپ راجہ پونچھ کے میر منشی تھے ۔آپ کا شمار رئیسوں میں ہوتا تھا ۔آپ کا خاندان بڑا چھتر منڈی میں موجود ہے ۔

خواجہ احمد علی میر پلیرہ ۔آپ مشہور شخصیت تھے ۔آپ کا تعلق اثنا عصری سے تھا ۔ان کے علاوہ قاسم علی میر ۔صفدر علی بانکن اور شہیلد ار باقر جو میر ۔مشہور رئیس گزرے ہیں ۔

ماسٹر غلام احمد ۔آپ ساوجیاں کے رہنے والے تھے ۔آپ تحصیل حویلی کے ایم ایل اے تھے ۔

غلام قادر بانڈے ۔کشمیر چھوڑ دو تحریک میں شامل رہے ۔1947ء میں آپ پونچھ کے

ایڈمنسٹریٹومقرر ہوئے۔

محمد دین بانڈے۔آپ پونچھ سے ایم ایل سی اور ریاستی سرکار میں منسٹر کے عہدے پر فائز رہے۔آپ ایک سیاسی شخصیت اور ایک بہترین اُستاد اور وکیل تھے۔

غلام احمد گنائی۔آپ منڈی کے رہنے والے تھے،آپ حویلی پونچھ سے ایم ایل اے کے لئے چنے گئے تھے۔شیخ عبداللہ سرکار میں بطور وزیر شامل رہے۔

غلام دین میر اور غلام حسین میر دونوں رئیس تھے آپ کی سخاوت مشہور ہے۔میر غلام محمد۔آپ میر غلام دین کے برادر اصغر ہیں اور حیات ہیں۔آپ ایم ایل اے حویلی۔ممبر پارلیمنٹ اور ریاستی کابینہ میں بطور وزیر قائم کر چکے ہیں۔آپ کا خاندان بھی کشمیر سے آیا ہے۔چھیلہ آبائی گاؤں ہے۔کشمیری زبان ترک کر چکے ہیں۔

غلام محمد جان۔آپ لگڑیاں کے رہنے والے ہیں۔لگا تار دو بار حویلی سے ایم ایل اے چنے جا چکے ہیں۔آپ نہایت ہی مدبر،اور سیاسی سوجھ بوجھ کے مالک ہیں۔

کے کے کپور۔آپ بھی کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔بطور ڈسٹرکٹ وایجوکیشن آفیسر سبکدوش ہوئے ہیں۔آپ کا تعلق بہت سی سرکاری وغیر سرکاری تنظیموں سے بھی ہے۔

عبد الاحد بٹ۔آپ منڈی راجپور کے رہنے والے تھے۔آپ کشمیری زبان کے زبردست شاعر تھے۔آپ کے شعر اس علاقے کے ہر شخص کو ازبر ہیں۔

محمد ایوب شبنم۔آپ کے آباء واجداد محلہ خانقاہ وگاؤں براچھڑ پونچھ سے ترکِ سکونت کر کے پوٹھہ سرنکوٹ میں آباد ہوئے۔آپ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ایک سیاست کار ہونے کے علاوہ آپ کا شمار پونچھ کے صفِ اول کے ادبا میں ہوتا ہے۔علاوہ ازیں آپ ایک سماجی کارکن ہیں اور پونچھ کے نوجوانوں کے لئے ایک تحریک بھی۔اور ضلع پونچھ میں کشمیریوں کی واحد تنظیم ''کوشر آرگنائزیشن،موجودہ کوشر اتحاد'' کے خالق بھی ہیں جو تنظیم عرصہ سے کشمیریوں کے ادبی،سماجی اور سیاسی مقام کے لئے کام کرتی چلی آرہی ہے۔نیز آپ عرصہ سے اس تنظیم کے صدر بھی ہیں۔

غلام نبی شہباز۔آپ کا تعلق پوشانہ گاؤں سے ہے آپ اُردو اور کشمیری اور پہاڑی زبان کے

بلند قامت ادیب اور شاعر ہیں۔ کشمیری اور اُردو کی کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

عبد الرشید فدا۔ آپ شہباز کے برادرِ اصغر ہیں۔ آپ کا شمار بھی اُردو اور کشمیری کے بہترین شاعروں اور ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔ آپ کا تعلق بھی پوشانہ گاؤں سے ہے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ حال ہی میں آپ کا ایک کشمیری شعری مجموعہ ''میون پوش'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جس سے اپنے آبائی گاؤں پوشانہ کی خدمت اور محبت ظاہر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر لیاقت جعفری۔ آپ کا تعلق پونچھ سے ہے اور نئی پیڑھی میں آپ اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں۔ حال ہی میں اُردو زبان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

یہ افراد پونچھ کا سرمایہ ہیں اور پونچھ کی آن اور بان ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں اس مختصر سے مقالے میں ضلع پونچھ کے کشمیری ادب، فن اور ثقافت، اور پونچھ کی دیگر کشمیری سرکردہ شخصیات سے انصاف نہیں کر سکا تاہم اس کی وجہ پونچھ کے متعلق تاریخی کتب کی عدم دستیابی ہے۔

☆☆☆

ورق ورق کھوگئی زندگی میری

(کرشن چندر کا آخری سفرنامہ)

کرشن چندر

جب فلم ڈویژن نے یہ طے کیا کہ کرشن چندر کے ادب اور زندگی پر بیس منٹ کی ایک دستاویزی فلم تیار کی جائے تو انہوں نے مہندر جی کو بلوا کر یہ کام ان کے سپرد کردیا۔ کچھ دنوں ممبئی میں شوٹنگ ہوتی رہی پھر پونا اس مقصد کے لئے گئے، پھر پونا سے لوٹنے پر کشمیر جانے کا پروگرام بنا۔ جہاں ہم دونوں بھائیوں کے بچپن اور جوانی کی گمشدہ تصویریں تھیں۔

اسٹیشن پر برادرِ محترم غلام رسول ریزو، ڈائریکٹر آف انڈسٹریز معہ اپنے رفقاء کار لینے آئے تھے۔ حکومت کی جانب سے انہوں نے ہی سب انتظام کر رکھا تھا، جموں ہوٹل میں آٹھ کمرے بک تھے، باقی لوگس کے رہنے کے لئے سرکٹ ہاؤس میں انتظام کیا گیا تھا، مہندر جی کے بچپن کے دوست گوری دت رینہ اور ان کے بڑے بھائی بھی آئے تھے، اس رات جموں ہوٹل کے بار اور اس کے ڈائننگ ہال میں بڑی گہما گہمی

کچھ ان کے بارے میں:

نام: کرشن چندر

والد کا نام: ڈاکٹر گوری شنکر

پیدائش: 23 نومبر 1913ء بمقام بھرت پور راجستھان۔

تعلیم: ایم اے (اردو)

ادبی زندگی کا آغاز: طالب علمی کے زمانے سے۔

تصنیفات: سفر نامہ کے اختتام پر ملاحظہ ہوں۔

پیشہ: ریڈیو، صحافت، اور فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔

وفات: 8 مارچ 1977ء

ذریعۂ اظہار: اردو، انگریزی

تھی۔مہندر جی سب کی خاطر تواضع میں مصروف چہکتے پھر رہے تھے۔ان کی موہنی مسکراہٹ سب کے لئے تھی،وہ سب خوش دیکھ کر خوب بھی خوش تھے۔

جموں میں ایک دن شوٹنگ کی (بعد میں جموں کے سارے مناظر کاٹنے پڑے کیونکہ فلم لمبی ہوگئی تھی) دوسرے دن جموں سے پونچھ کے لئے روانہ ہوئے۔

انفارمیشن کے مہتمم پوری صاحب نے ایک اسٹیشن ویگن کا انتظام کیا۔اپنے محکمے کی طرف سے۔ایک موٹر ایک جیپ ویگن، ریز وصاحب نے اپنے محکمے سے عنایت کی۔اور حکومتِ جموں وکشمیر نے اس قافلے کے لئے ایک انفارمیشن آفیسر سردار نریندر سنگھ کو ہماری دیکھ بھال کے لئے مامور کیا۔یوں تو ساتھ چلنے کا وعدہ ریز وصاحب نے بھی کیا تھا،اور وزیر مالیات گردھاری لعل ڈوگرہ نے بھی،مگر عین وقت پر سرکاری کاموں میں الجھ گئے۔

ہمارا قافلہ جب جموں سے پونچھ کی جانب چلا،تو کچھ دیر دریائے چناب کی نہر نے ہمارا ساتھ دیا، راستے میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں خیمے دیکھائی دیئے۔ان میں چھمب کے علاقے کے رفیوجی رہتے تھے۔جن کے گھر بار ہندوستان اور پاکستان کی پچھلی لڑائیوں نے تباہ کردیئے تھے، یہاں سے سرحد قریب تھی مگر رفیوجیوں کے بچے آس پاس کی نفرت سے بے خبر دھوم مچاتے ہوئے ریت میں کھیل رہے تھے۔عورتیں قمیض شلوار پہنے نہر سے پانی کے گھڑے بھر رہی تھیں۔شہتوت کے پیڑ کے نیچے ایک بوڑھا حقہ پی رہا تھا۔اس سے قریب اس سے منہ موڑ کر ایک نو بیاہتا جوڑا ایک دوسرے کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنے میں مصروف تھا۔

میں نے مہندر کی طرف دیکھا۔کچھ کہا نہیں۔ چلتے چلتے اتنا بتادوں کہ میرے اور اس کے درمیان بہت کم بات ہوتی تھی۔گفتگو تو دراصل کانچ کی دیوار ہے۔جس کے آر پار دونوں فریق ایک دوسرے کو دیکھتے جاتے ہیں۔مگر میرے اور مہندر کے درمیان کوئی دیوار نہ تھی۔اس لئے کوئی گفتگو نہ تھی۔بس'ہوں''ہاں' چند جملے۔پھر ایسی خاموشی۔جس کی قوتِ اظہار گویائی سے بڑھ کر ہوتی تھی۔اس سے جو بھی گفتگو ہوتی تھی۔ایک طرح کی خود کلامی، اور اب کہ جب وہ اس جہاں میں نہیں ہے۔میں گھنٹوں اس سے بات کیا کرتا ہوں۔اپنے آپ سے بات کرنا مشکل ہے۔میں نے مہندر سے پوچھا'' کچھ یاد آرہا ہے؟''

''سیالکوٹ''

سیالکوٹ یعنی سیالوں کی بستی۔سیال ہندو بھی ہوتے ہیں اور مسلمان بھی۔ایک زمانے میں سیال قبیلہ اس علاقے کا مشہور قبیلہ تھا۔سیال عورتیں اپنی خوبصورتی اور نازکی کے لئے مشہور تھیں۔اور مرد اپنی وجاہت کے لئے۔پھر سب تاریخ میں گھل گیا۔لاہور میں ہمارا ایک سیال دوست رہتا تھا۔برج موہن سیال،وہ ہمارے کالج کی

ایک لڑکی دلیپ کور پر عاشق تھا۔ اور فلائنگ کلب میں شامل ہو کے روز اس کے گھر کے اوپر جہاز دوڑایا کرتا تھا۔ ایک روز اپنے ہوائی جہاز میں اڑان کے کرتب دکھاتے دکھاتے اپنی محبوبہ کے گھر کے سامنے ڈرائیو کرتے کرتے گر گیا اور ہوائی جہاز سمیت جل گیا۔

''جل رہا ہے!'' مہندر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

میں نے کہا'' ہاں عشق کی آگ کبھی بجھتی نہیں، اس سیال کی چتا آج بھی جل رہی ہے، مگر کیا بات ہے مہندر جی! آج کل کسی کو کسی سے عشق نہیں ہوتا بس افیئر affiar ہوتے ہیں''۔ ''سب ٹیلی فون کا قصور ہے''۔ سلمٰی نے اچانک کہا۔

میں نے اور مہندر جی نے چونک کر سلمٰی کی طرف دیکھا۔

''ہاں''، سلمٰی نے دہرایا'' سب ٹیلی فون کا قصور ہے۔ آج کل محبت ٹیلی فون سے شروع ہوتی ہے۔ اور ٹیلی فون پر کاٹ دی جاتی ہے، لطیف جذبہ کہاں سے آئے!''

مہندر جی نے زور سے قہقہہ لگایا۔ پھر چپ ہو گئے مگر نگاہیں اس طرف تھیں جدھر سیالکوٹ تھا۔ ڈاکٹر اقبالؔ کا وطن، ایک دفعہ ہم باؤ جی کے ساتھ سیالکوٹ گئے تھے۔ (ہم اپنے پتا جی کو باؤ جی کہا کرتے تھے) ہم دونوں بہت چھوٹے تھے۔ اور ڈاکٹر اقبالؔ کا نام بھی نہیں جانتے تھے۔ سیالکوٹ کے قریب قصبہ گھرتل میں اپنے قرابت داروں میں ایک شادی تھی۔ شادی میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مگر جس دن ہم وہاں پہنچے۔ رات گزارنے کے بعد صبح ہوئی تو میں نے باؤ جی کو چپکے چپکے اپنے بستر کے کنارے روتے دیکھ لیا۔ سمجھ میں نہ آیا کیا بات ہوئی۔ مہندر سے بات کی تو اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔ بہت سال گزر گئے۔ وہ آنسو معمہ ہی رہے۔ پھر ایک دن جب مہندر کی محبوبہ کی شادی اچانک قرار پائی۔ تو مہندر نے بڑے دلگداز لہجے میں مجھ سے کہا'' آج سمجھ میں آیا باؤ جی کیوں رو رہے تھے'' پھر آہ بھر کر بولے'' انسان کو سمجھنا آسان ہے، بھائی صاحب آنسوؤں کو سمجھنا بہت مشکل ہے''۔

ہمارا قافلہ جموں کے مضافات سے دور نیلی سڑک پر بھاگ رہا تھا۔ دور تک ریتیلے میدان تھے۔ بالو کے کھیت یا جلی پہاڑیاں۔ جن میں کانٹے دار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ اُگتا تھا۔ ہمارے قافلے کے سب لوگ تین گاڑیوں میں نہ سما سکتے تھے۔ اس لئے نو آدمیوں کو صبح کی بس سے پونچھ کے لئے روانہ کر دیا تھا۔ گرمی دم بہ دم بڑھتی جا رہی تھی۔ جموں سے راجوری تک گرمی کی یہی شدت رہی۔ ہاں جب راجوری لب دریا پہنچے تو وطن کے پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوائیں آنے لگیں اور جھاگ اڑاتی ہوئی پتلی لہریں خوش آمدید کے پیام دینے لگیں۔

ڈاک بنگلے میں کھانے کا انتظام تھا۔ اتفاق سے وہ بس جس میں باقی کے نو ساتھی تھے۔ یہیں راجوری

کے بازار میں مسافروں کے کھانے کے لئے رک گئی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا تو ہم نے ایک اسٹیشن ویگن بازار بھیج کر باقی ساتھیوں کو بھی یہاں کھانے پر بلوا لیا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کیا۔ ڈاک بنگلے والوں نے ہمارے لئے چار کمرے کھول دیئے تھے۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد جو باہر نکلا تو مہندر جی کو چپ چاپ نچلی منزل کے برآمدے کے فرش پر بیٹھا ہوا پایا۔ میں بھی ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے قریب میں بچھی ہوئی بجری کی چند کنکریاں اٹھا رکھی تھیں۔ اور انہیں ایک ایک کر کے چھوٹے وقفوں کے بعد لان کی گھاس پر پھینک رہے تھے۔ چھوٹا وقفہ۔ چھوٹی یاد۔ بڑا وقفہ۔ بڑی یاد۔ لمحہ جو بجلی کی طرح کوند جائے یا لمحہ جو ماہ و سال کی کوئی خوبصورت تصویر بن کر دل کے دریچے میں اتر جائے۔

میں نے مسکرا کر کہا ''مہندر جی! یہ کس شیطان کو کنکریاں مار رہے ہو'' وہ بولے ''دل کے شیطان کو بھائی صاحب! مچلا جاتا ہے اور مجھے لاہور لئے جا رہا ہے۔ یاد ہے ہم لوگ رات کی گاڑی سے لاہور نکلتے تھے اور صبح راولپنڈی پہنچ جاتے تھے۔ پھر صبح کا ناشتہ بازار میں روب سنگھ کے ڈھابے پر کرتے تھے اور پھر ......؟''۔ ''اور پھر'' میں نے کہا ''کوہ نور بس سروس کی کسی لاری پر سوار ہو کر راولپنڈی سے مری، مری سے کوہالے، کوہالے سے اُڑی، اُڑی سے براستہ علیہ آباد پونچھ پہنچ جاتے تھے۔ وہ راستہ کتنا خوبصورت تھا۔ پھر میں نے کہا'' اب تک تو یہ راستہ بہت پھیکا اور بدرنگ رہا۔ گرمی سے جھلس گئے۔ جموں پونچھ روڈ پر سفر کرنے کا ہمارا یہ پہلا موقعہ ہے۔

مہندر جی مسکر کر بولے ''یہی سوچ کر میں نے اس سڑک کو صاف کر دیا۔ کہ اس راستے پر ہماری کوئی یاد نہیں۔ اور یہ یادیں ہی تو ہیں جو ہر سفر میں رنگ بھرتی ہیں۔ میں اس کے لئے اجنبی۔ یہ میرے لئے اجنبی۔ لیکن اس اجنبی کے لئے اجنبی نہیں۔ جس نے چند میل ایک چھوٹے سے نخلستان میں تپتے ہوئے سفر سے گزر کر گاڑی روک کر چودہ سال کی نوخیز کلی سے پانی کے لئے پوچھا تھا۔ اور ہم سب لوگوں کو ایک ڈھلوان سے ایک پرانی باؤلی پر لے گئی تھی۔ مہندر نے ایک کنکری پھینک کر کہا ''اسکی آنکھیں گہری سبز تھیں''۔

اور وہ اب کبھی بڑی نہ ہو سکے گی۔ ہمیشہ چودہ سال کی رہے گی۔ اور دوسری بار جب ہم اس سڑک سے گزریں گے اور اس نخلستان کی باؤلی کا پانی پئیں گے، تو شاید وہ وہاں نہ ہوگی، لیکن دوسرے سفر پر اس کی سبز آنکھوں کا افسوں دیر تک اور دور تک جادو جگاتا رہے گا۔

سندر بنی کا ذکر ہی بھولتا جا رہا ہوں۔ اونچے اونچے پہاڑ۔ جنگلوں سے لدے ہوئے پہاڑوں کے خطرناک موڑ کاٹ کر سندر بنی راستے میں آئی پہاڑ یکلخت پیچھے ہٹ گئے۔ ور ایک خوبصورت دور دور تک پھیلی ہوئی وادی نظر آئی، میلوں تک کھیت اور جنگل پیچھے ہٹ گئے تھے۔ کسی زمانے میں یہ سب کھیل جنگل ہوں گے اسی

مناسبت سے لوگوں نے اس کا نام سندر بن رکھ یا ہوگا جواب بگڑ کر سندر بنی ہو گیا ہے۔ایک سندر بن بنگال میں بھی ہے، وہاں تو ابھی گھنے جنگل موجود ہیں۔مگر یہاں کاٹ ڈالے گئے ہیں اور اب وہ کھیتوں سے دور سہمے سہمے سے کھڑے انسان کی اس بربریت کے گواہ ہیں جواس نے جنگلوں وراس کے باسیوں پر روا رکھی ہے۔

میں نے کہا'' گھنے بھرے پُرے جنگل میں چرواہے کی بنسی کی تان کا جو مزا ہے وہ میدانوں میں نہیں''

'' آپ کو تو ہمیشہ بنسی کی تان کی پڑی رہتی ہے، کہیں کوئی چرواہی نظر نہیں آئی کیا؟''سلمیٰ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔پھر مہندر سے مخاطب ہو کے بولی'' مہندر جی! راستے میں کہیں کوئی چرواہی نظر آ جائے تو گڑی رکوا لیجئے گا۔کرشن جی کے ساتھ اس کی ایک تصویر لے لیں گے''۔سب ہنس پڑے۔

اب پہاڑ بلند ہوتے جا رہے تھے۔اور چاول کے ٹیرس نما کھیت نمودار ہو رہے تھے۔اس طرف تین چار ہزار فٹ نیچے کے پانیوں کو چھوٹی چھوٹی کولیں کھود کر اوپر لایا گیا تھا۔بجلی یا ڈیزل کی طاقت کے بغیر۔اس سے یہاں کے ان پڑھ کسانوں کی محنت اور مہارت کا پتہ چلتا ہے۔کھیتوں کے کنارے کنارے پھلدار پیڑ بھی نظر آنے لگے تھے۔خوبانی، ہاڑی، سیب اور چیری کے بوٹے ہیں کہیں کیلوں کے جھنڈ۔یہاں کیلے دیکھنے میں زعفرانی رنگ کے ہوتے ہیں اور بڑے بڑے۔مگر مزے میں لیسدار ہوتے ہیں۔وہ ذائقہ نہیں جو ہری کھال کے کیلے میں ہوتا ہے۔زیادہ تر پیڑ خوبانیوں اور ہاڑیوں کے ہیں۔بہت اونچائی پر ہمیں ایک لڑکا خوبانیاں بیچتا ہوا ملا۔سر پر گول ٹوپی۔گلاب سے رخسار۔اور ٹوکری اشرفیوں کی طرح چمکنے والی۔سنہری خوبانیوں سے بھری ہوئی۔سلمیٰ نے جب قیمت پوچھی تو چیخ کر رہ گئی۔

''ایک روپیہ؟ ارے اس خوبانیوں سے بھری ٹوکری کے لئے ایک روپیہ''

مہندر جی نے اس بچے کو جو دو روپے دیئے تو وہ پہلے حیرت سے دو روپوں کو دیکھتا رہا۔پھر مارے خوشی کے ٹوکری سمیت خوبانیوں کو چھوڑ کر اوپر بھاگ گیا۔جہاں قریب دو سو فٹ کی اونچائی پر ہم اس کا خوبانیوں سے گھرا ہوا گھر دیکھ سکتے تھے۔

سرلا مہندر جی سی بولی:'' دیکھو بھا پا جی! ہم لوگ اڑتیس برس کے بعد یہاں آئے ہیں۔مگر خوبانیوں کی قیمت نہیں بدلی۔یہ لڑکا دو روپے پا کر کتنا خوش ہوا۔شاید اسے یقین نہ آیا ہوگا۔سوچتا ہوگا کہ کہیں ہم اس سے دو روپے چھین نہ لیں یا اپنا ارادہ بدل لیں''۔

مہندر جی کہنے لگے'' یہاں دو روپے کی ٹوکری اور بمبئی میں یہی پھل چار روپے کلو ملتا ہے''۔

ایک موڑ پر شادی کا دلہا نئے کپڑے پہنے عورتوں میں گھرا ہوا نظر آیا۔پنجابی شلوار اور قمیض کا فیشن

جواب تک سارے راستے عورتوں میں نظر آتا رہا۔ یہاں آکر یکا یک مغلئی شلوار اور گھیرے دار قمیض میں بدل گیا۔ سر پر تا جکستانی ٹوپی۔ عورتیں پہاڑی گیت گا رہی تھیں۔ نوجوان لڑکیاں دلہا سے مذاق کر رہی تھیں۔ چند لمحوں میں یہ منظر بھی تحلیل ہو گیا۔ کیونکہ ہم نے گاڑی روکی نہیں تھی۔ اس کی رفتار بہت دھیمی کر دی تھی۔ ایسا لگا جیسے ماضی کا ایک پیارہ لمحہ چن پل کے لئے آنکھوں میں چمک چمک گیا۔ اور پھر ماضی کے دھند لکے میں کھو گیا۔

''لگتا ہے فلمی گیت ابھی تک یہاں نہیں پہنچے'' مہندر نے طنزاً کہا اور گاڑی موڑ سے گزر گئی۔

اب ہماری سڑک اونچائی پر جا رہی تھی۔ اور پہاڑ ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے جا رہے تھے۔ جیسے گھیرا باندھ کر ہمارے گرد ایستادہ ہوں۔ ہوا میں برف اور جنگلوں کی مہک تھی۔ اور جب ہوا سر سراتی تو چیڑ کے جھومروں کی پایل افق تا افق رقص کناں ہو جاتی۔ اس پہاڑ کی چوٹی کے قریب ایک جھرنا نظر آ جا جس کے پانی کو ایک باؤلی میں باندھ کر لوہے کے ایک بڑے نل سے گزارا دیا تھا۔ اور اب یہ پانی اس نل سے ایک موٹی دھار بن کر آ رہا تھا۔ کئی فوجی گاڑیاں یہاں کھڑی پانی لے رہی تھیں۔ ہم نے یہاں گاڑی روکی۔ خوبانیاں دھو کر کھائیں۔ پانی کیا تھا پگھلی ہوئی برف تھی۔ ٹھنڈا مصفا اور شیریں۔ چاروں طرف کوئی آبادی نہ تھی۔ کوئی گھر نہ تھا۔ بس چیڑ کے درختوں سے مزین جنگل۔ اور ان کے اوپر سورج چمکتا ہوا۔ مگر اتنی بلندی پر اس کی چمک میں کوئی حدت نہ تھی۔

آگے بڑھے تو قریب ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد بھمبر گلی نظر آئی۔ بھمبر کا درہ۔ اس درّے سے دو راستے پھوٹتے ہیں۔ ایک راستہ پونچھ کو جاتا ہے۔ جو ہماری منزل تھی۔ دوسرا راستی مہنڈر کی جانب مڑ جاتا ہے'' گاڑی روکو'' مہندر نے کہا۔

مہندر اور میں دھیرے دھیرے گاڑی سے نکل کر درّے پر کھڑے ہو گئے۔ ایک دوسرے کے قریب۔ بہت ہی تنہا، یادوں کا ایک ہجوم تھا۔ جو غول بیابانی کی طرح بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ ہم چھوٹے سے تھے تو تتا پانی گئے تھے (جو پونچھ سے گیارہ میل دور سہڑا، منڈول، میں اور موجودہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں ہے) اپنی ماں جی کے ساتھ۔ تتا پانی میں کچھ نہیں تھا۔ ایک دھرم شالہ تھی ایک ڈاک بنگلہ تھا۔ اور گرم پانی کا ایک نالہ تھا جو چند سو گز کے فاصلے پر پونچھ کے دریا سے مل جاتا تھا۔ چاروں طرف بے آب گیاہ مغرور پہاڑ کھڑے تھے۔ کسی آتش فشاں سلسلے کی مانند۔ سرلا بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں ہی بھائی تھے جو سخت سردی کے موسم میں بھی دن بھر اس گرم پانی کے نالے میں نہاتے رہتے تھے۔ اس نالے کے کنارے کنارے پگھلی گندھک کا بُو دار مواز رد بالائی کی جھالروں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اور کہیں کہیں اس نالے کی چھوٹی چھوٹی ڈابوں میں پانی کی اندرونی حدت سے اس قدر ابلتا تھا کہ ہم لوگ جب کپڑے کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیوں میں لمبے لمبے چاول باندھ کر ڈال دیتے تو چند منٹ میں وہ چاول

پک جاتے تھے۔ کئی طرح کے درجۂ حرارت رکھنے والے چشمے تھے۔ گرم، معتدل، شدید گر۔ ابلتا ہوا پانی کہ ہاتھ ڈالو تو آبلہ پڑ جائے اور چند سو گز کے فاصلے پر دریائے پونچھ کا پانی برف کی طرح سرد تھا۔ ہمیں بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ ماں جی ہمیں یہاں لے کر آتی تھیں۔ کھانے پینے ار و دیگر رسد کا سامان ہم پونچھ سے لے کر آئے تھے۔ باؤجی ساتھ نہیں آتے تھے۔ انہیں سفر کی صعوبتیں زیادہ راس نہیں آتی تھیں۔ پنجاب بھی وہ ماں جی کی طرح ہر سال ہمارے ساتھ نہیں جاتے تھے پانچ سال کے بعد جاتے تھے اور وہ بھی طوعاً کرہاً۔

دوسرا راستہ مہنڈر کو جاتا تھا۔ اور جب اس دڑے پر کھڑے ہو کر ہماری نگاہ تتا پانی سے مہنڈر کی طرف مڑی تو بے اختیار میں نے اور مہندر نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لئے۔ اور ہر لحظہ یہ گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ کہیں یادوں کے اس ریلے میں ہم کھو نہ جائیں۔

پھر جانے کس وقت گاڑی سے نکل کر سرلا بھی ہمارے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ کیونکہ سرلا مہنڈر میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ یہیں پر اس کا بچپن گزرا تھا۔ باؤجی ڈاکٹر تھے۔ مہنڈر کے مقام پر دو مرتبہ ان کا تقرر ہوا۔ ایک بار جب ہم بچے تھے اور دوسری بار جب ہم جوان تھے۔

اس مہنڈر کی وادی میں مہندر کا پہلا عشق ہوا۔ مہنڈر اور مہندر میں زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ لگتا تھا سامنے کے پہاڑ پھٹ گئے ہیں اور نم آنکھوں سے اس وادی کو دیکھ رہے ہیں۔ سیب کے اس باغ کو جہاں وہ حسین و جمیل ونتی کے ساتھ ٹہلا کرتا تھا۔ کھیلا کرتا تھا۔ ونتی جسے دل ہی دل میں میں چاہتا تھا مگر میں نے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا۔ پہلی بار ایک ہی لڑکی سے ہم دونوں نے پیار کیا۔ ونتی کا نام میں نے نہیں بدلا۔ اس کا نام ونتی ہی تھا۔ اور میرے پہلے ناول ''شکست'' کی جو ونتی ہے یہ وہی ونتی ہے۔ چمپئی رنگ، گدرایا ہوا بدن، کمر اور کولہوں کی زیبائی دلکش، ہنستی تھی تو فضا میں سیب کے پھول کھل جاتے تھے۔ اور گالوں میں گڈھے پڑتے تھے۔ اس لئے وہ اکثر ہنستی تھی۔ اور بات بے بات پر ہنس دیتی تھی۔ اس کی شادی پوٹھاہار کے کسی خاندان میں ہوئی تھی۔ مگر مہنڈر میں اس کا مائیکہ تھا۔ وہ چند مہینوں کے لئے اپنے مائیکے آئی تھی۔ اور محبت کے جال میں اسطرح الجھ گئی تھی جس طرح چنبیلی کی شاخیں ایک دوسرے سے الجھ جاتی ہیں۔ ونتی تو شکست ہی کی ونتی ہے لیکن ''شکست'' کا میں .... میں نہیں ہوں۔ مہندر ہے۔ شاید زیادہ تر مہندر ہے اور کہیں کہیں میں ہوں۔ کسی عجیب کیمیائی عمل سے میں نے دونوں کرداروں کو ملا کر ذہن کی کٹھالی میں ایک نیا مرکب تیار کیا ہے۔ مگر ونتی تو خالص ونتی ہے، جیسی وہ تھی۔ جیسی وہ ہمیشہ رہے گی۔ ''شکست'' میں اگر مہندر کا کردار ہے تو ''یرقان'' کے افسانے میں میرا کردار ہے۔ ان دنوں میں واقعی یرقان کے موذی مرض میں مبتلا تھا۔ اور مہینوں بستر پر لیٹا رہا تھا۔ وہ اکثر مجھے دیکھنے آتی تھی اور میرے سرہانے بیلے کے پھول رکھ جاتی تھی۔ کتنے

برسوں کے بعد بیلے کے ان پھولوں کی مہکتی صدا میرے کانوں میں آرہی تھی۔ چاندی کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ باؤجی کو معلوم تھا کہ ونتی، مہندر سے محبت کرتی ہے، اس لئے جب وہ باغ سے گزرتی تو اس کی جھولی سیبوں سے بھر دیتے تھے۔

پھر وہ دن یاد آیا جب ونتی کو میکے سے سسرال جانا پڑا۔ وہ مجھ سے ملنے آئی تھی اور روز کی طرح اس نے میرے سرہانے بیلے کے پھول رکھ دیئے تھے اور کہا ''میں جارہی ہوں'' جانے کیسے اس سمے میں نے اپنے آنسوؤں کو روک لیا اور مسکرا کر الوداع کہی۔ ان آنسوؤں سے تکیہ تو بعد میں گیلا ہوا تھا۔ مگر وہ اس وقت میرے آنسو نہ دیکھ سکی شاید اس نے وہ آنسو محسوس کر لئے ہوں۔ کیونکہ دیر تک اس کا ہاتھ میری گرم پیشانہ پر لرزتا رہا تھا۔ اور مہندر اسے مہنڈر سے بچی پیر کے میدان تک یعنی کم وبیش سات میل کی دوری تک چھوڑنے گیا تھا۔ اور جب واپس آیا تو اسکی آنکھیں رو رو کر سوجھی ہوئی تھیں۔ اس رات مجھ سے گلے لپٹ کر وہ رویا بھی تھا اور میں اس کا کندھا تھپتھپاتا رہا۔ جانے دونوں چاہنے والوں میں کیا عہد و پیمان ہوئے۔ میں نے مہندر سے کبھی نہیں پوچھا، شاید ونتی نے دوسرے سال کی چھٹیوں میں بھی آنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ مگر وہ نہیں آسکی۔ اس سے پہلے ہی وہ پتہ [illegible] کی کسی ندی میں نہاتے نہاتے ڈوب گئی۔ اور اس طرح مہندر کی پہلی محبت کا ستارہ ڈوب گیا۔

مہنڈر کی اس وادی میں مہندر نے پہلی بار جوانی میں قدم رکھا۔ اب تک وہ دبلا پتلا لڑکا تھا جو اکثر بیمار رہتا تھا۔ پھر یک بیک اسے ورزش کی سوجھی، اور چند سالوں میں وہ کڑیل تنومند جوان بن گیا۔ جس کے بدن کی خوبصورتی کو دیکھ کر رشک آتا تھا۔ اسی مہنڈر کے اسپتال میں وہ دق زدہ عورت آئی تھی، جسے باؤجی نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا۔ اور وہ سپیرین جس کا ذکر ''یادوں کے چنار'' میں ہے۔ اور جس نے باؤجی سے پیار کیا تھا، اور وہ گوریب چٹی پگلی جو کسی کے قابو میں نہیں آتی تھی، باؤجی بڑی محنت سے اس کا علاج کرتے تھے۔ آٹھ دس دن کے بعد جب وہ ٹھیک ہو جاتی تو اس کے رشتہ داروں کو بلوا کر اس کے گاؤں روانہ کر دیتے۔ جہاں سے وہ دو چار دن بعد پھر پاگل ہو کر واپس آجاتی۔ یہ کس طرح کا پاگل پن تھا؟ اس وقت سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آج آتا ہے، کس کس کو یاد کیا جائے؟ یادوں کے اودے اودے انگور ہوا میں جھول رہے ہیں اور ہر انگور کا قطرہ ماضی کی نلکی سے چھن کر مئے ناپ بن گیا ہے۔

سرلا نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا ''جی چاہتا ہے کہ سامنے کے پہاڑ پھٹ جائیں اور مہنڈر کی وادی سامنے آجائے''۔

مہندر نے اپنی بھیگی آنکھیں الٹے ہاتھ سے پونچھیں۔ پھر میرا ہاتھ چھوڑ کر چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

بھمبر گلی سے سرنکوٹ کا راستہ اونچے اونچے پہاڑوں اور چیڑ کے گھنے جنگلات سے ہو کر گزرتا ہے۔
راستے میں آبادی بھی نہیں، کہیں اکادکا گھر نظر آتے ہیں۔ اور پہاڑ کو کاٹ کر چند کھیت اور مکمل سناٹا۔ جیسے فطرت نے سانس روک لی ہو۔ مجھے اور مہندر کو یہ اکادکا گھر بہت پسند تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم لاہور سے پونچھ آتے تو کچھ دنوں کے لئے پک نِک منانے کے لئے جنگل کے ان اکیلے باسیوں کے گھروں میں قیام کرنے کے لئے نکل جاتے، پہاڑوں، جنگلوں، ندی، نالوں، چشموں اور آبشاروں سے محبت، اسی زمانے میں پیدا ہوئی اور انسان نے جنگل کے ساتھ کس طرح اپنا تعلق جوڑا تاکہ جنگل کا نقصان ہونہ اپنا۔ آج یہ بات ہم بھول چکے ہیں اور فطرت کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور اس طرح اپنی تباہی کے سامان پیدا کر رہے ہیں۔ کیونکہ فطرت کے بغیر اور درختوں اور پتوں کے بغیر کھلی صاف ہوا کے بغیر انسان جی نہیں سکتا۔ آج ٹوکیو ایسے متمدن شہر میں ہوا اتنی گندی ہو چکی ہے کہ جاپانی بچے اسکول جاتے ہوئے بھی آکسیجن کا نقاب پہن کر جاتے ہیں۔

مگر اڑتیس برس کے بعد بھی یہاں امن ہے اور چین ہے۔ اور فطرت اپنے پرسکون انداز میں چاروں طرف پھیلی دکھائی دیتی ہے۔ ایک پہاڑ کا موڑ کٹتا ہے تو دوسرا سامنے آجاتا ہے۔ پھر یکایک حیرت انگیز اور چونکا دینے والے انداز میں پہاڑ یکایک پھسل کر ایک خوبصورت وادی کو سامنے لے آتے ہیں۔ یہ سرنکوٹ کا مقام ہے۔ نیم دائرے میں پھیلی ہوئی ایک وسیع آبادی۔ پونچھ کا دریا تین دھاروں میں بہہ کر ایک سنگم بناتا ہوا۔ دریا کے کنارے تک چاول کے کھیت ٹیرس نما کھیتوں کی منڈیروں پر پھل دار درختوں کی گھنی قطاریں کچے کوٹھوں کی چھت پر لال مرچوں کے غالیچے اور آنگن میں مائیں اور بہوئیں گھیرے دار مغلئی شلواریں پہنے کام میں مصروف اور پیڑ اتنے شریر کہ بچوں کی طرح دھوم مچاتے ہوئے دریا کے کنارے تک چلے گئے ہیں۔

سہ پہر ختم ہو رہی تھی۔ درختوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارے قافلے نے سرنکوٹ کے ڈاک بنگلے میں چائے پی اور یہیں پر افسانہ نگار شبنم سرنکوٹی (محمد ایوب شبنم) اور محمد دین بانڈے ایم ایل سی بھی بڑی محبت سے ملے۔

سرنکوٹ جس کا اصلی نام کبھی سورن کوٹ (سنہری وادی) رہا ہوگا۔ پونچھ کی سب سے خوبصورت وادی ہے۔ اور یہ پہلگام سے ٹکر لے سکتی ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے پہلگام سے بہتر ہے کیونکہ یہاں ابھی تک سیاحوں کی آمد و رفت نہیں ہے۔ ایہ ابھی تک اسی طرح صاف و شفاف، دھلی دھلائی، ان چھوئی فطرت کی بہاروں والی وادی ہے۔ جیسے آج سے چالیس برس پیشتر تھی...... کوئی ہوٹل نہیں، کوئی ٹورسٹ لاج نہیں، سیاحوں کی کوئی کھلواڑ نہیں، ٹوٹے ہوئے ڈبے نہیں، بھیک مانگتے ہوئے فقیر نہیں، جیب کاٹنے والے دکاندار نہیں، جسم بیچنے والی قحبائیں

نہیں، فطرت خود دار، آسودہ اور سادہ مزاج ہے۔

چائے پر مہندر جی نے کہا'' آیئے بھائی صاحب اخروٹ کا وہ پیڑ ڈھونڈیں''۔

زیادہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں سمجھ گیا۔ بہت عرصہ ہوا جب ہم بچے تھے تو سرنکوٹ کی خوبصورتی کا حال سن کر ضد پکڑ لی تھی۔ ہم سرنکوٹ جائیں گے۔ سرنکوٹ جائیں گے۔ اس قدر اصرار کیا۔ اتنی ضد کی، ایسے چیخ چیخ کر روئے کہ باؤجی اور ماں جی کو ہمیں پک نِک پر سرنکوٹ لانا پڑا۔ حالانکہ یہ جگہ پونچھ سے صرف سولہ میل کے فاصلے پر ہے۔ مگر میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ باؤجی سفر سے ہمیشہ گھبراتے رہے۔ چاہے وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ مگر آخر ایک دن انہیں ہمارے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ ہمیں سرنکوٹ لے جانے پر مجبور ہو گئے۔

پو پھٹنے سے پہلے ہم پونچھ سے روانہ ہوئے تھے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے سرنکوٹ میں ایک اخروٹ کے گھنے سایہ دار پیڑ کے نیچے کھایا۔ کیا کھایا یہ سب تو یاد نہیں۔ لیکن ماں جی کے ناشتے دان میں کلاڑی کی بھجیا اس قدر لذیر تھی کہ زبان پر آج تک ان کا مزا باقی ہے۔ کلاڑی ایک طرح کی گول روٹی کی مانند موٹی ٹکیا ہوتی ہے۔ جو کا سج پنیر کو سکھا کر بنائی جاتی ہے۔ دیہات کے اکثر گھروں میں یہ پنیر کی روٹیاں ایک موٹی سی رسی سے گزار کر آنگن یا گھر کے اندر ٹانگ دی جاتی ہیں۔ اسے پکانے کے لئے اسے پھر سے پانی میں کئی گھنٹے رکھ کر نرم کرنا پڑتا ہے۔ بعد میں یا تو اسے شوربے کے ساتھ پکایا جاتا ہے۔ یا انڈے کی بھجیا کی مانند۔ مگر بے حد لذیز ہوتی ہے۔ اس دن ہم اسے کھاتے کھاتے مرغی بھی بھول گئے۔ کھانا کھا کے ہم نے اسی پیڑ سے سبز سبز اخروٹ توڑے۔ اور ان کی چھال پتھر سے کوٹ کر علیحدہ کر لی۔ اور پھر اندر سے بالائی ایسے نرم گودے نکال کر کھاتے رہے۔ یہ باؤجی اور ماں جی کی جوانی کا زمانہ تھا۔ باؤجی کی گوری رنگت۔ ماں جی کا گیہواں رنگ۔ باؤجی کی چوڑی پیشانی اور ماں جی کی ممتا بھری بڑی بڑی آنکھیں۔ آج بھی یاد ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے تین بچے تھے۔ میں اور مہندر اور مہندر سے چھوٹا بھوشن جو چھ سال کا ہو کے مر گیا۔ مگر وہ دم کتنا خوبصورت تھا کہ ہم تینوں بھائی دریا کے کنارے کے پتلے پانیوں میں بار بار نہاتے رہے۔ اور ماں جی گھاس کے تنکوں کی پن چکی بنا کر پانی میں چلاتی رہیں۔ آج سب کچھ یاد آ رہا ہے۔ ضرور اس اخروٹ کے درخت کو دیکھا جائے۔ وہ تو ایک تصویر کی طرح ہمارے ذہن میں بلند تھا۔

مگر آج وہ درخت نہیں ملا۔ اخروٹ کے پیڑ کی عمر تو لمبی ہوتی ہے۔ ماں باپ نہیں رہے۔ بھوشن نہیں رہا۔ ایک امید تھی کہ وہ اخروٹ کا درخت زندہ ہوگا تو ہم ایک پل دو پل اس کی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے ماں باپ کو، اپنے بھائی بھوشن کو، اُس پک نِک کے دن کو واپس لے آئیں گے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جو جاتے ہیں وہ واپس نہیں آتے۔ صرف ان کی یادیں شہد کے چھتے کی مانند ذہن کی ٹہنیوں پر لٹکتی رہ جاتی ہیں۔

ایک بار اسکول کے چند لڑکے پک نِک کے لئے یہاں آئے تھے۔ ان دنوں ہم پر کرکٹ کا کھیل سوار تھا۔ ہم نے آٹھ اور نو لڑکوں کو جمع کر کے کرکٹ کی ایک ٹیم بنالی تھی۔ اسے ہسپتالی ٹیم کہتے تھے۔ ہسپتالی ٹیم کے میچ اکثر اسلامیہ اسکول پونچھ یا وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول پونچھ سے ہوتے رہتے تھے۔ مجھے اندھا بلے باز کہتے تھے Blind Hitter اور مہندر اپنی تیز باؤلنگ کے لئے مشہور تھا۔ پک نِک بھی ہوئی۔ میچ بھی کھیلا، دریا کے کنارے گھاس کے ایک خوبصورت قطع میں وکٹیں گاڑھی گئیں۔ اور کھیل شروع ہوگیا۔ کھیل کے بعد کھانا اور کھانے کے بعد دو دو چار چار کی ٹولیوں میں لڑکے بٹ گئے۔ کوئی اوپر پہاڑ کو نکل گیا کسی نے جنگل کی راہ لی۔ کوئی دریا کے کنارے کنارے اوپر چلنے لگا۔ میں نے اور مہندر نے چلتے چلتے پیڑوں جھنڈ سے گھرا ہوا ایک خیمہ ڈھونڈ لیا۔ مگر ہمیں اس خیمے کے نزدیک جانے کی اجازت نہیں ملی۔ ایک باوردی چپراسی نے بتایا کہ پونچھ کے اسسٹنٹ ریذیڈنٹ بہادر پک نِک کے لئے اپنی دو بچیوں کو ساتھ لے کر آئے ہوئے ہیں۔ یہ زمانہ انگریزوں کا تھا اور پونچھ کے راجاؤں نے جو دراصل کشمیر سرکار کے ماتحت تھے۔ لڑ جھگڑ کر یہاں ایک ریذیڈنسی کی شاخ کھلوالی تھی۔ اور اس کے ذریعہ اس علاقے کے سارے بڑے آفیسر پنجاب سے یہاں آئے تھے۔ کشمیر سے نہیں۔

وہ دونوں سفید فام لڑکیاں دریا میں نہا رہی تھیں۔ میں نے اور مہندر نے بیدِ مجنوں کے پیڑوں کی جھکی ڈالیوں سے چھپ کر وہ منظر دیکھا۔ وہ دونوں عمر میں ہم سے بڑی تھیں۔ جوان، حسین، سنہرے بالوں والیاں، اور سرو قد، شاید جل پریاں ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔ اس سے پہلے ہم نے کسی جوان لڑکی کو اس حد تک ننگا نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے ان کے حسن سے بھونچکے رہ گئے۔ اتنی خوبصورت ہوتی ہیں انگریز لڑکیاں۔ ان دنوں ہم پر ہی کیا سب پر گوری رنگت کا رعب طاری تھا اور اس کی فوقیت بھی اس کا Cathersis اس وقت ہوا جب مہندر نے بمبئی میں آ کر مراٹھی لڑکیوں کا حسن دیکھا اور میں نے کیرالہ جا کر وہاں کی سیاہ فام سندریاں دیکھیں۔ یا پھر جمیکا کی حبشی حسینائیں۔ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ حسن رنگت کا محتاج نہیں ہوتا۔ مگر اس وقت تو ہم مبہوت ہو گئے تھے۔ اور بہت دیر تک انگریز لڑکیوں کو نہاتے ہوئے دیکھتے رہے تھے۔

ایک بار اور ہم سرنکوٹ آئے تھے۔ یہ جوانی کا زمانہ تھا۔ تین چار خاندان مل کر پک نِک منانے آئے تھے۔ گیان چند اور دیوان چند، دونوں بھائیوں کے خاندان گوربخش سنگھ کا خاندان اور رام لال مینی کا خاندان۔ اور ہم لوگ۔ کچی پکی۔ کٹھی میٹھی جوانیاں تھیں۔ جذبے کنول کے سایوں کی طرح ذہن پر لرزاں تھے۔ نگاہوں محبت کی نوخیز کلیاں پھوٹی تھیں۔ اور جھجک، گریز، اضطراب، اجتناب، نے رنگ آنچ اور چبھن کے سامان پیدا کر دیئے تھے۔ آج وہ چبھن باقی نہیں ہے۔ جس طرح شرابیں وقت گزرنے کے ساتھ پختہ ہو جاتی ہیں۔ اس طرح یادیں ایام

کے تہہ خانے میں میٹھی ہو جاتی ہیں۔ مجھے مہندر اور بملا کا بار بار ایک دوسرے کو چور نگاہوں سے دیکھنا یاد ہے۔ اور ماں جی کی ڈانٹ۔ ''اونہہ.... چھوٹے کا کا! ادھر لڑکیوں میں مت کھیلو'' ماں جی مجھے بڑا اور مہندر کو چھوٹا کا کا کہتی تھیں۔ آج ماں جی اس جہاں میں نہیں ہیں مگر میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں'' ماں جی! کیا تمہارا چھوٹا کا کا تمہارے پاس ہے؟ کیا وہاں بھی وہ لڑکیوں میں کھیلا کرتا ہے۔ فاسٹ بالر!''

شام کے سائے گھنیرے ہو چلے تھے اس لئے سرنکوٹ میں زیادہ دیر رکنا مناسب نہ سمجھا۔ حالانکہ وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اسلئے پونچھ کی جانب چل پڑے۔ کافی فاصلے تک دریائے پونچھ کی جانب چل پڑے۔ کافی فاصلے تک پونچھ کی خروش روانی ساتھ رہی۔ بیچ ننگالی صاحب کا نالہ پڑا۔ پھر اکا دکا بجلی کے قمقمے نظر آنے لگے۔ اب ہم پونچھ کے مضافات میں تھے۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ جب ہم پونچھ کے ڈاک بنگلے میں داخل ہوئے تو ڈپٹی کمشنر غلام نبی نائیک اور سپرانٹنڈنٹ پولیس ، دیگر عمائدین شہر ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے، پرانے اور نئے ڈاک بنگلہ کے سارے کمرے ہمارے لئے کھول دئیے گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں اوم (میرا سب سے چھوٹا بھائی) اور اس کی بیوی کملا اور کملا کا بھائی پروین کمار مینی اور اس کی بیوی چارو مینی، اروندر جانی اور تلک راج جانی، ارجن ناتھ مصری اور دوسرے احباب بھی آ گئے۔ ہم لوگ دن بھر کے تھکے ہوئے تھے اس لئے مے نام کا شغل مختصر ہی رہا۔ کھانا کھا کے جلد ہی سو گئے۔

صبح جب اٹھا تو مہندر جی مجھ سے پہلے جاگ رہے تھے۔ اور پرانے ڈاک بنگلے کی اس روش پر چہل قدمی کر رہے تھے جو دو طرفہ یوکلپٹس کے پیڑوں سے گھری ہوئی تھی۔ یہ وہی پیڑ تھے جنہوں نے ہمارا بچپن دیکھا تھا، ہماری جوانی۔ اور اب اڑتیس سال کے بعد ہم انہیں دیکھ رہے تھے۔ پیڑ کتنے سربلند اور تناور ہو چکے تھے۔ بچپن میں باؤجی مجھے انگلی سے لگائے اور مہندر کو کندھے پر بٹھائے۔ یہاں رابرٹ کے ساتھ آتے جو عیسائی لیڈی ڈاکٹر کا شوہر تھا۔ اور خود کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ باؤجی شروع سے ہی عجیب وغریب کردار عام نارمل حالات سے ہٹے ہوئے کردار بہت پسند تھے۔ رابرٹ سے ان کی دوستی تھی اور وہ دونوں بچوں کو لے کر ہفتے میں ایک بار اس ڈاک بنگلے تک سیر کرنے کے لئے آتے تھے۔ کیونکہ اس ڈاک بنگلہ کے باغیچے کے پھول دور دور تک مشہور تھے۔

میں اور مہندر کچھ کہے سنے بغیر سحر کے نیم اجالے میں پونچھ کے ڈاک بنگلے سے باہر چل دیئے۔ قریب ہی ہمارا پلے گراؤنڈ تھا۔ وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول کا پلے گراؤنڈ۔ مگر اب اس کھیل کے میدان کے آدھے حصے پر کالج تعمیر ہو چکا تھا اور دریا کی جانب سے پلے گراؤنڈ کے کنارے جو پائین کے پیڑ تھے وہ سب کاٹ ڈالے گئے تھے۔ آگے چلے تو سوچا فوارے والا باغ آئے گا۔ جس کے دو رویہ بلند قامت سرو سربلند ہوں گے۔ سرو تو موجود

تھے مگر باغ تباہ ہو چکا تھا۔

وہ انار کے پیڑ کہاں تھے۔اور وہ ناشپاتیوں کے پیڑ، خوبانی، سیب، پلمپ اور بگو گوشوں کے درخت جن پر ہم پلے گراؤنڈ اآتے جاتے یلغار کرتے تھے اور باغ کے مالی دور دور تک ہمارے پیچھے بھاگتے تھے۔مگر چست لڑکوں کی دوڑ کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔وہ فوارہ باغ جو نشاط باغ کی نقل میں بنایا گیا تھا۔اس کا اب کچھ بھی باقی نہ تھا۔نہ فوارے، نہ ٹینس کورٹ، نہ انگور کی چھتی ہوئی بیلیں کچھ تو باقی نہ تھا۔سنا ہے کہ جب قبائلی ادھر حملہ آور ہوئے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔تو شہر میں ایندھن کی سخت کمی محسوس ہونے لگی۔لوگوں نے مجبور ہو کر تمام باغات کے پیڑ کاٹ کر ایندھن کے لئے چولہے میں جھونک دیئے۔اخروٹوں والی سڑک پر اخروٹ کا ایک پیڑ باقی نہ بچا تھا۔کون جیتا کون ہارا اس کا فیصلہ تو تاریخ کرے گی۔لیکن دوطرفہ درختوں کا جس طرح صفایا اور قتل عام ہوا اس کا فیصلہ کون کرے گا؟

اب ہم ڈیوڑھی سے گزر کر قلعہ مبارک کی طرف جا رہے تھے۔آنکھیں پرنم تھیں۔اس لئے ہم دونوں ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے چلے جا رہے تھے۔قلعہ مبارک سے ذرا پہلے ٹھاکرنین سنگھ کی کوٹھی ہوا کرتی تھی جو پولو کا بہت عمدہ کھلاڑی تھا۔جانے وہ کوٹھی کہاں گئی۔قلعے سے ایک فرلانگ کے بعد چھوٹی سی پہاڑی پر وزیر وزارت کا بنگلہ تھا۔پہاڑی کے نیچے سڑک کے کنارے جس جھرنے کی ہمیں تلاش تھی۔وہ ہمیں مل گیا۔حکومتیں بدلیں۔حالات بدلے۔تاریخ بدلی مگر جھرنا اسی طرح رواں دواں تھا۔ماں جی جب راج محل کو رانی جی کے پاس جاتی تھیں تو اسی جھرنے کا پانی پیا کرتی تھیں اور دربار میں حاضر ہونے سے پہلے باؤ جی بھی یہیں رک کر اس جھرنے کا میٹھا پانی پیا کرتے تھے، آج ماں جی نہیں ہیں۔باؤ جی نہیں ہیں مگر اس جھرنے کی دھار میں ان کا شیریں لمس محسوس کر سکتا ہوں۔جیسے ماں جی میرا منہ چوم رہی ہوں، مہندر اوک بڑھائے اس جھرنے کا پانی پی رہا تھا۔اڑتیس سال کی پیاس آج بجھی ہے۔شاید ن کوئی اس کے کانوں میں کہہ رہا ہے، چھوٹے کاکا، چھوٹے کاکا......!

میں نے مہندر سے کچھ نہیں کہا۔ایسے لمحوں میں کچھ کہنا ایسے لمحوں کی تقدیس کو تباہ کر دینا ہے۔ہم دونوں یہاں سے چپکے چپکے واپس ہو لئے۔پھر وہی قلعہ وہی ڈیوڑھی۔وہی پلے گراؤنڈ وہی ڈاک بنگلہ۔مہندر چپکے سے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔میں اپنے کمرے میں۔آدمی بچپن سے بڑھاپے تک جانے میں ساٹھ برس لیتا ہے۔مگر ہم نے بڑھاپے سے بچپن تک جانے میں صرف ساٹھ منٹ لئے تھے۔

ناشتے کے بعد بہت سے لوگ ملنے کے لئے آ گئے۔درشن سنگھ اکالی، خواجہ منیر حسین میر، ڈاکٹر نذیر حسین، ڈاکٹر بھٹی، سردار بدھ سنگھ، بشیر احمد شیخ، خزان چند وکیل، تحصیلدار غلام محمد گگڑو، چوہدری بدری ناتھ، منموہن سنگھ، سکھ راج بالی، مہتہ راجا رام، خواجہ غلام قادر بانڈے، جہانگیر میر، بابو ہری کرشن رینہ اور دوسرے بہت سے نئے

پرانے چہرے اسکول اور کالج بند تھے۔ مگر ہمارے یونٹ کی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی اور لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ ڈاک بنگلے کے سارے لان ان لوگوں سے بھر چکے تھے۔ گوری دت رینہ، مہندر جی کا تعارف ان کے پرانے ساتھیوں سے کرا رہا تھا۔ لوگ آنکھوں میں خوشی کے آنسو لئے گلے مل رہے تھے۔ زور زور سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ کمر میں ہاتھ ڈال کر بغلگیر ہو رہے تھے۔ جیسے اڑتیس برس کی جدائی چند لمحوں میں ملیامیٹ کر دینا چاہتے ہوں۔

کچھ دیر کپور صاحب نے ہماری شوٹنگ ڈاک بنگلے میں جہاں ہم اسکول اور کالج کے دنوں میں ٹھاکر موہن سنگھ اور ٹھاکر سکھ چین سنگھ کے ہمراہ پلے گراؤنڈ میں کھیلنے کے بعد آتے تھے۔ یہ دونوں ٹھاکر بچے راجہ صاحب والیٔ ریاست کے قریبی رشتہ دار تھے۔ اس لئے ان کی وجہ سے ہمارے لئے ڈاک بنگلے کا ایک کمرہ کھول دیا جاتا۔ یہاں ہم قریب کے ڈونگس کے چشمے کا پانی منگواتے اور لیموں کا شربت پیتے یا لیمونیڈ۔ پھر گراموفون کے ریکارڈ بجائے جاتے۔ مہندر کو گانے کا بہت شوق تھا اور وہ بہت اچھا گاتا بھی تھا۔ سہگل اکثر ریکارڈ بجائے جاتے اور جانکی بائی آگرے والی اور کالو قوال، ٹھاکر موہن سنگھ کو فلم لیلیٰ مجنوں کے گانے بہت پسند تھے، جنہیں ماسٹر نثار اور مس کجن نے گایا تھا۔ کبھی کبھی ہم چاروں اصطبل سے گھوڑے نکلواتے، خوبصورت بے صبر گھوڑے، میں تو گھوڑے پر چڑھنے سے ہمیشہ ڈرتا تھا۔ مگر ٹھاکر موہن سنگھ، مہندر اور سکھ چین اچھے شہسوار تھے۔ وہ اکثر گھوڑے دوڑاتے ہوئے ننگالی صاحب کے نالے تک چلے جاتے تھے۔ میں صرف ڈاک بنگلے تک آتا تھا اور یہاں ان کی واپسی کا انتظار کرتا تھا۔ مہندر کو سب کچھ یاد آ رہا تھا، کہہ رہا تھا ''بھائی صاحب موہن سنگھ کس غضب کا کھلاڑی تھا ٹینس کا۔ فوارے والے باغ میں راجا صاحب کا ٹینس کورٹ تھا۔ اس میں ٹھاکر موہن سنگھ راجا صاحب کے ساتھ ٹینس کھیلا کرتا تھا اور ہم لوگ کورٹ کے قریب کرسیوں بیٹھے تکا کرتے تھے۔ ہمیں ٹینس کورٹ میں کھیلنے کی اجازت نہیں تھی، اس کورٹ میں صرف شاہی خاندان کے افراد کھیل سکتے تھے، موہن سنگھ بہت عمدہ شکاری بھی تھا۔ اس نے مہندر کو بندوق چلانا سکھایا۔ مہندر جنگل میں اڑتے ہوئے تیتر اور جھیل سے اٹھتی ہوئی مرغابی کو اپنے نشانے سے گرا لیتا تھا۔ جبکہ میرا نشانہ مرغابی یا تیتر سے سوفٹ دور نکل جاتا تھا۔ اور بندوق کے فائر کے دھچکے سے کندھے میں شدید درد ہوتا تھا۔ مہندر نے ان دنوں کی یاد سے محظوظ ہو کر میری طرف سے مسکرا کر کہا'' آج پھر ٹھاکر موہن سنگھ کے ساتھ شکار پر جانے کو جی چاہتا ہے۔ مگر ٹھاکر موہن سنگھ ہے کہاں؟ جنت کی کسی وادی میں فرشتوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہا ہوگا''، میں نے مہندر سے کہا۔ اور مہندر کا چند لمحوں کے لئے افسردگی کے غبار میں کھو گیا۔

شوٹنگ دیکھنے کے لئے بھیڑ لگ گئی تھی اور ہماری حفاظت کے لئے چند فوجی تعینات کر دیئے گئے

تھے۔مگر یہاں ہمیں کس سے ڈر تھا سب اپنے تھے۔سب سلیقے اور قاعدے سے شوٹنگ دیکھ رہے تھے۔مدھوسودن اور مہندر ایک دوسرے سے مختلف شاٹ کے متعلق مشورہ کرتے ہوئے ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ہر شاٹ میرے، مہندر اور سرلا کی زندگی کا ورق تھا۔ورق الٹتے الٹتے ہم ڈاک بنگلے سے نکل کر پریڈ گراونڈ کے میدان میں پہنچے۔یہاں ہر روز ٹھیک بارہ بجے توپ داغی جاتی تھی۔اب تو وہ توپ خانہ یہاں...... ہاں جیل موجود ہے۔اور وہیں موجود ہے کہ جہاں وہ تھا۔وہیں ڈاک خانہ ہے۔وہیں پولیس لائنز۔وہی اسپتال کو جاتی ہوئی درختوں سے گھری ہوئی سڑک ہے۔اب ہم اسپتال کے برآمدے میں آپہنچے ہیں۔ارے۔یہ تو سپتال ہے،وہی اس کا چھتا ہوا برآمدہ، برآمدے کے سامنے وہی پھولوں سے بھرا ہوا غالیچہ،اس برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر بائیں طرف باؤ جی کھلے میں ایک میز کے سامنے بیٹھا کرتے تھے۔مریضوں کو دیکھنے کے لئے۔ایک عجیب شوق اور اضطراب کے عالم میں ہم تینوں بھائی اس چھتے ہوئے برآمدے کی جانب بڑھ گئے۔جب سب کچھ وہی ہے تو پتا جی بھی وہیں ہوں گے۔میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے نسخے لکھتے ہوئے مریضوں کو دیکھتے ہوئے،کبھی کبھی کچھ گنگناتے ہوئے۔گورا چہرا، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑی پیشانی، اور ہاتھ بالائی سے بھی زیادہ نرم...... اور آگے بڑھتے تو عجیب دھچکا سا لگا۔وہاں تو کوئی اور ہی ڈاکٹر بیٹھا تھا۔دریائے پونچھ کے دونوں کناروں کے بیچ بہت سا پانی بہہ گیا تھا۔اور کتنی ہی پرانی تصویریں بہا لے گیا تھا۔

''یہ ہیں ڈاکٹر شرما'' ایک آواز آئی۔

مہندر نے ہاتھ ملایا۔میں نے بھی۔چند لمحے تو ہم ساکت سے کھڑے رہے۔نوجوان اور ہنس مکھ ڈاکٹر تھا جیسے کسی زمانے میں میرے والد رہے ہوں گے۔شرما جی اپنے علاقے کے بہترین پلاسٹک سرجن مانے جاتے ہیں۔ان کی بیوی اوما شرما بھی ڈاکٹر ہیں۔

ہسپتال میں کافی بھیڑ ہوگئی تھی۔اسکول اور کالج کے بہت سے لڑکے اور لڑکیاں جمع ہو گئے تھے۔اور اپنا تعارف خود کرا رہے تھے۔یا میرے چھوٹے بھائی اوم کا بڑا لڑکا ملکی اور اس کی بہن انیلا ان کا تعارف ہم سے کرا رہی تھی۔معزز شہریوں میں سے اس وقت کچھ نام یاد آرہے ہیں۔ڈاکٹر سرون ناتھ آفتاب، کرشن لال گپتا، چمن لال در، سجاد حسین، ششی بھوشن شرما، مہتہ بھگوان داس، شہزاد حسین، عبدالعزیز مستری، سردار نند سنگھ، اودھم سنگھ، سردار سنگھ، چوہدری بدری ناتھ، خواجہ غلام محی الدین، اے سی سیوا سنگھ، ارجن ناتھ مصری اس موقعہ پر بھی خاص طور سے اپنی دکان سے پان بنوا کر لائے تھے۔جتنے دن ہم پونچھ میں رہے مصری صاحب مفت سوڈا اور پان سے ہماری تواضع کرتے رہے۔ان کی دکان پروین کمار مینی کی دکان کے بالکل سامنے ہے۔میرے بچپن کے زمانے میں یہ دوکان

کتابوں اردو کاپیوں کی ہوا کرتی تھی۔ اور دیوالی اور دسہرے کے دنوں میں ہم یہاں سے پٹاخے اور پھلجڑیاں خریدا کرتے تھے۔

ہسپتال میں شوٹنگ کے بعد ہم پا پیادہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ دائیں طرف سے ایک پگڈنڈی گھوم کر اوپر ایک تلہٹی میں جاتی تھی۔ سب سے اوپر چیف میڈیکل آفیسر رام گوپال ماتھر کا گھر ہوا کرتا تھا۔ نیچے ... دونوں بنگلے گھنے باغات سے گھرے ہوئے تھے۔

کسی گائیڈ کی مدد کے بغیر ہم چاروں۔ میں مہندر اوم اور سرلا اُدھر چلے گئے۔ جدھر بچپن، لڑکپن اور جوانی کے خوبصورت ایام بیتے تھے۔ ہاں وہی گھر ہے۔ وہی دیوار ہے۔ دیوار سے اوپر اٹھا ہوا وہی خوبانی کا پیڑ ہے۔ یا شاید کوئی دوسرا ہے۔ جوں جوں ہم گھر کے قریب پہنچتے جاتے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی۔ اب مُڑ کی دیوار مڑنے کو ہے۔ موڑ کے بعد گھر کا دروازہ آئے گا۔ موڑ پر رک کر میں نے مہندر سے کہا ''یاد ہے مہندر اس کونے پر دیوار سے لگ کر تم پتھروں سے کھیلا کرتے تھے۔ اور جب میں اسکول سے واپس آتا تھا۔ تو تمہیں یہاں اس جگہ انگور کے بیل کے نیچے محوِ گفتگو پاتا تھا۔ وہ انگور کی بیل اب نہیں رہی۔ مگر گھر کا دروازہ تو وہی ہے۔'' دل کی عجیب حالت تھی۔ اچانک ہم دروازے سے چند قدم پہلے رک گئے۔ اور عجیب محویت کے عالم میں کھلے دروازے کی طرف تکنے لگے۔ وقت پیچھے کو لوٹ گیا تھا اور ہر دم یہ محسوس ہورہا تھا کہ ابھی گلابی کنارے والی کریم رنگ کی ساڑھی پہنے ماں جی اس دروازے سے برآمد ہوں گی اور کہیں گی ''اتنے برس کہاں رہے بڑے کاکا۔ چھوٹے کاکا، سرلا۔ اور اوم کہاں تھے تم۔ چلو جلدی اندر آجاؤ۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ میں نے تمہارے لئے مکھن اور شہد بھرے پراٹھے تیار کئے ہیں۔ ایک ایک گلاس مٹھے کا بھی پی لو''۔ ہم چاروں کو ماں جی کے ہاتھ کے بنے ہوئے پراٹھے بہت پسند تھے۔ جن پر آدھ انچ سے زیادہ مکھن کی تہہ جما کر وہ اس پر شہد انڈیل دیتی تھیں۔

مگر ادھ کھلا دروازہ کھلا ہی رہا۔ ماں جی اس دروازے سے باہر نہ آئیں۔ ہم لوگ اک دھچکے سے ماضی سے حال میں آگئے اور دروازے کے اندر چلے گئے۔ وہی آنگن تھا۔ مگر اب اس آنگن میں بمباری سے بچنے کے لئے ایک بنکر بھی بنا دیا گیا تھا۔ شہد میں زہر گھل گیا تھا۔ پہاڑ کی ایک چوٹی پر اگر پاکستانی فوج تھی تو بالمقابل دوسرے پہاڑ کی ایک چوٹی پر ہندوستانی چوکی تھی اور ہم دونوں چوکیوں کو ساتھ ساتھ دیکھ سکتے تھے۔ اس قدر قریب تھی باہمی نفرت!

ڈاکٹر شرما دکھانے لگے تو مہندر نے بے قرار ہو کر کہا ''آپ نہ دکھایئے۔ سنیے یہاں ماں جی کی رسوئی تھی۔ مہندر نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

ڈاکٹر شرما بولے ''آج بھی ہم لوگوں کی یہی رسوئی ہے''

ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے مہندر نے کہا ''اور یہ باتھ روم ہونا چاہیے''۔

''ہاں'' ڈاکٹر شرما بولے'' یقیناً اب بھی یہی باتھ روم ہے''۔

پھر ہم اندر کے تین کمروں میں گئے، جی چاہتا تھا کہ ماں جی کو آواز دوں۔ باؤ جی کو آواز دوں۔ مرحوم بھائی بھوشن کو بلاؤں۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ پھر چوتھے کمرے کی طرف چلے گئے جو ہمارا اسٹڈی روم تھا اور جس کا ایک دروازہ باہر باغ میں کھلتا تھا۔

اس دروازے سے باہر گئے۔ کدھر گئیں وہ سیب کے پیڑوں کی قطاریں۔ کدھر گیا وہ باغ...... چاروں طرف پھیلا ہوا جس میں ہمارے بچپن کی شرارتیں بکھری تھیں۔ معلوم ہوا کہ قبائلی حملے کے دوران یہ باغ بھی کاٹ ڈالا گیا۔

ڈاکٹر شرما بولے'' یہاں پھر سے باغ لگایا جائے گا، میں نے دہلی سے تین سو پودے منگوائے ہیں''۔

گھوم گھام کر ہم پھر بے اختیار رسوئی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر شرما کی بیوی اوما شرما میں دیکھ کر مسکرا رہی ہیں مگر ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ عالم رویا میں ماں جی رسوئی میں بیٹھی چار تھالیوں میں ہمارے لئے کھانا پروس رہی ہیں۔ ایک کونے میں نوکر برتنوں سے کچھ کھڑ پڑ کر رہا ہے۔ حالانکہ اس وقت دو پہر ہونے کو ہے۔ لیکن چشم تخیل میں شام ہو گئی ہے۔ رسوئی میں لالٹین جگ رہی ہے۔ ماں جی سر پر پلو ڈالے طلائی چوڑیوں سے بھری کلائی والے ہاتھ سے پانی کے گلاس رکھتی ہیں۔ کھانے کو کہتی ہیں۔ مگر ہم ضد کرتے ہیں، ہمیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤ ماں جی۔ ماں جی پہلے تو ڈانٹتی ہیں پھر ممتا بھرے جذبے سے سرشار ہو کر کھانے کے پہلے لقمے تیار کرتی ہیں۔ چڑیا کے بچوں کی طرح ہم باری باری اپنا منہ کھول دیتے تھے اور وہ اس لقمہ ڈال دیتی تھیں کتنا مزے دار، کتنا میٹھا، کتنا لذیز ہوتا تھا وہ لقمہ۔ حالانکہ وہی روٹی تھی، وہی دال تھی، وہی آلو، وہی گوبی، وہی مٹر گوشت، مگر جانے کیا بات ہے اپنے ہاتھ سے کھانے میں وہ مزا نہ تھا جو ماں جی کے ہاتھ سے کھانے میں تھا۔ اور بہت دیر کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی۔ کہ مائیں اپنے پیارے بچوں کے لئے کھانا پکاتی ہیں تو وہ ہر سالن میں اور ہر روٹی میں ہر ٹکڑے میں اپنی محبت سے مٹھاس بھر دیتی ہیں۔ کھانا تو تاج انٹر کانٹی نینٹل اور فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی عمدہ ملتا ہے۔ مگر وہ آگ پر پکایا جاتا ہے اور یہ روح کی مدھم مدھم آنچ پر تیار ہوتا ہے۔

سرلا رو رہی تھی۔ مہندر جی دم بخود تھے۔ اوم آبدیدہ۔ اس وقت سب نے ہمیں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ جیسے ہم کسی غیر مرئی ہستی کے روبرو پیش ہوں۔ ماضی سے آنے والی ہواؤں میں ماں جی کے آنچل کی خوشبو تھی۔

دوسرے دن علی الصبح میں اپنے محترم دوست دیانند کپور سے ملنے گیا۔ ان کا گھر ڈاک بنگلے کی سڑک پار

کر کے دریا کے قریب ہے۔ اس سے پہلے ان کا گھر کشمیری محلے میں ہوا کرتا تھا۔ اور شری رام لال مینی مرحوم کی دکان کے قریب ان کی کتابوں کی دوکان تھی۔ مگر میں نے دیانند کپور کو کبھی اپنی دکان پر کچھ بیچتے نہیں دیکھا۔ مقامی شعراء اور ادیبوں کا ان کی دکان پر جمگھٹا رہتا تھا۔ ان کی دوکان پر ہی میری ملاقات پہلی بار چراغ حسن حسرتؔ مرحوم سے ہوئی۔ دیانند جی سے میں اور مہندر ادبی رسالے پڑھنے کے لئے مانگ کر لے جاتے تھے خصوصاً ''مستانہ جوگی'' اور ''مانسرور'' رسالے کو ہم دونوں بھائیوں نے اس لئے پڑھنا شروع کیا کہ اس کے ایڈیٹر کا نام گوری شنکر لال اختر تھا اور ہمارے باؤجی کا نام بھی گوری شنکر تھا۔

کپور صاحب کے ہاں چائے پی۔ گزری ہوئی باتوں کی یاد تازہ کی۔ اور انہیں شام کے لئے شوٹنگ میں شریک ہونے کی دعوت دے کر چلا آیا۔ واپس آیا تو معلوم ہوا کہ کئی گھروں سے ناشتہ آچکا ہے۔ پونچھ کی دو چیزیں بہت مشہور ہیں۔ مکی اور موٹھی۔ چنانچہ ناشتے پر دونوں چیزیں موجود تھیں۔ مکی کے ٹوڈھے مکی کے پراٹھے۔ موٹھی کا سالن اور کئی قسم کے ساگ۔ گیسٹ ہاؤس والوں نے نان وتیج ناشتہ تیار کیا تھا مگر ہم لوگ تو مکی کے پراٹھوں اور موٹھی پر بری طرح گرے۔

اتنے میں کیپٹن اروڑہ بھی آگئے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ صاحب اُردو کے مشہور نقاد مالک رام کے قریبی رشتے دار ہیں اور چونکہ ایک ادبی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اسلئے اُردو شعر و شاعری سے بے حد شغف ہے۔ ہزاروں شعر زبانی یاد ہیں۔ جنہیں ایک فوجی کے منہ سے سن کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ یہ مجھے۔ مہندر۔ سلمیٰ، کملا، ملکی اور انیلا کو اپنے ساتھ موتی محل لے گئے جو کبھی راجگان پونچھ کا خاص محل تھا۔ میں نے وہ کمرہ بھی دیکھا جو راجہ بلدیو سنگھ کی خواب گاہ رہ چکا تھا۔ آج بھی اس کمرے میں راجہ بلدیو سنگھ کا ہی پلنگ بچھا ہوا تھا۔ جس کی مچھر دانی کے پیتل کے چوکھٹ پر پیتل کے ہی حروف میں انگریزی میں B.S لکھا ہوا ہے۔

میں نے کپتان صاحب سے کہا ''راجہ بلدیو سنگھ بڑی آن والا راجا تھا، ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا''

کیپٹن صاحب ہنس پر بولے ''صاحب آج بھی اس کی یہی حالت ہے''

''کیا مطلب؟'' مہندر نے پوچھا۔

کیپٹن صاحب ہنس کر بولے ''ایک دن میں رات کو اس پلنگ پر سو گیا۔ دوسری صبح میں نے اپنے آپ کو پلنگ کے بجائے فرش پر سوتا ہوا پایا''۔

''نہیں نہیں''

''نہیں۔ واقعی سچ کہتا ہوں''

میں نے کہا ''ممکن ہے کسی نے آپ سے مذاق کیا ہو اور سوتے میں آپ کو بستر سے اٹھا کر فرش پر ڈال دیا ہو''

''اب حقیقت جو بھی رہی ہو'' کیپٹن اروڑہ بولے ''واقعہ یہی ہے۔ جو میں نے بیان کیا۔ اس واقعہ کے چند ہی روز بعد ہمارا ایک دوست میجر اس پلنگ پر سو گیا۔ رات کو اس کے لحاف میں آگ لگ گئی۔ خود بخود۔ اور وہ جلتے جلتے بچا''۔ مہندر نے کہا ''ممکن ہے میجر صاحب شراب کے نشے میں اپنا جلتا ہوا سگریٹ بجھانا بھول گئے ہوں''

کیپٹن اروڑہ بولے ''آپ اس کی توجیح جس طرح چاہیں کر لیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اب اس بستر پر رات کے وقت کوئی نہیں سوتا۔'' سلمٰی بولیں ''کیپٹن صاحب! یہ دونوں بھائی دہریے ہیں۔ یہ تو نہیں مانیں گے۔ لیکن میں ان باتوں کو مانتی ہوں۔ ابھی اس دنیا میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کی سائینسی توجیح محالم ہے''۔

موتی محل سے واپس آئے۔ تو قلعہ مبارک کے علاوہ شہر کے مختلف مقامات پر شوٹنگ کرتے رہے۔ لنچ سے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے واپس ڈاک بنگلے پہنچے۔ تو لڑکے لڑکیوں اور پرانے دوستوں اور نئے چہروں کا ایک ہجوم تھا۔ ماسٹر دینا ناتھ رفیق بھی ملنے کے لئے آ گئے تھے۔ جنہوں نے اسکول میں مجھے اور مہندر کو پڑھایا تھا۔ ہم دونوں نے ان کے پاؤں چھوئے۔ ماسٹر جی بناوٹی غصے سے ہاتھ اٹھا کر بولے ''دوں ایک چانٹا؟ کہاں گم رہے اتنے دن.......'' پھر ایک دم ہنس پڑے اور ہم دونوں کو گلے سے لگا لیا۔ اس ہجوم میں سائیں داس جی بھی تھے جو اپنی بیوی کے ساتھ ہمیں دیکھنے آئے تھے۔ سائیں داس جی باؤ جی کے کمپاؤنڈر ہوا کرتے تھے۔ مسز سائیں داس بولیں ''تم دونوں اتنے چھوٹے سے تھے'' وہ اپنے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر بولیں ''اور میرے گھر آ کر میری رسوئی میں شوق سے میرے ہاتھ کا کھانا کھایا کرتے تھے۔ میرے گھر کی مکی کے ٹوڈھے تمہیں بہت پسند تھے''۔ پھر اپنے ساتھی مہتہ راجہ رام ملے۔ ماسٹر محمود الحسن، راجندر سنگھ، بابو نکو رام بنوترہ، پرسو رام گھئی، ترلوک ناتھ بھسین، چودھری پھمن داس کپور اور رتن لال کپور اپنے ہم جماعت ٹھاکر پنجاب سنگھ اور ہربنس لال ٹنڈن۔

کالج کے بہت سے لڑکے اور لڑکیوں نے فرمائش کی کہ ان کے ساتھ تصویر کھنچوائی جائے چنانچہ ان لوگوں کے ساتھ شوٹنگ ہو گئی۔ شوٹنگ کے بعد ایک شوخ و شنگ حسینہ شانوں پر بال بکھرائے ہماری طرف بڑھی اور بولی۔

''مجھے افسانے لکھنے کا بہت شوق ہے، میں کیسے اچھی افسانہ نگار بن سکتی ہوں''؟

پیشتر اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا مہندر جی مسکرا کر بولے

''دیکھئے ایک اچھی افسانہ نگار بننے کے لئے آپ افسانے تو کرشن جی کے پڑھا کیجئے لیکن خط مجھے لکھا

کیجئے''۔

اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا مگر وہ لڑکی ذرا بھی نہیں جھینپی فوراً بولی۔

''اچھا چاچا جی''

اس پر وہ قہقہے بلند ہوئے کہ کچھ نہ پوچھئے، سلمیٰ نے اس لڑکی کی پیٹھ تھپک کر کہا'' اب آپ کو کسی سے افسانہ نگاری کے گُر سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے''۔ کچھ دیر سرجن کلدیپ چندر شرما، شری شام لال نائب تحصیلدار، چوہدری جیال لال سوری اور چوہدری مہیشر ناتھ کپور سے باتیں ہوتی رہیں۔ پھر لنچ کا وقت ہو گیا، شام کو پانچ بجے گیتا بھون میں شہریوں نے ایک جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ اوراس سے پہلے چار بجے کے قریب ہمیں ایک جلوس کی صورت میں بازار سے گیتا بھون لے جایا جائے گا۔ سب پروگرام طے کر کے یہ لوگ رخصت ہوئے تو ہم نے لنچ کیا۔ پھر پونے چار بجے گاڑیوں میں سوار قلعہ مبارک پہنچ گئے۔ وہاں سینکڑوں شہری استقبال کے لئے موجود تھے۔ جلوس چلا تو فضا کرشن چندر زندہ باز۔ مہندر ناتھ زندہ باد۔ سرلا دیوی زندہ باد۔ سلمیٰ صدیقی زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ ہمیں ہاروں سے لاد دیا گیا۔ رادھا رام ٹی اسٹال سے لے کر پروین کمار مینی کی دکان تک سارا بازار دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ اور چپے چپے پر خوشنما ڈیوڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق ایک سو پچاس ڈیوڑھیاں سجائی گئی تھی۔ جہاں ہم سب کو روک کر ہار پہنائے جاتے تھے۔ اور شری اندراج شرما اور لالہ ہنس راج ، وجے گپتا اور ست دیو گپتا کمار صاحب اپنے اپنے کیمروں سے فوٹو لئے جا رہے تھے۔ بہت کم وقت میں لوگوں کو اطلاع دی جاسکی۔ پھر بھی گیتا بھون میں سینکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے جناب محمد دین بانڈے نے تقریر کی۔ پھر ہمارے محترم استاد دینا ناتھ رفیق نے ایک نظم پڑھی۔ ارجن ناتھ مصری نے ایک گیت سنایا۔ پھر مہندر جی نے ایک جذباتی تقریر کی۔ میں نے بھی۔ مگر سرلا تو جذبات میں اس قدر ڈوب چکی تھی کہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ درگا بھی خاموش رہی۔ صنفِ نازک کی نمائندگی سلمیٰ نے کی۔ اور لوگوں کو بتایا کہ جب یہ دونوں بھائی بیمار ہوتے ہیں تو مرنے سے پہلے پونچھ کے درشن کرنے کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔ اور اب جب کہ میں پونچھ کے لوگوں کی محبت اور یہاں کے علاقے کی خوبصورتی دیکھی ہے تو میں یہ سمجھتی ہوں کہ ان کا تذکرہ بے جا نہیں تھا۔ سلمیٰ تو زبردست مقرر ہیں اس لئے انہوں نے ایک ہی تقریر میں اہل پونچھ کے دل جیت لئے۔

جلسے کے خاتمے کے بعد چائے مٹھائی سے تواضع ہوئی۔ اس چائے پارٹی میں کوئی اڑھائی تین سو افراد شریک تھے۔ پھر جب شام ڈھلنے لگی اور رات بڑھنے لگی تو ہم لوگ چائے کی پارٹی سے فارغ ہو کر پا پیادہ شری پروین کمار مینی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے جہاں رات کا کھانا تھا۔ یہ گھر کملا کا مائیکہ ہے جو میرے سب سے

چھوٹے بھائی اوم کی بیوی ہے۔ کملا کی بڑی بہن بملا سے مہندر جی کی شادی کی بات چلی تھی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے۔ اور دونوں خاندان کے افراد میں میل ملاپ بھی تھا۔ اور اس امر کی زبردست خواہش بھی تھی کہ مہندر اور بملا کی شادی ہو جائے لیکن زبردست خواہش اور اصرار کے باوجود یہ شادی نہ ہو سکی۔ کیونکہ بملا ایک امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔، اور مہندر جی اُردو کے فری لانس ادیب بننے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یعنی انہوں نے ادب کے لئے غریبی قبول کرتے ہوئے اپنی محبت قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ راستے بھر خزان چند جی شکایت کرتے رہے۔ دیکھئے کل شام آپ نے سردار بدھ سنگھ کے ہاں چائے کی دعوت قبول کر لی۔ وہاں آپ کے والد کے دوست سردار سنت سنگھ تھے۔ سردار بدھ سنگھ تھے۔ آپ کے دوست سردار گوربخش سنگھ کی ہمشیرہ موجود تھی۔ سردار بدھی سنگھ کی بڑی لڑکی جوراجوری میں لیڈی ڈاکٹر ہے اور اس کی چھوٹی بہن جو یہاں کالج میں پڑھتی ہے۔ وہ موجود تھی۔ اور آپ کا سارا خاندان اس چائے پارٹی میں موجود تھا۔ مگر آپ نے میرے گھر کا کھانہ قبول نہیں کیا۔ حالانکہ آج رات آپ پروین کے ہاں کھانا کھا رہے ہیں۔ مہندر ناتھ نے معذرت کرتے ہوئے کہا ''بھائی صاحب اس وقت تو ہم صرف تین دنوں کے لئے پونچھ آئے ہیں مگر اگلے سال تیس دن کے لئے آنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ پھر ہم آپ کے ہاں ایک دن نہیں سات دن کھانا کھائیں گے۔ اس بار معافی دے دو بھائی صاحب'' خزان چند جی نے مہندر کو گلے سے لگایا۔ شکایت ڈھل گئی۔ پروین کے گھر میں بڑی رونق تھی۔ شہر کے عمائدین، ہندو، مسلم، سکھ سبھی حضرات موجود تھے۔ چاروں، کملا، انیلا اور پروین کی ماتا جی بھی اصرار سے سب کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ مہندر ایک پلیٹ میں کھانا ڈال کے پلیٹ اٹھا کے کھانے کے کمرے سے باہر آ گیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ یادوں کے آنگن میں وہ اس وقت اکیلا کھڑا ہے۔ اور ماضی کی تمام نا آسودہ آرزوئیں اپنا آنچل پھیلائے اس کے سر پر سایہ فگن ہیں۔ کیا سوچ رہے ہو مہندر گیا وقت واپس نہیں آتا۔ بملا بیوہ ہو چکی ہے۔ اب تو اس کی یادوں کا سہاگ بھی لٹ چکا ہے۔ اور اب بھی وہ اتنی اکیلی ہے کہ جتنے اکیلے تم ہو۔ اس راکھ کو مت کریدو۔ شاید کسی چنگاری سے تمہاری روح جل جائے........! آنگن میں شور ہے۔ صحن میں شور ہے۔ کھانے کے کمرے میں شور ہے۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے۔ پونچھ سے واپسی پر آپ کو سرنکوٹ میں دو گھنٹے کے لئے رکنا ہوگا۔ مہندر جی نے ہم سے وعدہ کر لیا ہے۔ مہندر جی نے ہم سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اگلے سال سرنکوٹ میں چھ مہینے رہ کر آپ کی سوانح حیات لکھیں گے .... کچھ عورتیں کھلکھلا کر ہنس رہی ہیں۔ چمچے کھنک رہے ہیں۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں........ مہندر یادوں میں گھرا اکیلا کھڑا ہے۔ قریب ایک ماہ کی شوٹنگ کے بعد کشمیر کے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے ہم لوگ واپس بمبئی آ گئے ☆☆☆

کالو بھنگی

کرشن چندر

میں نے اس سے پہلے ہزاروں بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا ہے لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رک گیا ہے کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے ، سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہیں دیتی جس سے دلچسپ افسانہ مرتب ہوسکتا ہے۔ دلچسپ ہونا تو درکنار، کوئی سیدھا سادا، بے کیف و بے رنگ، بے جان مرقع بھی تو نہیں لکھا جا سکتا، کالو بھنگی کے متعلق پھر نہ جانے کیا بات ہے، ہر افسانے کے شروع میں میرے ذہن میں کالو بھنگی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مسکرا کے پوچھتا ہے ''چھوٹے صاحب مجھ پر کہانی نہیں لکھو گے؟''

کتنے سال ہو گئے تمہیں لکھتے ہوئے؟''

''آٹھ سال''

''کتنی کہانیاں لکھیں تم نے؟''

''ساٹھ اور دو باسٹھ''

''مجھ میں کیا برائی ہے چھوٹے صاحب۔ تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمہارے ذہن کے ایک کونے میں مدت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔ چھوٹے صاحب، میں تو تمہارا پرانا حلال خور ہوں۔ کالو بھنگی، آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟''

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے کالو بھنگی کی کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا اسکے متعلق۔ یہ نہیں کہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی نہیں چاہتا، دراصل میں کالو بھنگی کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مدت سے کر رہا ہوں۔ لیکن کبھی لکھ نہیں سکا۔ ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا۔ اس لئے آج تک کالو بھنگی

اپنی پرانی جھاڑو لئے ، اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے لئے ، اپنے پھٹے پھٹے کھردرے بدہیئت پاؤں لئے ، اپنی سوکھی ٹانگوں پر ابھری دریدیں لئے ، اپنے کولہوں کی ابھری ابھری ہڈیاں لئے ، اپنے بھوکے پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لئے اپنے مرجھائے ہوئے سینے لئے ، اپنے بھوکے پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لئے اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر گرد آلود بالوں کی جھاڑیاں لئے ، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں ، پھیلے پھیلے نتھنوں ، جھریوں والے گال اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں کے اوپر ننگی چندیا ابھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے اب تک ۔ کئی کردار آئے اور اپنی زندگی بتا کر ، اپنی اہمیت جتا کر ، اپنی ڈرامائیت ذہن نشین کرا کے چلے گئے ۔ حسین عورتیں ، خوبصورت تخیلی ہیولے ، شیطان کے چہرے اس ذہن کے رنگ و روغن سے آشنا ہوئے اس کی چار دیواری میں اپنے دیئے جلا کر چلے گئے ۔ لیکن کالو بھنگی بدستور اپنی جھاڑو سنبھالے اسی طرح کھڑا ہے ۔ اس نے اس گھر کے اندر آنے والے ہر کردار کو دیکھا ہے ، اسے روتے ہوئے ، گڑگڑاتے ہوئے ، محبت کرتے ہوئے ، نفرت کرتے ہوئے ، سوتے ہوئے ، جاگتے ہوئے ، قہقہے لگاتے ہوئے ، تقریر کرتے ہوئے ، زندگی کے ہر رنگ میں ، ہر نہج سے ، ہر منزل میں دیکھا ہے ۔ بچپن سے بڑھاپے سے موت تک ، اس نے ہر اجنبی کو اس کے گھر کے دروازے کے اندر جھانکتے دیکھا ہے اور اسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر اس کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے ۔ وہ خود پرے ہٹ گیا ۔ ایک بھنگی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے حتیٰ کہ داستان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی ہے ، حتیٰ کہ کردار اور تماشائی دونوں رخصت ہو گئے ہیں لیکن کالو بھنگی اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے ۔ اب صرف ایک قدم اس نے آگے بڑھا لیا ہے اور اس کے ذہن کے مرکز میں آگیا ہے تاکہ میں اچھی طرح دیکھ سکوں ۔ اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے اور ہونٹوں پر ایک خاموش سوال ہے ۔ ایک عرصے سے میں اسے دیکھ رہا ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں اس کے بارے میں ، لیکن آج یہ بھوت ایسے مانے گا نہیں ، اسے کئی سالوں تک ٹالا ہے ، آج اسے بھی الوداع کہہ دیں گے ۔

میں سات برس کا تھا جب میں نے کالو بھنگی کو پہلی بار دیکھا تھا ۔ اس کے بیس برس بعد جب وہ مرا ، میں نے اسے اسی حالت میں دیکھا ۔ کوئی فرق نہ تھا ۔ وہی گھٹنے ، وہی پاؤں ، وہی رنگت ، وہی چہرہ ، وہی چندیا ، وہی ٹوٹے ہوئے دانت ، وہی جھاڑو جو ایسا معلوم ہوتا تھا ، ماں کی پیٹ سے چلا آرہا ہے ۔ کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے جسم کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی ، وہ ہر روز مریضوں کا بول و براز صاف کرتا تھا ، ڈسپنسری میں فنائل چھڑکتا تھا ، پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا ۔ کمپونڈر صاحب کی بکری اور ڈاکٹر صاحب کی گائے چرانے کے لئے جنگل لے جاتا اور دن ڈھلتے ہی انھیں واپس ہسپتال میں لے آتا اور مویشی خانے میں باندھ کر اپنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کر سو جاتا ۔ بیس سال سے اسے میں یہی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا ۔ ہر روز ۔ بلا ناغہ ۔ اس عرصے

میں وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی بیمار نہیں ہوا۔ ایہ امر تعجب خیز ضرور تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کے لئے ایک کہانی لکھی جائے۔ خیر یہ کہانی تو زبردستی لکھوائی جا رہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اسے ٹالتا آیا ہوں لیکن یہ شخص نہیں مانا۔ زبردستی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ظلم مجھ پر بھی ہے اور آپ پر بھی۔ مجھ پر اسلئے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے اور آپ پر اس لئے کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا ہے۔ حالانکہ اس میں کوئی ایسی بات ہی نہیں جس کے لئے اس کے متعلق سر دردی مول لی جائے۔ مگر کیا کیا جائے کالو بھنگی کی خاموش نگاہوں کے اندر ایک ایسی کھینچی کھینچی سی ملتجیانہ کاہش ہے، ایک ایسی مجبور بے زبانی ہے، ایک ایسی محبوس گہرائی ہے۔ کہ مجھے اس کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں۔ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلچسپ ہو، کوئی کونہ ایسا نہیں جو تاریک ہو، کوئی زاویہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو۔ ہاں آٹھ سال سے متواتر میرے ذہن میں کھڑا ہے نہ جانے کیوں۔ اس میں اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ جب میں نے رومانیت سے آگے کا سفر اختیار کیا اور حسن اور حیوان کی بوقلمونی کیفیتیں دیکھتا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا۔ اس وقت بھی یہ وہیں تھا۔ جب میں ے بالکونی سے جھانک کر ان داتاؤں کی غربت دیکھی اور پنجاب کی سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا 'صم' 'بکم'۔ مگر اب یہ جائے گا ضر... اب اسے جانا ہی پڑے گا۔ اب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ اللہ اسکی بے کیف، بے رنگ، پھیکی، ... کہانی بھی سن لیجئے تاکہ یہ یہاں سے دور دفان ہو جائے اور مجھے اس کے غلیظ قرب سے نجات ملے، اور اگر آج بھی میں نے اس کے بارے میں نہ لکھا اور نہ آپ نے اسے پڑھا تو یہ آٹھ سال بعد بھی یہیں جما رہے گا ور ممکن ہے کہ زندگی بھر یہیں کھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جا سکتا ہے۔ کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آبا و اجداد بھنگی تھے اور سینکڑوں برس سے یہیں رہتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح، اسی حالت میں، پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی، اس نے کبھی عشق بھی نہ کیا تھا، اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا تھا، حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا۔ وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں کالو بھنگی میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی اور وہ یہ کہ اسے اپنی ننگی چندیا پر کسی جانور مثلاً گائے یا بھینس کی زبان پھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ نیلے آسمان تلے، سبز گھاس کے مخملیں فرش پر کھلی دھوپ میں وہ ہسپتال کے قریب ایک کھیت کی منڈیر پر اکڑوں بیٹھا ہے اور ایک

گائے اس کا سر چاٹ رہی ہے۔ بار بار۔ اور وہ اہیں اپنا سر چٹواتا اونگھ اونگھ کر سو گیا ہے۔ اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک عجیب سا احساس اجاگر ہونے لگتا تھا اور کائنات کے تھکے تھکے غنودگی آمیز آفاقی حسن کا گمان ہونے لگتا تھا۔ میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دنیا کی حسین ترین عورتیں، پھولوں کے تازہ ترین غنچے، کائنات کے خوبصورت ترین مناظر دیکھے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ایسی معصومیت، ایسا حسن، ایسا سکون کسی منظر میں نہیں دیکھا تھا جتنا اس منظر میں۔ جب میں سات برس کا تھا اور وہ کھیت بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان بہت نیلا اور صاف اور کالو بھنگی کی چندیا شیشے کی طرح چمکتی تھی۔ اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اسکی چندیا چاٹتی ہوئی، اسے گویا سہلاتی ہوئی سر سر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی۔ تب جی چاہتا تھا میں بھی اسی طرح اپنا سر گھٹا کے اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں اور اونگھتا اونگھتا سو جاؤں۔ ایک دفعہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو والد صاحب نے مجھے وہ پیٹا، وہ پیٹا اور مجھ سے زیادہ غریب کالو بھنگی کو وہ پیٹا کہ میں خود ڈر کے مارے چیخنے لگا کہ کالو بھنگی ہیں ان کی ٹھوکروں سے مر نہ جائے لیکن کالو بھنگی کو اتنی مار کھا کے بھی کچھ نہ ہوا۔ دوسرے روز وہ بدستور جھاڑو دینے کے لئے ہمارے بنگلے میں موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا، ہماری گائے تو اس پر جان چھڑکتی تھی اور مہوندر صاحب کی بکری بھی، حالانکہ بکری بڑی بے وفا ہوتی ہے، عورت سے بھی بڑھ کے، لیکن کالو بھنگی کی بات اور تھی۔ ان دونوں جانوروں کو پانی پلانے تو کالو بھنگی، چارہ کھلائے تو کالو بھنگی، جنگل میں چرائے تو کالو بھنگی اور رات کو مویشی خانے میں باندھے تو کالو بھنگی۔ وہ اس کے ایک ایک اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچے کی باتیں سمجھتا ہے۔ میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں۔ جنگل میں، راستے میں وہ انھیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا تھا لیکن پھر بھی وہ گائے اور بکری دونوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے، گویا تین دوست سیر کرنے کو نکلے ہیں۔ راستے میں گائے نے سبز گھاس دیکھ کر منہ مارا تو بکری بھی جھاڑی سے پتیاں کھانے لگتی اور کالو بھنگی ہے کہ سنبلو توڑ توڑ کے کھا رہا ہے اور بکری کے منہ میں ڈال رہا ہے اور خود بھی کھا رہا ہے۔ اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے اور ان سے بھی برابر باتیں کئے جا رہا ہے اور وہ دونوں جانور بھی، کبھی غرا کر کبھی کان پھپھٹا کر، کبھی پاؤں ہلا کر، کبھی دم دبا کر، کبھی ناچ کر، کبھی گا کر، ہر اس طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں۔ اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے، پھر چند لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے چلنے لگتا تو گائے بھی چرنا چھوڑ دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اوت کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ آگے کہیں چھوٹی سی ندی آتی یا کوئی ننھا منا چشمہ، تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر رہیں چشمے کی سطح سے اپنے ہونٹ ملا دیتا اور جانوروں

کی طرح پانی پینے لگتا اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے۔ کیوں کہ بیچارے انسان تو نہیں تھے کہ اوک سے پی سکتے۔ اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں سکیڑ کر دعائیہ انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس انداز سے اس کے قریب ہو بیٹھتی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کالو بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا پکا کے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی ہر نگاہ میں اور چہرے کے ہر اتار چڑھاؤ میں ایک سکون آمیز گرہستی انداز جھلکنے لگتا اور جب وہ جگالی کرنے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا کہ گویا کوئی بڑی سگھڑ بیوی کروشیا لئے سوزن کاری میں مصروف ہے اور یا کالو بھنگی کا سوئٹر بُن رہی ہے۔

اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتا تھا۔ جو کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لئے دوسرے کتوں کے ساتھ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا اور اکثر اپنے لنگڑے ہونے کی وجہ سے دوسرے کتوں سے پٹتا، بھوکا اور زخمی رہتا کالو بھنگی اکثر اس کی تیمارداری اور خاطر تواضع میں لگا رہتا اور کبھی تو صابن سے اسے نہلاتا، کبھی اس کی چیچڑیاں دور کرتا، اس کے زخموں پر مرہم لگاتا، اسے مکی کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا دیتا لیکن یہ کتا بڑا خود غرض جانور تھا۔ دن میں صرف دو مرتبہ کالو بھنگی سے ملتا۔ دوپہر کو ، اور شام کو۔ اور کھانا کھائے اور زخموں پر مرہم لگوائے پھر گھومنے کے لئے چلا جاتا۔ کالو بھنگی اور اس کے لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی اور بڑی دلچسپ۔ مجھے تو وہ کتا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا لیکن کالو بھنگی اسے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور چرند اور پرندے سے شناسائی تھی۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آجاتا تو وہ اسے اٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا۔ کہیں کوئی نیولہ بولنے لگتا تو یہ اس کی بولی میں اس کا جواب دیتا۔ تیتر، رستگلہ، گٹاری، لال چڑا، سبز تخی، ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ راہل سنکرا تائن سے بھی بڑا پنڈت تھا۔ کم از کم میرے جیسے سات برس کے بچے کی نظروں میں تو وہ مجھے اپنے ماں باپ سے بھی اچھا معلوم تھا اور پھر وہ مکی کا بھٹا ایسے مزے کا تیار کرتا تھا اور آگ پہ اسے اس طرح مدھم آنچ پر بھونتا تھا کہ مکی کا ہر دانہ کندن بن جاتا اور دانتے میں شہد کا مزا دیتا، اور خوشبو بھی ایسی سوندھی، میٹھی میٹھی، جیسے دھرتی کی سانس! نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون سے، بڑی مشتاقی سے وہ بھٹے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر اسے بھونتا تھا، جیسے وہ برسوں سے اس بھٹے کو جانتا تھا۔ ایک دوست کی طرح وہ بھٹے سے باتیں کرتا، اتنی نرمی اور مہربانی اور شفقت سے اس سے پیش آتا گویا وہ بھٹا اس کا اپنا رشتہ دار یا سگا بھائی تھا۔ اور لوگ بھی بھٹا بھونتے تھے، مگر وہ بات کہاں۔ اس قدر کچے، بدذائقہ اور معمولی سے بھٹے ہوتے تھے وہ، کہ انھیں بس مکی کا بھٹا ہی کہا جا سکتا ہے لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں پہنچ کر وہی بھٹا کچھ کا کچھ ہو جاتا اور جب وہ آگ پر سینک کے بالکل تیار ہو جاتا تو بالکل اک نئی نویلی دلہن کی طرح عروسی

لباس پہنے سنہرا سنہرا چمکتا نظر آتا۔ میرے خیال میں خود بھٹے کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کالو بھنگی اس سے کتنی محبت کرتا ہے ورنہ محبت کے بغیر اس بے جان شئے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے کالو بھنگی کے ہاتھ کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا اور میں انھیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کے کھاتا تھا۔ ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی۔ بری طرح۔ بچارا کالو بھنگی بھی پٹا مگر دوسرے دن پھر وہ بنگلے میں جھاڑو لئے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو بھنگی کے متعلق اور کوئی دلچسپ بات یاد نہیں آ رہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی اسی طرح رہا۔ میرے لئے اب وہ کم دلچسپ ہو گیا تھا بلکہ یو کہیے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دل چسپی نہ رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف کھینچتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعہ کے لئے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لئے فاؤنڈین پن اور پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

''کالو بھنگی تمہاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے؟''

''کیسی چھوٹے صاحب؟''

''کوئی خاص بات، عجیب، انوکھی، نئی''

''نہیں چھوٹے صاحب'' (یہاں تک تو مشاہدی صفر رہا۔ اب آگے چلئے ممکن ہے۔۔۔۔!)

''اچھا تم یہ بتاؤ تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟'' ہم نے دوسرا سوال پوچھا۔

''تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں'' وہ سوچنے لگتا۔ آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے، پھر وہ انگلیوں پر گننے لگتا ہے۔ ''چار روپے کا آٹا آتا ہے۔۔۔۔۔ ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، کتنے روپے ہو گئے، چھوٹے صاحب؟''

''سات روپے''

''ہاں سات روپے۔ ہر مہینے ایک روپیہ بنیے کو دیتا ہوں۔ اس سے کپڑے سلوانے کے لئے روپے کرج لیتا ہوں نا۔ سال میں دو جوڑے تو چاہئیں۔ کمبل تو میرے پاس ہے۔ خیر، لیکن دو جوڑے تو چاہئیں اور چھوٹے صاحب، کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ بڑھا دیں تو مجا آ جائے!''

''وہ کیسے؟''

''گھی لاؤں گا ایک روپے کا، اور مکی کے پراٹھے کھاؤں گا۔ کبھی پراٹھے نہیں کھائے۔ مالک۔ بڑا جی چاہتا ہے''۔

اب بولئے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہوگئی، جب راتیں جوان اور چمکدار ہونے لگتیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوری اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگتیں اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے دکھائی دیتے اور تارے جھکتے جھکتے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آنے والے بوسوں کا خیال کر کے کانپنے لگتے، اس وقت بھی کہیں کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا اور پنسل کاغذ لے کر اس کے پاس جاتا۔

''کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا؟''

''نہیں چھوٹے صاحب''

''کیوں؟''

''اس علاقے میں میں ہی ایک بھنگی ہوں اور دور دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے چھوٹے صاحب۔ پھر تمہاری شادی کیسے ہوسکتی ہے!'' (یعنی یہ راستہ بھی بند ہوا)

''تمہارا جی نہیں چاہتا کالو بھنگی؟'' میں نے دوبارہ کوشش کر کے کچھ کریدنا چاہا۔

''کیا صاحب؟''

''عشق کرنے کے لئے جی چاہتا ہے تمہارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہوگی تم نے جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی''۔

''عشق کیا ہوتا ہے۔ چھوٹے صاحب؟''

''عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ''

''عشق کیسے کرتے ہیں صاحب؟ شادی تو کرتے ہیں سب لوگ۔ بڑے لوگ عشق بھی کرتے ہوں گے چھوٹے صاحب۔ مگر ہم نے نہیں سنا وہ جو پوچھا آپ کہہ رہے ہیں۔ رہی شادی کی بات، وہ میں نے آپ کو بتادی۔ شادی کیوں نہیں کی، کیسے ہوتی شادی میری، آپ بتائیے؟'' (میں کیا بتاتا میں خاک)

''تمہیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی؟''

''کس بات کا افسوس؟ چھوٹے صاحب!''

میں نے ہار کر، اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مر گیا۔ وہ جو کبھی بیمار نہیں ہوا تھا۔ اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اٹھا۔ اسے ہسپتال میں مریض رکھوا دیا تھا۔ وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا۔ کمپونڈر دور سے اس کے حلق میں دو انڈیل دیتا اور ایک چپراسی اس کے لئے کھانا رکھ آتا۔ وہ اپنے برتن خود صاف کرتا، اپنا بستر خود کرتا، اپنا بول و براز

خود صاف کرتا اور جب وہ مر گیا تو اسکی لاش کو پولیس والوں نے ٹھکانے لگا دیا کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا جب وہ مر گیا تو اس کی لاش پولیس والوں نے ٹھکانے دیا کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا لیکن ہم کوئی اس کے رشتہ دار تھوڑی تھے، اس لئے اسکی آخری تنخواہ بھی بحق سرکار ضبط ہوگئی۔ کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا اور جب وہ مرا اس روز بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ روز کی طرح اس روز بھی اسپتال کھلا، ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے، کمپونڈر نے تیار کئے۔ مریضوں نے دوا لی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا ار گھر آن کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا، ریڈیو سنا اور لحاظ اوڑھ کر سو گئے۔ صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے ازراکرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپونڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا اور وارڈ کے باہر کھڑے باہر چلاتی رہیں۔ جانوروں کی ذات ہے نا آخر۔

''ارے تو پھر جھاڑو لے کر آن پہنچا! آخر کیا چاہتا ہے؟ بتا دے''

کالو بھنگی ابھی تک، وہیں کھڑا ہے۔

کیوں بھئی، اب تو میں نے سب کچھ لکھ دیا، وہ سب کچھ جو میں تمہاری بابت جانتا ہوں۔ اب بھی یہیں کھڑے ہو، پریشان کر رہے ہو، اللہ چلے جاؤ۔ یا مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے؟ کوئی بھول ہوگئی ہے۔ تمہارا نام۔ کالو بھنگی۔ کام بھنگی۔ اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے۔ شادی نہیں کی۔ عشق نہیں لڑایا۔ زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی۔ کوئی اچنبھا معجزہ نہیں ہوا جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے، اپنے بچے کے پیار میں ہوتا ہے۔ غالبؔ کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہو، تمہاری زندگی میں۔ پھر میں کیا لکھوں، اور کیا لکھوں؟ تمہاری تنخواہ آٹھ روپے، چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو۔ آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، اور ایک روپیہ کا بنیے کا۔ آٹھ روپے ہوگئے۔ مگر آٹھ روپے میں کہانی نہیں ہوتی۔ آج کل تو پچیس پچاس سو میں نہیں ہوتی مگر آٹھ روپے میں تو شرطیہ کوئی کہانی نہیں ہوسکتی۔ پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمہارے بارے میں۔ اب خلجی ہی کو لو، ہسپتال میں کمپونڈر ہے۔ بتیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔ وراثت سے نچلے متوسط طبقے کے ماں باپ ملے تھے جنھوں نے مڈل تک پڑھا دیا۔ پھر خلجی نے کمپونڈری کا امتحان پاس کرلیا۔ وہ جوان ہے۔ اس کے چہرے پر رنگت ہے، یہ جوانی یہ رنگت کچھ چاہتی ہے۔ وہ سفید لٹھے کی شلوار پہن سکتا ہے۔ قمیض پر کلف لگا سکتا ہے۔ بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کر سکتا ہے۔ سرکار نے اسے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا بنگلہ نما کواٹر بھی دے رکھا ہے۔ ڈاکٹر چوک جائے تو فیس بھی جھاڑ لیتا ہے اور خوبصورت مریضاؤں سے عشق بھی کر لیتا ہے۔ وہ نوراں اور خلجی کا واقعہ تمہیں یاد ہوگا۔ نوراں نھیا سے آئی تھی۔ سولہ سترہ برس کی الھڑ جوانی، چار کوس سے سنیما کے رنگین اشتہار کی

طرح نظر آجاتی تھی۔ بڑی بے وقوف تھی۔ وہ اپنے گاؤں کے دونو جوانوں کا عشق قبول کئے بیٹھی تھی۔ جب نمبردار کا لڑکا سامنے آجاتا تو اس کی ہو جاتی اور جب پٹواری کا لڑکا دکھائی دیتا تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا اور وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ بالکل واضح، قاطع، یقینی امر سمجھتے ہیں۔ درآں حالیکہ یہ عشق بڑا متذبذب، غیر یقینی، گومگو حالت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی عشق اس سے بھی ہے، اس سے بھی ہے اور پھر شاید کہیں اور نہیں ہے اور ہے بھی تو اس قدر وقتی، سرگنی، ہنگامی کہ ادھر نظر چوکی ادھر عشق غائب۔ سچائی ضرور ہوتی ہے مگر ابدیت مفقود ہوتی ہے اس لئے تو نوراں کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ اس کا دل نمبردار کے بیٹے کے لئے بھی دھڑکتا تھا اور پٹواری کے پوت کے لئے بھی، اس کے ہونٹ نمبردار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لئے بیتاب ہوا اٹھتے تھے اور پٹواری کے پوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل یوں کانپنے لگتا جیسے چاروں طرف سمندر ہو، چاروں طرف لہریں ہوں اور ایک اکیلی کشتی ہو اور نازک سی پتوار ہو چاروں طرف کوئی نہ ہو، اور کشتی ڈولنے لگے، ہولے ہولے ڈولتی جائے اور نازک سی پتوار نازک سے ہاتھوں سے چلتی چلتی تھم جائے اور سانس رکتے رکتے رک سی جائے۔ اور آنکھیں جھکتی جھکتی جھک سی جائیں اور زلفیں بکھرتی بکھرتی بکھر سی جائیں اور لہریں گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم دیں، اور بڑے بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے جائیں اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے اور دل ایک دم دھک سے رہ جائے اور کوئی اپنی بانہوں میں بھینچ لے۔ ہائے...... پٹواری کے بیٹے کو دیکھنے سے ایسی حالت ہوتی تھی نوراں کی، اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی..... نمبردار کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا، نمبردار کا بیٹا۔ وہ دونوں کو زبان دے چکی تھی۔ دونوں سے شادی کرنے کا قرار کر چکی تھی۔ دونوں پر مرمٹی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپس میں لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے۔ اور جب جوانی کا بہت سا لہو رگوں سے نکل گیا تو انہیں اپنی بیوقوفی پر بڑا غصہ آیا۔ اور پہلے نمبردار کو بیٹا نوراں کے پاس پہنچا اور اپنی چھری سے اسے ہلاک کرنا چاہا اور نوراں کے بازو پر زخم آگئے۔ اور پھر پٹواری کا پوت آیا اس نے اس کی جان لینی چاہی، اور نوراں کے پاؤں پر زخم آگئے، مگر وہ بچ گئی کہ وہ بروقت ہسپتال لائی گئی تھی اور یہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں..... خوبصورتی دلوں پر اثر کرتی ہے۔ انجکشن کی طرح۔ تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ کسی پر کم کسی پر زیادہ۔ ڈاکٹر صاحب پر کم تھا۔ کمپونڈر پر زیادہ تھا۔ نوراں کی تیمارداری میں خلجی دل و جان سے لگا رہا۔ نوراں سے پہلے بیگماں، بیگماں، بیگماں سے پہلے ریشماں اور ریشماں سے پہلے جانکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا مگر وہ خلجی کے ناکام معاشقے تھے کیونکہ وہ عورتیں بیاہی ہوئی تھیں۔ ریشماں کا تو ایک بچہ بھی تھا۔ بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے اور خاوند تھے اور خاوندوں کی دشمن نگاہیں تھیں جو گویا خلجی کے سینے کے اندر گھس کے اس کی خواہشوں کے آخری کونے

تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ خلجی کیا کر سکتا تھا، مجبور ہو کے رہ جاتا۔ اس نے بیگماں سے عشق کیا، ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔ وہ ہر روز بیگماں کے بھائی کو مٹھائی کھلاتا تھا۔ ریشماں کے ننھے بیٹے کو دن بھر اٹھائے پھرتا تھا۔ جانکی کو پھولوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ ہر روز صبح اٹھ کے منہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا اور خوبصورت لالہ کے گچھے توڑ کر اس کے لئے لاتا، بترین دوائیں، بہترین غذائیں، بہترین تیمارداری، لیکن وقت آنے پر جب بیگماں اچھی ہوئی تو روتے روتے اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی۔ اور جب ریشماں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کر چلی گئی۔ اور جانکی اچھی ہوئی تو اس نے چلتے وقت خلجی کے دیئے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگائے۔ اس کی آنکھیں ؛ بڈبا آئیں اور اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی اوٹ میں غائب ہوگئی۔ گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر خلجی کی طرف دیکھا اور خلجی منہ پھیر کر وارڈ کی دیوار سے لگ کر رونے لگا۔ ریشماں کے رکصت ہوتے وقت بھی اسی طرح رویا تھا۔ بیگماں کے جاتے وقت بھی اسی شدت، اسی خلوص، اسی اذیت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رویا تھا لیکن خلجی کے لئے نہ ریشماں رہی، نہ بیگماں، نہ جانکی، اور پھر اب کتنے سالوں کے بعد نوراں آئی تھی اور اس کا دل اسی طرح دھڑ کنے لگا تھا۔ اور یہ دھڑکن روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شروع شروع میں نوراں کی حالت غیر تھی۔ اس کا بچنا محال تھا مگر خلجی کی ان تھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے۔ پیپ کم ہوتی گئی، سرانڈ دور ہوتی گئی، سوجن غائب ہوتی گئی، نوراں کی آنکھوں میں چمک اور اس کے سپید چہرے پر صحت کی سرخی آگئی اور جس روز خلجی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتاری تو نوراں بے اختیار ایک اظہار تشکر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور جب اس کے پاؤں کی پٹی اتری تو اس نے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتھوں پر، اور آنکھوں میں کاجل لگایا اور بالوں کی زلفیں سنواریں تو خلجی کا دل مسرت کی چوکڑیاں بھرنے لگا۔ نوراں خلجی کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس نے خلجی سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ نمبردار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لئے اس سے معافی مانگنے کے لئے، اس سے شادی کا پیمان کرنے کے لئے ہسپتال آئے تھے، اور نوراں انہیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی، کانپنے لگتی، مڑ مڑ کے دیکھنے لگتی اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا جب تلک وہ لوگ چلے نہ جاتے، اور خلجی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا، اور جب وہ بالکل اچھی ہوگئی تو سارا گاؤں اس کا اپنا گاؤں اسے دیکھنے کے لئے امڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کی مہربانی سے، اور نوراں کے ماں باپ بچھے جاتے تھے اور آج تو نمبردار بھی آیا تھا اور پٹواری بھی۔ اور دونوں خر دماغ لڑکے بھی جو اب نوراں کو دیکھ دیکھ کے اپنے کئے پر پشیمان ہو رہے تھے۔ اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا اور کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈبائی آنکھوں سے خلجی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی...... سارا گاؤں اسے لینے کے

لئے آیا تھا اور اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے نمبردار کے بیٹے اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم، اور دوسرے قدم اور سینکڑوں قدم، جونوراں کے ساتھ چل رہے تھے خلجی کے سینے کی گھاٹی پر سے گزرتے گئے اور پیچھے ایک دھندلی گرد و غبار سے اٹی رہ گزر چھوڑ گئے۔

اور کوئی وارڈ کی دیوار کے ساتھ سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوبصورت رومانی زندگی تھی خلجی کی، خلجی جو مڈل پاس تھا، تیس روپے تنخواہ پاتا تھا، پندرہ بیس روپے اوپر سے کما لیتا تھا، خلجی جو جوان تھا، جو محبت کرتا تھا، جو ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا، جو اچھے ادیبوں کے افسانے پڑھتا تھا اور عشق میں روتا تھا۔ کس قدر دلچسپ اور رومانی اور پر کیف زندگی تھی خلجی کی لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ:

۱۔ کالو بھنگی نے بیگماں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں دھوئیں۔

۲۔ کالو بھنگی نے بیگماں کا بول و براز صاف کیا۔

۳۔ کالو بھنگی نے ریشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔

۴۔ کالو بھنگی ریشماں کے بیٹے کو مکی کے بھٹے کھلاتا تھا۔

۵۔ کالو بھنگی نے جانکی کی گندی پٹیاں دھوئیں اور ہر روز اس کے کمرے میں فینائیل چھڑکتا۔ بار روشام سے پہلے وراڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا۔ اور آتش دان میں لکڑیاں جلاتا رہا تاکہ جانکی کو سردی نہ لگے۔

۶۔ کالو بھنگی نوراں کا پاخانہ اٹھاتا رہا، تین ماہ دس روز تک۔

کالو بھنگی نے ریشماں کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن وہ کبھی دیوار سے لگ کر نہیں رویا۔ وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لئے حیران ہو جاتا۔ پھر اسی حیرت سے اپنا سر کھجانے لگتا اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہسپتال کے نیچے کھیتوں میں چلا جاتا اور گائے سے اپنے چندیا چٹوانے لگتا لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں۔ پھر اور کیا لکھوں، تمہارے بارے میں کالو بھنگی، سب کچھ تو کہہ دیا۔ جو کچھ کہنا تھا، جو کچھ تم کہہ رہتے ہو، تمہاری تنخواہ بتیس روپے ہوتی، تم مڈل پاس یا فیل ہوتے، تمہیں وراثت میں کچھ کلچر، تہذیب، کچھ تھوڑی سی انسانی مسرت اور اس مسرت کی بلندی ملی ہوتی تو میں تمہارے متعلق کوئی کہانی لکھتا۔ اب تمہارے آٹھ روپے میں میں کیا کہانی لکھوں۔ ہر بار ان آٹھ روپوں کو الٹ پھیر کے دیکھتا ہوں۔ چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، اور ایک روپیہ بیلے کا۔ آٹھ روپے ہو گئے۔ کیسے کہانی بنے گی تمہاری کالو بھنگی، تمہارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا

جائے گا۔ چلے جاؤ، دیکھو میں تمہارے سامنے ہات جوڑتا ہوں۔

مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ اپنے اکھڑے پیلے پیلے گندے دانت نکالے اپنی پھوٹی ہنسی ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے۔ اچھا بھئی اب میں پھر اپنی یادوں کی راکھ کریدتا ہوں۔ شاید اب تیرے لئے مجھے بتیس روپوں سے نیچے اترنا پڑے گا اور بخت یار چپراسی کا آسرا لینا پڑے گا۔ بخت یار چپراسی کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ اور جب کبھی وہ ڈاکٹر یا کمپونڈر یا ویکسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اسے ڈبل بھتہ اور سفر خرچ بھی ملتا ہے۔ پھر گاؤں میں اس کی اپنی زمین بھی ہے اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے جس کے تین طرف چیڑ کے بلند و بالا درخت ہیں اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے جو اس کی بیوی نے لگایا ہے۔ اس میں کڑم کا ساگ بویا ہے اور پالک اور مولیاں اور شلغم اور سطر مرچیں اور بڑی الئیں اور کدو جو گرمیوں کی دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبزہ مرجاتا ہے تو کھائے جاتے ہیں۔ بخت یار کی بیوی یہ سب کچھ جانتی ہے۔ بخت یار کے تین بچے ہیں، اس کی بوڑھی ماں ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کرتی رہتی ہے، ایک دفعہ بخت یار کی ماں اپنی بہو سے جھگڑا کر کے گھر سے چلی گئی تھی۔ اس روز گہرا ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا۔ اور پالے کے مارے دانت بج رہے تھے۔ اور گھر سے بخت یار کا بڑا لڑکا اماں کے چلے جانے کی خبر لے کر دوڑتا دوڑتا ہسپتال آیا تھا اور بخت یار اسی وقت ماں کو واپس لانے کے لئے کالو بھنگی کو ساتھ لے کر چل دیا تھا۔ وہ دن بھر جنگل میں اسے ڈھونڈتے رہے۔ وہ اور کالو بھنگی اور بخت یار کی بیوی جو اب اپنے کئے پر پشیمان تھی اپنی ساس کو اونچی آوازیں دے کر روتی جاتی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور سردی سے ہات پاؤں شل ہوئے جاتے تھے اور پاؤں تلے چیل کے خشک جھومر پھسلے جاتے تھے، پھر بارش شروع ہوگئی، پھر کریڑی پڑنے لگی اور پھر چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ اور جیسے ایک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دیئے ہوں اور برف کی پریوں کو قطار اندر قطار باہر زمین پر بھیج دیا ہو، برف کے گالے زمین پر گرتے گئے، ساکن، خاموش، بے آواز، سپید مخمل، گھاٹیوں، وادیوں، چوٹیوں پر پھیل گئی۔

''اماں....... '' بخت یار کی بیوی زور سے چلائی۔

''اماں....... '' بخت یار چلایا۔

''اماں....... '' کالو بھنگی چلایا۔

جنگل گونج کے خاموش ہوگیا۔

پھر کالو بھنگی نے کہا ''میرا خیال ہے وہ نکر گئی ہوگی، تمہارے ماموں کے پاس''

نکر کے دو کوس ادھر بخت یار کی اماں ملی۔ برف گر رہی تھی اور وہ چلی جا رہی تھی۔ گرتی، پڑتی، لڑھکتی، تھمتی، ہانپتی، کانپتی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور جب بخت یار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کے لئے مزاحمت کی۔ پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بے ہوش ہوگئی اور بخت یار کی بیوی نے اسے تھام لیا اور راستے بھر وہ اسے باری باری سے اٹھاتے چلے آئے۔ بخت یار اور کالو بھنگی۔ اور جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تو بالکل اندھیرا ہو چلا تھا اور انہیں واپس آتے دیکھ کر بچے رونے لگے اور کالو بھنگی ایک طرف کھڑا ہو گیا اور اپنا سر کھجانے لگا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں بخت یار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں، چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے، مگر کالو بھنگی میں تمہارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں۔ میں ہسپتال کے ہر شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھ سکتا ہوں لیکن تمہارے متعلق اتنا کچھ کریدنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا کیا جائے۔ خدا کے لئے اب تو چلے جاؤ۔ بہت ستا لیا تم نے۔

لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ نہیں جائے گا۔ اس طرح ذہن پر سوار رہے گا اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لئے کھڑا رہے گا۔ اب میں سمجھتا ہوں تو کیا چاہتا ہے۔ تو وہ کہانی سننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں لیکن ہو سکتی تھی۔ میں تیرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں، سن تو چاہتا ہے کہ کوئی تیرے گندے کھردرے پاؤں دھو ڈالے۔ دھو دھو کے ان سے غلاظت دور کرے، ان کی بیائیوں پر مرہم لگائے۔ تو چاہتا ہے تیرے گھٹنوں تک ابھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائیں۔ تیری رانوں میں طاقت اور سختی آ جائے۔ تیرے پیٹ کی مرجھائی ہوئی سلوٹیں غائب ہو جائیں۔ تیرے کمزور سینے کے گرد وغبار سے اٹے ہوئے بال غائب ہو جائیں۔ تو چاہتا ہے کہ کوئی تیرے ہونٹوں میں رس ڈال دے انھیں گویائی بخش دے۔ تیری آنکھوں میں چمک ڈال دے۔ تیرے گالوں میں لہو بھر دے۔ تیری چندیا کو گھنے بالوں کی زلفیں عطا کرے، تجھے ایک مصفا لباس دے۔ تیرے [illegible] ایک چھوٹی سے چار دیواری کھڑی کردے، حسین، مصفا، پاکیزہ۔ اس میں تیری بیوی راج کرے۔ تیرے بچے قہقہے لگاتے پھریں، جو کچھ تو چاہتا ہے وہ نہیں کر سکتا۔ میں تیرے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی کو پہچانتا ہوں۔ جب تو گائے سے اپنا سر چٹواتا ہے تو مجھے معلوم ہے تو اپنے تخیل میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے۔ جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے۔ حتیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، تیرا سر جھک جاتا ہے اور تو اس کی مہربان آغوش میں سو جاتا ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لئے مکی کا بھٹا سینکتا ہے اور مجھے جس محبت وشفقت سے وہ بھٹا کھلاتا ہے تو اپنی ذہن کی پہنائی اس ننھے بچے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے، جو ابھی نہیں آیا، جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے۔ تو نے اسے گودیوں میں کھلایا ہے، اس کا منہ چوما

ہے، اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر جہان بھر میں گھمایا ہے۔ دیکھ لو یہ ہے میرا بیٹا...... یہ ہے میرا بیٹا، اور جب یہ سب کچھ تجھے نہیں ملا تو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اپنا سر کھجانے لگا اور تیری انگلیاں لاشعوری انداز میں گننے لگیں، ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ...... آٹھ روپے۔ میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو ہو سکتی تھی لیکن نہ ہو سکی کیونکہ میں افسانہ نگار ہوں، میں اک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں، اس کے لئے میں اکیلا ہی کافی نہیں ہوں۔ اس کے لئے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا، اور ڈاکٹر اور کمپونڈر اور بخت یار اور گاؤں کے پٹواری اور نمبردار اور دوکاندار اور حاکم اور سیاست دان اور مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والے انسان ہر شخص کی لاکھوں، کروڑوں، اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہیے۔ میں اکیلا مجبور ہوں، کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جب تک ہم مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں۔ یہ کام نہ ہوگا، اور تو اسی طرح اپنی جھاڑو لئے میرے ذہن کے دروازے پہ کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا۔ جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے اور کوئی معمار عظیم عمارت نہ تعمیر کر سکے جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی بلندیاں چھو لے، اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے۔

یہ بھرپور زندگی ممکن نہیں جب تک تو جھاڑو لئے یہاں کھڑا ہے!

اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی آ جائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا دے اور تیرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوس قزح کے اس پار لے جائے۔

☆☆☆☆

جہاں میں رہتا ہوں

مہندر ناتھ

میں دن رات یہی سوچتا رہتا ہوں کہ تمہیں کیا لکھوں، وہ کون سا مضمون ہے، جس پر ادیبوں نے خامہ فرسائی نہیں کی، تم نے لکھا ہے کہ تم عورت کی محبت کے متعلق کیوں نہیں سوچتے، یہ قصہ بہت پرانا ہو چکا، اور میں نے عورت کی محبت کے متعلق اتنا لکھا کہ میرا جی ان باتوں سے اکتا گیا ہے۔ اب جی چاہتا ہے کہ میں اپنے متعلق لکھوں، کچھ اپنی اداسی، اپنے غم، اپنے دکھ کی نسبت، شاید تم اس اُداسی، اس غم، میں اہلِ دل کی اداس روح کی ایک جھلک دیکھ سکو!؟

یہ تو تمہیں معلوم ہوگا ہی کہ میں کتنی دور سے چل کر آیا ہوں، کشمیر کی حسین وادیوں کا چکر کاٹ کر، پنجاب کے حسن سے متاثر ہو کر، دہلی اور لکھنو کا طواف کر کے، پونا کے ملیریا بخار سے سیراب ہو کر بمبئی پہنچ گیا ہوں، آخر اتنا لمبا سفر کیوں؟ کیا اتنی پھیلی ہوئی دنیا میں میرے لیے کوئی مقام نہ تھا کہ میں ہندوستان کے ایک کونے سے چل کر دوسرے کونے تک پہنچ گیا، پھر بھی مجھے سکون نہیں ملتا۔ راحت نصیب نہیں ہوتی، خوشی محسوس نہیں

کچھ ان کے بارے میں:

نام: مہندر ناتھ

ولدیت: ڈاکٹر گوری شنکر

پیدائش: 1923ء بمقام لاہور

تعلیم: ایم اے

تصانیف: 10 افسانوی مجموعے اور 15 ناول شائع ہوئے۔

کرشن چندر کے چھوٹے بھائی تھے۔ فلمی صنعت کے ساتھ وابستہ رہے۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے سیکریٹری۔ ینگ رائٹرز ایسوسی ایشن کے صدر اور فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے جنرل سیکریٹری بھی رہے۔

ذریعۂ اظہار: اُردو، ہندی

وفات: 20 مارچ 1974ء

ہوتی۔

لوگوں نے بمبئی کی عمارتوں کی تعریف کی ہے، بمبئی کی ٹراموں اور ریلوں کو سراہا ہے۔ لیکن میں ان فلک بوس عمارتوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوا، مجھے ان ٹراموں اور بسوں میں بیٹھ کر کبھی خوشی محسوس نہیں ہوئی، ہاں جب کبھی سمندر کے کنارے جاتا ہوں، تو دل کو سکون مل جاتا ہے، پھیلا ہوا وسیع سمندر۔ اور اس پر کالے کالے جھکے ہوئے بادل، جیسے دوشیزہ کے جھکے ہوئے بال..... اور دور بہت دور ایک کشتی لہروں پر ہچکولے کھاتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف رواں، اور پھر سمندر کے کنارے ناریل کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ، ناریل کے درخت خوب لمبے ہوتے ہیں، سرو اور یوکلپٹس کے درختوں سے بھی اونچے اور لمبے، جب ہوا زور سے چلتی ہے تو یہ درخت ہوا میں جھومتے ہیں، اور لہراتے اور آپس میں ایک عجیب انداز سے سرگوشیاں کرتے ہیں اور رات کے وقت جب ہوا ان درختوں میں سے گزرتی ہے تو ایک عجیب سی سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ ان کے لانبے لانبے پتے ہوا میں لہراتے ہیں، کسی جوان لڑکی کے آوارہ بالوں کی طرح..... چاند کسی شرمائی ہوئی دلہن کی طرح ان لانبے درختوں میں چھپا رہتا ہے۔ لیکن چاند کی سیمیں کرنیں سمندر کی لہروں سے ہم آغوش ہوتی ہیں، ان کو چومتی ہیں، ان سے کھیلتی ہیں، لہریں بڑھتی ہیں تو ساحل سے ٹکرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ شور بڑھتا ہے اور پھر مدھم ہو جاتا ہے۔ ریت کے ذرے ان چمکتی ہوئی کرنوں میں چمک اٹھتے ہیں، اور سمندر کی ٹھنڈی، تازہ، پاک اور صاف ہوا، ناریل کے درختوں سے گزرتی ہوئی ایک اُداس نغمہ پیدا کرتی ہے۔

بمبئی میں مجھے تین چیزیں بہت پسند آئی ہیں، سمندر، ناریل کے درخت اور بمبئی کی ایکٹریسیں، اصل میں ان تینوں چیزوں سے بمبئی زندہ ہے۔ اگر ان تینوں چیزوں کو بمبئی سے نکال دیا جائے تو بمبئی بمبئی نہ رہے۔ شاید دہلی بن جائے، یا لاہور۔ دہلی ایک معمولی بے کیف سا شہر۔ میں یہاں کیوں آیا اس کی وجہ تم جانتے ہی ہو، وہی پرانی روزگار کی تلاش، پیٹ کا مسئلہ بہت پرانا ہے۔ مگر انسانوں نے ابھی تک اس مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔ اگر اس مسئلے کا کوئی خاطر خواہ حل ہوتا بنگال میں اتنی موتیں نہ ہوتیں، یہ ہولناک جنگ بپا نہ ہوتی، یہ بھوک، یہ غریبی، یہ پیاس، نہ ہوتی۔ اس وقت میری جیب میں صرف چار آنے ہیں اور باہر ناریل کے پتوں پر سورج کی کرنیں رقص کر رہی ہیں، اور دور گرجے کی صلیب پر ایک کوا کائیں کائیں کر رہا ہے۔ اور میری بھوک ہر لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن مجھے روزی کی اتنی فکر نہیں، آخر پیٹ بھرنے کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے۔ کہیں نہ کہیں تم ایسا دوست مل جاتا ہے اور پھر ہم دونوں کسی ریستوران میں چلے جاتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں۔ میں کبھی کبھی اپنے دوستوں سے روپے اُدھار لے لیتا ہوں۔ مگر یہ روپے کبھی واپس نہیں کرتا۔ کہہ دو یہ کمینہ پن ہے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں، بھوک ہی کمینہ پن سکھاتی

ہے۔سرمایہ دار مزدور کی روزی چھین کر عالی شان محل تعمیر کرتا ہے۔فیکٹریاں بناتا ہے اور بال بچوں کو تعلیم دلانے کے لئے یوروپ بھیجتا ہے۔تو کیا یہ کمینہ پن نہیں؟ جابر کمزور کو مغلوب کر کے ایک عالی شان سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے کیا یہ کمینہ پن نہیں؟ حاکم محکوم کو کچل کر، پیس کر حکومت کرتا ہے۔کیا یہ ذلت نہیں؟اگر میں اپنے مالدار دوستوں سے چند ٹکے قرض لے لیتا ہوں تا کہ اپنی بھوکی انتڑیوں کو بہلا سکوں،تو کیا میں کمینہ ہو گیا،چھوڑو میاں!تمہارے سماج کی عجیب قدریں ہیں،اور میں ہر گام، ہر قدم،اور ہر منٹ اور ہر سیکنڈ ان کھوکھلی قدروں کو توڑنا چاہتا ہوں۔ان قدروں کا مضحکہ اڑانا چاہتا ہوں۔چاہے تم مجھے کمینہ کہو یا گنوار......؟

پہلے میں شیواجی پارک میں رہتا تھا، یہ جگہ ایکٹر اور ایکٹریسوں کی پسندیدہ جگہ ہے،شیواجی پارک کے چوک میں کھڑے ہو کر تم تمام ایکٹروں اور ایکٹریسوں کو دیکھ سکتے ہو۔سڑک کی ہر نکڑ پر، کسی نہ کسی موڑ پر، حلوائی کی دکان پر یا ایرانی ریستوران میں،تم ایکٹروں کو دیکھ سکتے ہو،اور جو چیز ہر روز دیکھی جائے......اس کی دلکشی جاتی رہتی ہے۔

تم نے یونہی پریتما کی تصویر مانگی ہے، ارے بھائی چھوڑو ان ایکٹریسوں کو، کیوں دردسر مول لیتے ہو۔بے چاری پریتما اب موٹی ہو گئی ہے، کسی اور ایکٹریس کا نام لو۔کوئی ہو بھی تو۔شاید مہتاب تمہیں پسند آئے۔میری نگاہوں میں یہی ایک ایکٹریس ہے جسے ایکٹرس کا پارٹ دیا جا سکتا ہے باقی تو پھول کر کپا ہو گئی ہیں۔ہندوستان میں ایکٹر اور ایکٹریسوں کو اپنے جسم کا بالکل خیال نہیں رہتا،ایک بار ہیروئین کا رول مل گیا تو لگی موٹی ہونے، نہ کمر رہی نہ سینہ، نہ آنکھوں میں شوخی نہ بالوں میں چمک۔گالوں پر گوشت چڑھنے لگا یہاں تک کہ چہرے کے خطوط غائب ہو گئے۔کولہے اتنے پھیلے کے ٹانگیں ندارد۔سینہ اتنا بڑھا کہ پیٹ بن کر رہ گیا۔اب بتاؤ کہ کیا کرو گے ان کا فوٹو لے کر۔کل ہی میں نے میٹرو کے سامنے ایک فلم کا اشتہار دیکھا،اشتہار پر مغربی ناچنے والی لڑکیوں کی ٹانگیں دکھائی گئی تھیں، صرف ٹانگیں...... اف کیا ٹانگیں تھیں، کتنی سڈول اور گداز۔گداز اور سڈول۔جیسے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوں۔کتنی خوبصورت دلکش،توانا اور صحت مند۔کتنی پرفریب، جیسے نگاہوں میں جذب ہو رہی ہیں۔تمام ہندوستان چھان لو،اتنی خوبصورت، متناسب،موزوں، ٹانگیں نہیں ملیں گی، میاں ان لوگوں سے پوچھو خوبصورتی کیا چیز ہے۔ان لوگوں سے پوچھو کہ خوبصورت ٹانگیں کس طرح تیار ہوتی ہیں۔سڈول بازو، ابھری ہوئی چھاتیاں، صحت مند جسم کس طرح بنتا ہے۔اور پھر یہ توس، جو عورت کی خوبصورتی کی روح ہوتی ہے، کہاں سے آتی ہے، کس طرح بنتی ہے، شرمانے کی کوئی بات نہیں، تم کہو گے ہندوستان مفلس ہے۔غریب ہے،لیکن یہ ایکٹرسیں تو غریب نہیں ہیں، یہ تو ہزاروں روپے ماہوار کماتی ہیں۔لیکن خوبصورتی کا احساس کس کو

ہے۔ یہاں تو عورت کو گٹھری بننے پر مجبور کیا جاتا ہے، اور اگر عورت گٹھری بن گئی تو سمجھو کہ حسن کا مجسمہ تیار ہو گیا۔ یہاں تو خوبصورت جسم پر غلاف چڑھائے جاتے ہیں، مبادا ان ٹانگوں میں زندگی آجائے، اور ٹیڑھی سیدھی ٹانگیں چلنے لگیں، مرنے اور جینے کے انداز ان مغربی لوگوں سے سیکھو میاں! ابھی ہم بہت پیچھے ہیں، بہت پیچھے۔

ارے کرر ہا تھا بات پر۔ یتما کی ذکر آ گیا براڈوے گرلز کی ٹانگوں کا۔ اگر اتنے بے بس اور مجبور ہو تو چند دنوں کے لئے بمبئی آجاؤ، تمہارا ہندوستان کی تمام ایکٹروں اور ایکٹریسوں سے تعارف کرا دوں گا۔ یہ لوگ شہرت کے اس قدر بھوکے ہیں جتنے تم انہیں دیکھنے کے لئے ترستے ہو۔ آخر یہ لوگ بھی انسان ہیں۔ میں یونہی ایکٹرسوں کے جھمیلے میں پڑ گیا، کرر ہا تھا ذکر اپنا، درمیان میں بیچاری ایکٹرس آ گئی۔ تم نے میرے مکان کا پتہ پوچھا ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں میں کہاں رہتا ہوں۔ پہلے میں شیواجی پارک میں رہا تھا، وہاں سے کیوں چلا آیا، اس کی وجہ بھی سنو، میں ایک دوست کے پاس قیام پذیر تھا، آج کل کسی کو دوست بنانا اتنا ہی آسان ہے جتنا دشمن .... میرا دوست جس کا نام تم R رکھ سکتے ہو، ایک نہایت ہی پہلوان قسم کا انسان ہے، جسم دیکھو تو جی پھڑک اٹھے۔ ورزش کا بہت شوقین۔ وہ دن رات ورزش کرتا تھا۔ ہر وقت جسم کو مضبوط اور توانا بنانے کے خواب دیکھتا تھا۔ دراصل اس کا سپنا حقیقت بن چکا تھا۔ بیچارے میں صرف ایک خامی تھی۔ یہ کہ وہ عورت کو دیکھ کر گھبرا جاتا تھا۔ اس لئے وہ عورتوں کی طرف بالکل نہیں دیکھتا تھا، میرا مطلب ہے جوان عورتوں کی طرف۔ اگر میں کسی عورت کی طرف نگاہ کرتا تو وہ اس بات کو برا سمجھتا۔ کبھی کبھی میں خیال کرتا کہ میرے دوست کا نکتۂ نظر درست ہے۔ آخر یونہی اپنے دل و دماغ کو پراگندہ کرنے سے کیا فائدہ۔ ہر وقت عورت کے متعلق سوچنے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ورزش کی جائے، ڈنڈ پیلے جائیں، من من، دو دو من کے پتھر ہر روز اٹھائے جائیں اور جب انسان پتھر اٹھا اٹھا کر تھک جائے تو سمندر کے کنارے سیر کرنے چلا جائے اور سمندر کی ان گنت لہروں کو گنتا جائے۔ ہر طرف لہریں ہی لہریں یا پانی ہی پانی....... دور، نظر سے دور جہاں سمندر اور آسمان آپس میں بغل گیر ہوتے ہیں۔ سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر سمندر کو چومتا ہے، اور پھر گہرے نیلے پانی میں ڈوب جاتا ہے، ہر طرف سرخی ہی سرخی پھیل جاتی ہے، آسمان پر پھیلے ہوئے بادل شفق کی سرخی سے چمک اٹھتے ہیں، اور ٹھنڈی تازہ، زندہ ہوا بالوں کو چومتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ ناریل کے درخت پیار بھری نظروں سے جھانکتے ہیں، اور ان کی سوندھی سوندھی خوشبو ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ اس نظارے کو چھوڑ کر کسی عورت کے پیچھے بھاگنا حماقت ہے۔

اگر تم میرے دوست کو دیکھو تو یہی کہو گے کہ کتنا متناسب، حسین، تراشا ہوا یونانی بت ہے۔ اس کی آنکھوں میں سرسبز گھاس کی نیلاہٹ ہے، اور اس کے رخسار پکے ہوئے سیب کی طرح سرخ۔ اگر تم اس کے قریب

بیٹھو تو ایک عجیب صحت مند خوشبو اس کے جسم سے نکلتی ہے، جو صرف خالص گھی کھانے سے، دودھ پینے سے یا سرخ ٹماٹر کے استعمال سے یا عورت کی طرف نہ دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ عورتیں اکثر میرے دوست کی طرف دیکھتی ہیں، نگاہوں میں آرزو ہوتی ہے۔ جسم کو چھونے کی خواہش ہوتی ہے۔ بس یہ دیکھنے کے لئے کہ اس بُت میں کیا ہے، اس کے بازو اس قدر سڈول کیوں ہیں، اس کی چال میں کیوں ایک زندگی ہے، اس کی نگاہوں میں کیوں ایک چمک ہے، لیکن میرا دوست عورتوں کی طرف نہیں دیکھتا، اکثر میں اسے لیکچر دیا کرتا ہوں، کہ بھئی عورت سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، آخر عورت بنی کس لئے ہے۔ عورت سے اس قدر دور رہنے سے کیا فائدہ۔ آخر زندگی میں ہر شخص کا نصب العین ایک خوبصورت جسم بنانا تو نہیں ہے۔ میری طرف دیکھو۔ میں چاہتا ہوں کہ میری صحت اچھی رہے اور میں تندرست رہنے کے لئے تھوڑی بہت ورزش کر لیتا ہوں۔ لیکن میں پہلوان بننا نہیں چاہتا، میں زندگی میں ورزش کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً میں اس لڑکی کو جو بالکونی کے دوار میں کھڑی رہتی ہے، نہایت قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں، تم نے نہیں دیکھا، اسے دیکھا ہوگا۔ میں نے تمہیں اکثر دیکھا ہے کہ تم چاند کی سیمیں روشنی سے متاثر ہو کر باغ میں چلے جاتے ہو، اور ہری ہری گھاس پر ایک سفید چادر بچھا کر لیٹ جاتے ہو، اور اپنے جسم کو چاند کی ٹھنڈی کرنوں کے حوالے کر دیتے ہو، اور دیر تک ان سیمیں برفیلی کرنوں میں نہاتے رہتے ہو، بھلا یہ کیوں۔ تم نے اس لڑکی کی طرف نہیں دیکھا، وہ بھی تو چاندی کا ٹکڑا ہے، اس کے جسم سے بھی چاندی کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ مگر یہ کرنیں عجیب سی ہوتی ہیں۔ میٹھی، ہلکی، نرم گداز، نیند آجاتی ہے ان کرنوں سے مجھے۔ نہانے دو ان کرنوں میں، تم نے کبھی چاند کو چھونے کی تمنا کی ہے! ضرور کی ہوگی۔ چاند اس کائنات میں مسرت کا سرچشمہ ہے۔ میں بھی اپنے کرنوں کے منبع کو چھونا چاہتا ہوں، میں اس لڑکی کو نہایت قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں، میں اس کو خوف زدہ کرنا نہیں چاہتا، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اسے میری موجودگی کا علم ہو جائے کہ وہ انسان جو ہر روز بالکونی سے گزرتا ہے، اسے کتنا پسند کرتا ہے، یہ کوئی بُری بات نہیں۔ بلکہ ایک نہایت پاک اور مقدس خواہش ہے۔ آخر اس لمبے بالوں والی لڑکی سے تمہیں کیوں نفرت ہے۔ کیا ہوا اگر اس نے تمہاری طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھا، کیا ہوا اگر ایک دن تمہارے کمرے میں اچانک آگئی، اور اپنے آپ کو تمہارے حوالے کرنا چاہا۔ لیکن تم نے اس کی بے عزتی کی اور اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ یہ کہاں کی شرافت ہے، تم سمجھتے ہو کہ تم نے ایک نیک کام کیا ہے اور ایک لڑکی کی عصمت کو بچایا ہے۔ لیکن تم نے اس کی محبت کا سرچشمہ ہمیشہ کے لئے خشک کر دیا، آج کل وہ کیوں اُداس رہتی ہے۔ تم نے اس کے گالوں کی زردی کو نہیں دیکھا، تم نے اس کی نگاہوں کی تشنگی اور بھوک کا کبھی اندازہ نہیں کیا، تم ورزش کر کے اور گھی پی کر سو گئے۔ اور بیچاری محبت کی آگ میں جل بھُن کر سوکھتی چلی گئی۔ مجھے ایسی شرافت پسند

نہیں، میں جانتا ہوں کہ جب تمہیں عورت کی یاد ستاتی ہے تو تم کیا کرتے ہو، اس وقت تم کیوں ٹھنڈے پانی سے بار بار غسل کرتے ہو، مگر آخر کب تک؟ اگر دنیا کے تمام انسان ٹھنڈے پانی سے نہانا شروع کر دیں تو دنیا اس چیز سے محروم ہو جائے جسے محبت کہتے ہیں، محبت ہی زندگی کا محور ہے، اس کے بغیر زندگی بے جان ہے، بے کیف ہے۔

ہاں اس دن کی بات ہے، ایک نوجوان لڑکی میرے کمرے میں آ گئی، میرے دوست نے اس لڑکی کو دیکھا، اس نے اس بات کو ناپسند کیا۔ وہ یہ بات برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی لڑکی اس کے گھر کی طرف رخ کرے۔ میرے دوست نے اس لڑکی کو گالیں دیں۔ اور کہا کہ وہ رنڈی ہے، بدمعاش ہے، لڑکی بیچاری تکتی رہ گئی، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے نیا نیا دھندا شروع کیا تھا اور وہ ان لوگوں سے آشنائی کرنا چاہتی تھی، جو کم از کم اسے اچھے لگیں۔ اس سے پہلے وہ ایک لڑکے سے محبت کر چکی تھی، اور اب میری طرف مائل پرواز تھی، میرے دوست نے لڑکی کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا، اور میں دیر تک اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ اگر میرا دوست ان پڑھ ہوتا تو شاید میں اسے معاف کر دیتا، لیکن جو شخص پڑھا لکھا ہو، ایک طوائف کو گالی دے کہ وہ کیوں طوائف ہے، وہ کیوں اپنا جسم بیچتی ہے، تو صاف ظاہر ہے کہ وہ شخص زندگی کے بنیادی مسئلوں سے آگاہ نہیں۔ وہ انہیں بالکل نہیں سمجھتا اور اگر سمجھتا بھی ہے تو اپنے اصولوں کی خاطر ایک ایسی لڑکی پر حملہ کرتا ہے جو نہتی ہے۔ جو اکیلی ہے۔ جس کا کوئی وارث نہیں۔ جس کے پیشے کا ذمہ دار ہمارا سماج ہے، حکومت ہے، موجودہ سامراج ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ ایسے شخص کو کیا سزا ملنی چاہیے۔ طوائف کے مسئلے کو حل کرنا، طوائفوں کو گالی دینے سے حل نہ ہوگا بلکہ عورتوں کو تعلیم دینے سے، عورتوں کی بھوک مٹانے سے، عورتوں پر دنیا کے دروازے کھولنے سے، عورتوں کو کام مہیا کرنے سے، عورتوں کو آزادی دینے سے، عورتوں کے اقتصادی مسائل کو حل کرنے لئے جب تک یہ کام حکومت نہ کرے گی، طوائفیں قائم رہیں گی۔ اور آج کے دن تک وہ واقعہ بھول نہیں سکا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دن اس لڑکی کی بے عزتی نہیں ہوئی، بلکہ میری بہن کی بے عزتی کی گئی تھی۔ اس دن میرے دوست نے اس لڑکی کی بے عزتی کر کے ظاہر کر دیا کہ مجھے بھی اس گھر میں نہیں رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ میں بھی اس طرح گھر سے نکالا جاؤں۔ اس لڑکی نے جن قہر آلود نظروں سے میرے دوست کی طرف دیکھا تھا، اس سے صاف یہی عیاں تھا کہ اگر وہ مرد ہوتی تو اسے تھپڑ مار کر اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیتی، وہ کون شخص ہوگا جو اچھی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ آخر اس کو کیا غرض تھی کہ اپنا جسم راہگیروں کے ہاتھ بیچتی پھرے؟ کیا اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ تمنا نہ تھی اسے ایک ایسا شوہر ملے جو خوبصورت ہو، نیک ہو، اچھے پیسے کماتا ہو، اور اس سے محبت کرتا ہو، اور اگر زندگی میں یہ چیزیں نہ ہوں اور بھوک اور فاقوں سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو فروخت کرنا پڑے تو اس لڑکی کا کیا قصور ....؟ وہ اُداس شام میں کبھی نہیں بھول سکتا، وہ گالیاں

اب تک میرے ذہن پر مرتسم ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر گالی میرے سینے میں ایک زخم پیدا کرگئی ہے، اس کے بعد میں اپنے دوست کے گھر سے چلا آیا۔

آج کل میں ماہم میں رہتا ہوں، سمرسٹ ماہم نہیں، منٹو کا ماہم نہیں بلکہ شیواجی پارک سے ایک اسٹیشن آگے، یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے، اس جگہ نے میری اُداسی میں اور بھی اضافہ کردیا ہے۔ میرے گھر کے سامنے ناریل کے درخت ایستادہ ہیں، یہ درخت ہوا میں جھومتے ہیں اور سمندر کی ہوا ناریل کے پتوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ آسمان ابر آلود رہتا ہے اور کبھی کبھی خوب زور کی بارش ہوتی ہے، میں اکثر بالکونی میں کھڑا رہتا ہوں اور ایک بھیگے ہوئے انسان کی طرح ادھر اُدھر دیکھتا رہتا ہوں، لوگ میری طرف دیکھتے ہیں اور ضرور سوچتے ہوں گے کہ یہ شخص یہاں کیوں کھڑا رہتا ہے۔ کیا یہ پاگل ہے، کیا اس کا دماغ ٹھیک ہے۔ اور میں ان کی طرف دیکھتا ہوں جیسے میں ان کی ہر بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، جیسے میں ان کے دل کی ویرانی، بےبسی، ان کی ناچاری سے اچھی طرح آگاہ ہوں، مگر میں نے انہیں بتانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

میرے مکان کے سامنے ایک ایکٹر کا مکان ہے، میں نے اکثر ایک خوبصورت لڑکی کو اس کے کمرے میں گھومتے دیکھا ہے، سنا گیا ہے کہ یہ لڑکی Extra کا کام کرتی تھی، پھر اس ایکٹر نے یہ لڑکی پسند کرلی، اور اب وہ گھر کی چاردیواری میں بند کردی گئی ہے، بمبئی میں عام طور پر لوگ ایکٹریسوں سے شادیاں کرلیتے ہیں، اور جب شادی کرلیتے ہیں تو اپنی بیویوں کو گھر کی چاردیواری میں بند کردیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر لڑکیوں نے آزاد زندگی بسر کی ہوتی ہے۔ کہاں پہلے وہ کھلم کھلا ہر ایک مرد سے مل سکتی تھیں، لیکن اب کسی غیر مرد کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتیں۔ یعنی ایک انتہا سے گزر کر دوسری انتہا کو پہنچ جاتی ہیں۔ نتیجہ، بےبسی، یاس، ایک ڈر جو ہمیشہ ان کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے، مبادا ان کے شوہر انہیں کسی غیر مرد سے باتیں کرتے دیکھ لیں تو پھر ان کا وہی حشر ہو جس سے اکتا کو انہوں نے اس زندگی کو قبول کیا تھا۔ ازدواجی زندگی کے چند سالوں بعد انہیں معلوم ہوجاتا ہے اس زندگی میں اتنی ہی وحشت ہے، اتنا ہی زہر ہے، اتنی ہی تلخی ہے، اتنی ہی اُداسی ہے، جتنی ان کی پہلی زندگی میں تھی، کبھی کبھی ایکٹر کی بیوی میری طرف دیکھتی ہے، آنکھوں میں بےپناہ اُداسی ہے، چہرے پر ڈر کے آثار ہیں اور زندگی میں حسرت اور غم کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، ہوا زور سے چلتی ہے، ناریل کے پتے ہوا میں ناچتے ہیں، آنکھیں چمکتی ہیں، لمحہ بھر کے لئے، اور پھر وہی تاریکی چھا جاتی ہے۔

میرے مکان کے نیچے گندگی کا انبار لگا رہتا ہے، کہتے ہیں بمبئی نہایت صاف جگہ ہے، اگر کبھی ماہم آؤ تو تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ ماہم کتنا پراگندہ شہر ہے۔ مکان کے بائیں طرف دھوبی گھاٹ ہے جہاں دن بھر دھوبی

کپڑے دھوتے رہتے ہیں، رسیوں پر طرح طرح کے فراک لٹکتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ سُرخ فراک دیکھ لو، کسی جوان لڑکی کا ہوگا، اور وہ پھ لٹکتا ہوا لمبا فراک، کسی بڑھیا کا ہوگا، رنگ رنگ کی ساڑھیاں، پاجامے، دھوتیاں، انڈر ویئر، چادریں جا بجا لٹکتی ہوئی نظر آئیں گی۔ گلی کے قریب ہی ایک ناریل کا درخت گرا ہوا ہے، ذرا بچ کے چلنا کہیں ٹھوکر نہ لگے، چند دن ہوئے بہت تیز وتند ہوا چلی تھی اور یہ ناریل کا درخت گر گیا تھا۔ بالکونی میں کھڑے ہو کر تمہیں ایک چھوٹا سا مندر دکھائی دے گا، دراصل یہ مندر نہیں صرف ایک ٹین کی چھت ہے، جس کے نیچے ایک مورتی رکھ دی گئی ہے۔ بمبئی میں بہت کم مندر ہیں، بہت کم گوردوارے ہیں، ہاں گرجے زیادہ نظر آتے ہیں۔ تو ہاں، شاید ماہم کے ہندوؤں کو مندر کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی، بے چاروں نے اسی ٹین کی چھت کے نیچے مورتی نصب کر دی۔ عورتیں صبح سویرے آتی ہیں اور پتھر کی پُوجا کرتی ہیں۔ چند دن ہوئے ناریل کا درخت اس پتھر پر گرا تھا، میرا مطلب ہے اس خدا پر، اس دیوتا پر، درخت بھاری تھا دیوتا کچھ نہ کر سکا بیچارا اور درخت کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا، بیسویں صدی کے خدا بھی بے جان ہیں، جامد ہیں، غیر متحرک ہیں، آج کل جنگ کا زمانہ ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں کو کھانے پینے کے لئے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے، نہیں تو اس پر ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا، ہندو کہہ سکتے تھے کہ مسلمانوں نے جان بوجھ کر درخت گرایا ہے، تاکہ ہندوؤں کے پرماتما کی بے عزتی کی جائے، آج کل ان مسئلوں کو کون پوچھتا ہے، جب پیٹ بھرا ہوا ہو تو پرماتما یاد نہیں آتا، مذہب بیچارا.......!

میرا فلیٹ دوسری منزل پر ہے، اس لئے جب کبھی بالکونی پر کھڑا ہوتا ہوں، تو اردگرد کے مکانوں کو اچھی طرح دیکھ لیتا ہوں۔ میرے فلیٹ کے دائیں طرف ایک گجراتی رہتا ہے، گجراتی بیچارہ بوڑھا ہے لیکن اس کی بیوی جوان ہے، اگر خوبصورت ہوتی تو میں اس سے ضرور رومان لڑاتا۔ میری جمالیاتی حس کی داد دو کہ میں یونہی ہر لڑکی سے محبت نہیں کر سکتا، بیچاری نہایت ہی بدصورت ہے۔ کاش اس کے دانت باہر نکلے ہوئے نہیں ہوتے، تو شاید مجھے پسند آجاتی، وہ اکثر پھولوں کا ایک گچھا اپنے جوڑے میں باندھتی ہے، یہاں کی عورتوں کو پھولوں سے عشق ہے، معلوم ہوتا ہے عورت جتنی زیادہ بدصورت ہوتی ہے اتنا ہی وہ پھولوں سے محبت کرتی ہے، یہاں تم ہر لڑکی، ہر عورت کو پھولوں سے لدی ہوئی پاؤ گے۔ لیکن پھر بھی حسن عنقا ہے، حسین عورت بہت مشکل سے دکھائی دیتی ہے، اور پھول لگا کر یہاں کی عورتیں اور بدصورت نظر آتی ہیں، خوبصورت میں اضافہ تو ہوتا نہیں، بدصورتی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس گجراتن کو پھولوں سے محبت ہے، بوڑھا گجراتی اکثر باہر رہتا ہے، عورت دن بھر چارپائی پر لیٹی رہتی ہے، بالکل اوندھی، تکیے پر منہ رکھ کر ٹانگوں کو دن بھر ہلاتی رہتی ہے، آج کل گجراتی نے ایک نوکر رکھ لیا ہے، آج میں نے نوکر کو گجراتن کے لبوں کو چومتے ہوئے دیکھا، پھر دروازے کی چٹخنی بند کر دی گئی۔ کچھ عرصہ تک قہقہوں کی

آوازیں آتی رہیں۔ جب شام کے وقت گجراتن باہر نکلی، تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، آنکھوں میں چمک تھی، جسم میں ناریل سے سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ آنکھوں میں خوشی کے لاکھوں پھول کھلے ہوئے تھے، لیکن یہ خوشی جلد ہی فنا ہوگئی، بوڑھے گجراتی کو اس عشق کا علم ہوگیا اور اس نے نوکر کو نکال دیا۔ آج پھر گجراتن کے لب سوکھے ہوئے تھے، اس کی آنکھوں سے یاس ٹپکتی تھی، اس کی مسکراہٹ میں اُداسی تھی، اس کی باتوں میں غمی کی جھلک تھی، اور اب وہ اکثر بستر پر اوندھے منہ لیٹی رہتی ہے، اور اس کی سڈول پنڈلیاں ہلتی رہتی ہیں۔

تم کہو گے کہ میں محبت کا قصہ لے بیٹھا ہوں، سچ کہوں، برا تو نہ مانو گے، میں ہر طریقے سے کوشش کرتا ہوں کہ عورت کے متعلق کچھ نہ سوچوں، عورت کے متعلق کچھ بھی نہ لکھوں، لیکن ہر بار جب لکھنے لگتا ہوں تو عورت سامنے آجاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے عورت کے بغیر بات پھیکی رہے گی، اچھا آؤ، تمہیں عورت کی دنیا سے دور لئے چلتا ہوں، میں تمہیں اپنے دوستوں سے متعارف کرواتا ہوں۔ جس جگہ میں رہتا ہوں وہ جگہ صرف ایک انسان کے رہنے کے لئے ہے لیکن آج کل اس فلیٹ میں سات انسان رہتے ہیں۔

ان سے ملو۔ یہ ہیں مسٹر چٹرجی، یہ بنگال کے ایک دور افتادہ گاؤں سے چل کر بمبئی آئے ہیں، وہی تلاشِ روزگار...... یہ کوئی نئی بات نہیں۔ انگریز اتنی دور سے چل کر آئے ہیں، اور ایک بنگالی نوجوان بمبئی میں اپنی قسمت آزمانے آیا ہے تو اس میں کیا برائی ہے، چٹرجی کا رنگ سیاہ ہے، جب کبھی وہ سیاہ سوٹ پہنتا ہے اور سگریٹ کا دھواں مُنہ سے نکالتا ہے تو بالکل ریل کے انجن کی طرح دکھائی دیتا ہے، عام بنگالیوں کی طرح دبلا پتلا، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تپِ دق کا مریض ہے، اس کے گال پچکے ہوئے ہیں، چہرے پر ہر وقت مُردنی چھائی رہتی ہے، بازو لمبے اور پتلے، ٹانگیں سوکھی ہوئی، آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ، مگر بے نور، بے جان، کھوئی کھوئی سی، کسی چیز کی گویا، ایک آنے والی امید پر زندہ۔ وہ زمانہ جب بھوک اور بیکاری مٹ جائے گی۔ جب دنیا میں انسانیت کا راج ہوگا، جب ایک نئی زندگی کی صبح ہوگی۔

خیر...... چٹرجی نہایت ہوشیار آدمی ہے، ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے، میں نے اسے کبھی بیکار نہیں دیکھا، مگر حالات یہ ہیں کہ آج تک اسے کوئی روزگار نہیں ملا، وہ بمبئی میں اس لئے آیا تھا کہ وہ ایک کامیاب کیمرہ مین بن سکے، اس کا بھائی فوٹوگرافر تھا، اس نے بھی فوٹوگرافی کا کام اپنے بھائی کی دکان سے سیکھا تھا، وہ اُردو اچھی طرح بول سکتا تھا، ہندی بھی جانتا تھا، ٹوٹی پھوٹی انگلش بھی بول لیتا تھا، اس کے پاس یونیورسٹی کی کوئی ڈگری نہیں لیکن ایک عام گریجویٹ سے بہتر انگریزی بول لیتا ہے۔ ایک بار ایک فلم میں کام ملا تھا، لیکن چند دنوں کے بعد اسے نکال دیا گیا تھا۔ اب ڈائریکٹر بننا چاہتا ہے اس کے بعد پروڈیوسر۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر بن کر دکھائے گا اس کے

پاس کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے پیسے مانگ لیتا ہے، آج کل وہ ایک وقت کا کھانا کھاتا ہے، اس کی صحت روز بروز گر رہی ہے، پچھلے ہفتے اسے زکام ہو گیا اور ساتھ ہی بخار۔ پہلے ہی کون سا طاقت ور تھا، زکام اور بخار نے اسے لاغر کر دیا، دو دن تک اس نے کچھ نہیں کھا۔ اس کی بے نُور آنکھیں اندر دھنس چکی ہیں۔ اس کا چہرہ اور سیاہ ہو گیا ہے۔ اور جب وہ چلتا ہے تو اس کی ٹانگیں کانپتی ہیں، باتیں کرتے ہوئے اس کا سانس پھول جاتا ہے۔ لیکن اسنے بھی ہمت نہیں ہاری، وہ اب بھی کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر ضرور بنے گا، ایک دن فلم ڈائریکٹر ضرور بنے گا، کیا ہوا اگر اس کے پاس پیسہ نہیں، کیا ہوا اگر وہ دن میں ایک بار کھانا کھاتا ہے، وہ فاقے کرے گا، وہ زندگی سے لڑے گا، وہ فلمی دنیا کے ہر شخص سے جنگ کرے گا، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ پروڈیوسر کس طرح پروڈیوسر بن جاتے ہیں، بمبئی میں اگر کوئی پروڈیوسر بننا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ کسی خاتون کو پھانس لے یا وہ اتنا حسین ہو کہ کوئی عورت اسے پھانس لے، چڑ جی نہ خوبصورت ہے نہ جوان، کوئی ذہین، سمجھدار، خوبصورت عورت اس سے عشق نہیں کر سکتی، مگر وہ اپنی دھن میں پکا ہے، اس کا ارادہ چٹان کی طرح مضبوط ہے، مگر کبھی جب وہ بمبئی کے اسٹوڈیوز کے چکر لگا کر تھک جاتا ہے تو کہتا ہے کہ وہ اس زندگی سے اُکتا گیا ہے، وہ کب تک جدو جہد کرتا رہے گا، وہ کب تک لوگوں کی گھرکیاں سنتا رہے گا۔ اسے لوگوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ وہ خودکشی کرے گا، اور جب وہ کرسی پر بیٹھ کر خودکشی کے متعلق سوچتا تو میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر وہ ایک عجیب انداز سے مسکراتا ہے۔ اُف خشک لبوں پر بے جان مسکراہٹ! یہ مسکراہٹ نہیں خون ہے، مسلسل فاقوں کی ایک تصویر ہے، جو زندہ ہو کر اس کے لبوں پر ناچتی ہے، کائنات کا ہر ذرہ خاموش ہے، بمبئی کا ہر سیٹھ زندہ ہے، بمبئی کے ہر ہوٹل میں برقی قمقمے جگمگاتے ہیں، بمبئی کے شراب خانوں میں تِل دھرنے کی جگہ نہیں، ناچ ہوتے ہیں، نگاہوں میں پیاس اور ہوس کی بجلی کوندتی ہے۔ میرین ڈرائیو پر لاکھوں قمقموں کی روشنی پھیلتی ہے۔ اور ہر طرف پھیلتی چلی جاتی ہے۔ سمندر کی لہریں بڑھتی ہیں، شور مچاتی ہیں اور پیچھے ہٹ جاتی ہیں، ٹراموں اور بسوں کی کھڑ کھڑاہٹ مدھم نہیں ہوتی، لیکن یہ شخص اس بے نُور کمرے میں بیٹھ کر کیوں اُداس دکھائی دیتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کیوں مرنے کی تمنا ہے، مگر اس کی اندھی جدو جہد کا کیا مقصد ہے؟ آج کل چڑ جی کھانستا ہے، وہ ہلکی ہلکی کھانسی، خدا بچائے اس کھانسی سے، کیا اسے تپِ دق ہو گیا ہے؟ کیا وہ زندگی میں کبھی ڈائریکٹر بن سکے گا؟ کیا اس کی خواہش کبھی پروان چڑھے گی؟ میرے دوست اکثر چڑ جی کو چڑاتے ہیں، اس سے مذاق کرتے ہیں کہ وہ کب ڈائریکٹر بنے گا، وہ کب پروڈیوسر بنے گا، پھر سب اسے گالیاں دیتے ہیں، اسے گھر سے نکال دینے کی دھمکیاں دیتے ہیں محض اس لئے کہ اس کا کوئی وارث نہیں، اور وہ فلیٹ کا کرایہ ادا نہیں کر سکتا، اور وہ اکثر دوستوں کے دست نگر رہتا ہے، وہ جانتا ہے کہ وہ اس فلیٹ سے نکال دیا گیا تو

وہ کہاں اور کدھر جائے گا، کس جگہ رات بسر کرے گا، وہ غصے میں آ کر خط لکھنے لگتا ہے، کس کو؟ شاید اپنے باپ کو۔ جس نے اسے پیدا کیا، شاید اپنی ماں کو جو کب کی مرچکی ہے، یا اپنے بھائی کو جو ایک دورافتادہ گاؤں میں زندگی کے دن کاٹ رہا ہے، خط لکھو، لکھے جاؤ، دنیا کے ناخداؤں کو خط لکھو، چرچل کو خط لکھو، روز ویلٹ کو تار دو کہ وہ تمہیں پیسے بھیجیں۔ اسٹالن کو خط لکھو جس نے ہندوستان کی آزادی کے متعلق کبھی کچھ نہیں کہا، دنیا کے ہر بڑے انسان کو خط لکھو کہ وہ تمہیں اس زندگی سے نجات دلائے، تم دنیا کے ہر بڑے شخص سے پوچھو کہ تم چٹرجی کیوں اس دنیا میں اکیلے ہو، تم، کیوں فاقے کرتے ہو، کیوں بھوکے رہتے ہو، کیوں سونے کے لئے جگہ نہیں ملتی، لیکن خدا کے لئے خاموش نہ رہو، تم دوستوں کی گالیاں اس خاموشی سے نہ سنو، کیوں اس ذلت کو برداشت کرتے ہو، یہ ذلت مجھے ناگوار معلوم ہوتی ہے، ناگوار ہی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے، میں یہ سکوت برداشت نہیں کرسکتا، اور کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ ان سب لوگوں کو بالکونی سے نیچے پٹک دوں۔ دنیا میں ہر شخص کمینہ ہے، رذیل ہے........!

دنیا میں ایسے نظام کی ضرورت ہے، ٹھہرو........ میں اشتراکی بننا نہیں چاہتا، میں فسطائت کا حامی نہیں، میں کسی ازم کا پرچار نہیں کرنا چاہتا، میں کہانی لکھ رہا ہوں، میں کہانی لکھنا جانتا ہی نہیں، میری کہانی میں نہ پلاٹ ہوتا ہے اور نہ میں ماحول تعمیر کرتا ہوں، نہ کردارنگاری کے معجزے دکھاتا ہوں، نہ رنگین عبارت لکھتا ہوں، میں اُردو ادب کی خدمت نہیں کرنا چاہتا، میں لفظ 'خدمت' سے نفرت کرتا ہوں، میں غلط زبان لکھتا ہوں، میں غلط محاورے لکھتا ہوں، مجھے مذکر اور مونث کی کوئی تمیز نہیں، میں نئی نئی تشبیہیں نہیں لکھتا، میں دلکش اسٹائیل کا مالک نہیں، میں موپاساں اور ٹالسٹائی کی طرح بڑا ادیب بننا نہیں چاہتا، میں شہرت کا قائل نہیں........ میرے پاس اس وقت صرف چار آنے ہیں، صرف چار آنے........ میں جو کچھ کہوں گا صاف صاف کہوں گا، میرے خیالات ایک فرد، ایک قوم کے نہیں بلکہ انسانیت کے ترجمان ہیں۔ میں انسانیت کا قائل ہوں اس لئے پوچھتا ہوں کہ اس دنیا میں اتنا ظلم کیوں ہے، اتنی بیکاری کیوں، اس کا جواب تم کیا دو گے، انسانی رہنماؤں اور خداؤں کے پاس اس کا جواب نہیں........ خیر ان سے ملو، ان کا نام ہری چند ہے۔ یو پی ان کا دیس ہے، جنگ شروع ہونے سے پہلے ہری چند اپنے مالدار چچا کے ساتھ سٹہ کھیلتا تھا لیکن جونہی جنگ شروع ہوئی اس کا چچا سٹے میں سب کچھ ہار گیا۔ اور بیچارے ہری چند کو نوکری کی تلاش میں بمبئی آنا پڑا، کچھ عرصہ وہ ڈپو میں کام کرتا رہا لیکن ڈپو کی نوکری موافق نہ آئی، نوکری چھوڑ دی، کسی نے کہا تم ایکٹر بن سکتے ہو، بس پھر کیا تھا، ایکٹر بننے کا جنون سر پر سوار ہو گیا، بمبئی کی آدھی آبادی ایکٹر بننے کی تمنا کرتے کرتے مر جاتی ہے۔ بیچارے ہری کو بھی یہی جنون سوار ہے کاش! اسے اصلیت سے آگاہ کر دیا جاتا۔ مگر انسان اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہے، وہ اصلیت کا کبھی سامنا نہیں کرنا چاہتا، آج کل ہری دن میں دس

بیس بار کنگھی کرتا ہے، آئینہ ہر وقت اس کے ہاتھ میں رہتا ہے، اس کے جسم کی تشکیل میں ایک عجیب نسوانیت کی جھلک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد کم اور عورت زیادہ ہے۔ وہ بال عجیب انداز سے بناتا ہے۔ غسل خانے میں دو دو گھنٹے صرف کرتا ہے اور جب نہا کر باہر نکلتا ہے تو کریم اور پاؤڈر کی آفت آجاتی ہے، چہرے پر کریم ملتا ہے اور ملتا رہتا ہے، اور پھر پنکھے سے ہوا کرتا ہے تاکہ چہرے کی جلد کے مسام میں کریم جذب ہو جائے لیکن کریم کے متواتر استعمال سے ابھی تک رنگت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہری ہر روز دوگنی اجرت پر کپڑے دھلواتا ہے اور روپے گھر سے منگوا کر گزارہ کرتا ہے، لیکن کب تک، پھر سٹہ کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سرکاری نوکری کر کے کوئی انسان امیر نہیں بن سکتا۔ وہ ایک اچھے گھر میں رہنا چاہتا ہے، وہ ریڈیو خریدنا چاہتا ہے، وہ خوبصورت عورتوں سے محبت کرنا چاہتا ہے، بتاؤ ان باتوں میں کون سے بری بات ہے۔ ہر عقل مند شخص ان ہی باتوں کی خواہش کرے گا۔ ہری چند جانتا ہے کہ ڈپو کی نوکری کر کے وہ یہ چیزیں حاصل نہیں کر سکتا۔ اسلئے وہ ایکٹر بننا چاہتا ہے، کیونکہ ایکٹر آج کل ہزاروں روپے کماتا ہے، وہ سٹہ کھیلنا چاہتا ہے، کیونکہ سٹہ کھیلنے سے یا وہ امیر بن جائے گا یا محض بھکاری۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ زندگی سے جوا کھیلنا چاہتا ہے، جس حالت، جس ماحول میں وہ رہتا ہے، اس ماحول میں اسے رتی بھر خوشی نصیب نہیں ہوتی، روز بروز اس کا وزن کم ہو رہا ہے، سر کے بال گر رہے ہیں، آنکھوں میں مایوسی کے آثار نمایاں ہیں۔

وہ کچھ تھکا تھکا سا دکھائی دیتا ہے۔ آج ہری طاقت کی دوا خرید کر لایا ہے، وہ ہر روز اسے استعمال کرے گا اور زندگی کی کشمکش جاری رکھے گا۔ دواؤں کے استعمال سے انسان کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ آخر کب تک......؟ جس ہوٹل میں وہ کھانا کھاتا ہے، وہاں کی خوراک میں غذائیت کا نام نہیں، صاف ظاہر ہے کہ وہ ان مسلسل مصیبتوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ میں نے اسے کئی بار کہا کہ وہ پھر سے ڈپو کی نوکری کر لے مگر وہ ہمیشہ نفی میں جواب دیتا ہے، اور آئینہ کو سامنے رکھ کر مسکراتا ہے، اور اپنے بے جان اور کھردرے بالوں میں کنگھی کرتا ہے، اور زور زور سے کریم ملتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ میں آہستہ آہستہ مرنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ اب میں زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ شام کے وقت میری ٹانگیں ڈگمگاتی ہیں، سر چکراتا ہے، اور ہر روز رات کو بخار ہو جاتا ہے، اور پھر ہلکی ہلکی کھانسی کی شکایت بھی ہے مجھے، لیکن میں ڈپو کی نوکری نہیں کر سکتا، وہ بامشقت قید ہے، میں یہ قید برداشت نہیں کر سکتا.... دیکھو! اس ٹرنک میں میری بی اے کی ڈگری ہے۔ اگر میں مر گیا۔ وہ پھر ہنستا ہے، موٹے موٹے لبوں پر ایک کھسیانی سی ہنسی، جیسے وہ کبھی نہیں مرے گا'' تو یہ ڈگری لکھنو یونیورسٹی کو واپس بھیج دینا، زیادہ عرصہ اسے اپنے پاس نہ رکھنا، ڈگری کا کافی حصہ دیمک چاٹ گئی ہے، اور باقی...... ہے بھی کیا۔

اور میں اسے سمجھاتا ہوں کہ بھائی نوکری کر لو۔ لیکن وہ بالکل نہیں مانتا، اس دورِ ابتلا میں عجیب انسانوں

کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی ہے اور ہر شخص ایک بہتر زندگی بسر کرنے کی فکر میں ہے مگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں دنیا کے انسانوں کی قسمت ہے وہ چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی شہرت، عزت اور رتبے کو برقرار رکھنے کے لئے اسی راستے پر گامزن رہنا چاہتے ہیں، جس پر چل کر کئی صدیوں تک ان کے باپ دادا نے حکومت کی تھی۔

اور رگھبیر سے تعارف کروانا تو میں بھول ہی گیا، رگھبیر تمام دن باہر رہتا ہے، اور تقریباً رات کے بارہ بجے گھر واپس آتا ہے، تم پوچھو گے کہ وہ کیا کام کرتا ہے، تو میں اس کا کچھ جواب نہیں دے سکتا، اس فلیٹ میں جو شخص رہتا ہے اس کے متعلق وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا کام کرتا ہے، دراصل اس فلیٹ میں جو لوگ بستے ہیں وہ کچھ کام نہیں کرتے...... اوتار سنگھ کو چھوڑ کر لیکن اس کا ذکر میں پھر کروں گا۔

رگھبیر کو تم نے نہیں دیکھا، وہ چھوٹا سا قد دور سے دیکھو، ایک خوبصورت کھلونے کی طرح دکھائی دے گا، اس کے بال بھورے، رنگ گورا، اس کی خوبصورتی اس کے سنہری بالوں میں پنہاں ہے، اسے اچھے کپڑے پہننے کا بہت شوق ہے، اور جب کبھی وہ ایک اچھا سا سوٹ پہن کر نکٹائی لگا کر فلیٹ سے باہر نکلتا ہے تو گلی کی تمام نوجوان لڑکیاں اس کی طرف آرزومند نگاہوں سے دیکھتی ہیں۔ اور پھر رگھبیر ایک شعر گنگناتا ہے ''زندگی چاندی سی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں'' اپنی ناکام محبت کے فسانے دوستوں کو سناتا ہے۔ جس لڑکی سے وہ عشق کرتا ہے اس سے ضرور شادی کا وعدہ کرتا ہے، چند دنوں کے بعد عشق کا زور سرد پڑ جاتا ہے، مگر رگھبیر کی جنوں پرور نگاہیں کسی اور لڑکی کو تلاش کر لیتی ہیں۔

آج کل اسے بنگالن سے عشق ہو گیا ہے، رگھبیر کہتا ہے کہ وہ واقعی عشق کر رہا ہے، لیکن ہمیں یقین نہیں آتا، سب ہنس پڑتے ہیں، ہم اسکی گہرائی اچھی طرح جانتے ہیں، وہ ہر روز اپنی محبوبہ کو خط لکھتا ہے اور رات بھر جاگتا رہتا ہے، میں اکثر رگھبیر کی محبت کا مذاق اڑاتا ہوں، لیکن وہ مسکرا کر ٹال دیتا ہے، اور کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔ اسکی ہنسی میں واقعی کچھ مایوسی سی آ گئی ہے۔ کیا رگھبیر بنگالن سے عشق کرتا ہے۔ رگھبیر نے بتایا کہ شروع میں بنگالن جس کا نام گیتا ہے۔ اس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو گئی تھی، گیتا ایک نرتکی ہے، وہ ایک مشہور اسٹار ٹروپ میں کام کرتی ہے، اور بیچارہ رگھوبیر بھی اس ٹروپ میں شامل ہو گیا اور اس بنگالن کی خاطر تمام ہندوستان کا چکر لگاتا رہا۔ لیکن جب ٹروپ کلکتہ پہنچا تو گیتا نے صاف جواب دے دیا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتی۔ شاید گیتا کے چاہنے والوں نے اصرار کیا ہوگا کہ وہ کیوں ایک غریب، آوارہ، لونڈے سے عشق کر رہی ہے، ہماری طرف دیکھو، ان فلک بوس عمارتوں کی طرف دیکھو۔ ان کاروں اور گاڑیوں کو دیکھو، یہ چمکتے ہوئے ہیرے، یہ صوفے سیٹ، یہ رنگین پردے، یہ نوکر، یہ

لونڈیاں، یہ باندیاں، اور طرح طرح کے کھانے، وہ شاعر تمہیں کیا دے گا۔ فقط چند شعر اور کچھ نہیں، اگر تم اس سے شادی کرو گی تو بھوکی مر جاؤ گی، وہ خود بھوکا ہے، تمہیں کیا کھلائے گا، اور پھر وہ بنگالی نہیں، شمالی ہند کی ایک گھٹیا سی ریاست کا باشندہ ہے، اپنے دیس میں رہو، اس کلکتہ میں رہو، یہاں ناچو، گاؤ، لوگوں کو اُلو بناؤ، اور زندگی کے دن ہنسی خوشی بسر کرتی جاؤ، اور بیچارہ رگھبیر جب سے وہ کلکتہ سے واپس آیا ہے، اس کا حلیہ بگڑ گیا ہے، عورت کی بے وفائی نے اسے بری طرح اُداس کر دیا ہے، اب وہ ہر روز شراب پیتا ہے اور رات کے بارہ بجے گھر آتا ہے، پہلے وہ اپنے مستقبل کے متعلق بہت پُر امید تھا لیکن اب اسکے حوصلے بہت پست ہو گئے ہیں، اس کے دل کی ویرانی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ آج وہ رات کے بارہ بجے گھر واپس آیا، اس نے کافی شراب پی رکھی تھی، اس کے منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی، اس کے بھورے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کی پینٹ میلی اور ڈھیلی ہو گئی تھی، کوٹ پر دھبے پڑ گئے تھے، آنکھیں سرخ تھیں، وہ ہنسنا چاہتا تھا لیکن ہنسی لبوں کے قریب ہی رک گئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا کرسی پر گر گیا اور بڑبڑانے لگا۔ یہی کہ وہ بمبئی میں نہیں رہ سکتا، وہ واپس شملہ جائے گا، اسے کیا معلوم تھا شہری لڑکیاں اتنی چالاک ہوتی ہیں، اس نے بوٹ اُتار دیئے اور پسینے سے بھیگی ہوئی جرابوں کو سونگھنے لگا اور پھر جرابوں کو اس نے ایک کونے میں پھینک دیا، وہ شملہ کی حسین وادیوں میں اپنا مسکن بنائے گا، وہ یہاں نہیں رہ سکتا، وہ شملہ کی ایک انجان، الھڑ لڑکی سے شادی کرے گا، اور نمک اور تیل کی دکان کھول لے گا، اور رگھبیر نے کوٹ اتار دیا تھا، قمیض اتارتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا، اسے فلمی دنیا سے نفرت ہو گئی ہے، اور پھر اس نے پتلون بھی اتار دی، اور صرف انڈر ویئر پہنے کرسی پر ڈھیر ہو گیا، اسے اس زندگی سے نفرت ہو گئی ہے، وہ زندگی کو دوبارہ شملہ میں زندۂ جاوید کرے گا، وہ شملہ کی پہاڑیوں کو کبھی نہیں بھول سکتا، اور پہاڑیوں پر پھیلی ہوئی دھند، سفید، ٹھنڈی، نرم و نازک، اس کے ذہن میں اس الھڑ لڑکی کے نقوش ابھر آئے جس نے اسے شہر جانے سے روکا تھا، لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دھند چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور دونوں دھند میں اڑے جا رہے تھے، کدھر، کہاں، رگھبیر نے لڑکی کو اپنی چھاتی سے لگا لیا، لڑکی کی چھاتیاں اس کے سینے سے ٹکرائیں اور ایک غیر فانی نغمہ پیدا کرتی گئیں، لڑکی کے دل کا طوفان اسکی طرف بڑھ رہا تھا، اور دھند چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، لیکن وہ کیا کرتا۔ اس نے لڑکی کے گرم جلتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے، اور دھند کی انتہائی گہرائیوں میں کھو گیا، وہ نرم پتلے ہونٹوں کا مزا، وہ لڑکی کے سینے کا طوفان، اس کی آنکھوں کی عاجزی، رگھبیر کبھی نہیں فراموش کر سکتا، رگھبیر لڑکی کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا آیا، اور اب وہ پھر واپس جانا چاہتا تھا، کیا وہ لڑکی اب بھی انتظار کر رہی ہوگی، شاید۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان ابدی بوسوں کا مزا اب تک لڑکی کے ہونٹوں پر ہو۔ لیکن ...... کون کہہ سکتا ہے کہ کسی زمیندار نے اس لڑکی سے شادی نہ کر لی ہو۔ ایسی حسین

لڑکیوں کو کون کنواری رہنے دیتا ہے، شہر اور گاؤں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں، دونوں جگہ ظلم ہے، ہر جگہ محبت کا گلہ گھونٹ دیا جاتا ہے، اور ظلم واستبداد کی پھیلی ہوئی سیاہی انسانوں کے دلوں کو اور بھی سیاہ کردیتی ہے، رگھبیر نے اب انڈرویئر بھی اتار دیا ہے، اور اب وہ مادرزاد ننگا ہے، اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا ہے، اس کے منہ سے شراب کی بدبو بدستور آرہی ہے، باہر ناریل کے درخت پر اُلو چیخ رہا ہے، اور ہوا زور زور سے سائیں سائیں کررہی ہے۔

بیچارا رگھبیر.......اور پھر اوتار.......بڑی دلچسپ شخصیت رکھتا ہے۔ اوتار سنگھ ایک سرکاری ڈپو میں نوکر ہے، وہ صبح چھ بجے گھر سے نکل جاتا ہے اور شام کے آٹھ بجے واپس آتا ہے، وہ ایک ایسے ڈپو میں کام کرتا ہے، جہاں جتنا زیادہ کام کیا جائے اتنی زیادہ تنخواہ ملتی ہے، اوتار سنگھ زیادہ سے زیادہ روپے کمانا چاہتا ہے، وہ پنجاب کے ایک مالدار جاٹ کا لڑکا ہے، اوتار سنگھ کہتا ہے کہ آج کل اسے ترقی ملنے والی ہے، اور ترقی کی وجہ اس کے صاف ستھرے کپڑے ہیں، اور خاص کر اس کی نیلی نکٹائی جو اس کے سپرانٹنڈنٹ کو بہت پسند ہے، دفتر کا سپرانٹنڈنٹ ایک انگریز ہے، دفتر میں باقی کلرک دھوتی یا پاجامہ پہن کر آتے ہیں۔ اس لئے وہ زیادہ پسند نہیں کئے جاتے، اور چونکہ دفتر میں سردار ہی زیادہ خوش پوش انسان ہے، اس لئے اسے جلد ہی ترقی ملنے والی ہے، اوتار سنگھ خدا پر ایمان نہیں رکھتا، گوردوارے نہیں جاتا، وہ اکثر قینچی سے داڑھی کے بال بھی کاٹ لیتا ہے۔ مگر سکھوں کے متعلق کوئی ریمارک پاس کیا جائے تو وہ برا مانتا ہے، سکھوں کے خلاف کوئی بات پسند نہیں کرتا، وہ ایک مجموعۂ اضداد ہے، اور آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی سخت رجعت پسند ہے۔

آج کل وہ بھی زندگی سے تنگ آگیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فلیٹ کی ہوا میں اُداسی رچ گئی ہے، وہ کہتا ہے کہ اسے ڈپو کی زندگی پسند نہیں، آخر کب تک وہ دن رات کام کرے اور کیوں؟ ڈپو کی کلرکی انسان کو غلام بنا دیتی ہے، اور یہ نوکری کتنی ذلیل ہے۔ اندر جانے کے لئے شناختی کارڈ لانا ضروری ہے، کارڈ دکھا کر اندر جانا پڑتا ہے، پھر رجسٹر پر حاضری لگانا پڑتی ہے، اگر کوئی کلرک ایک دو منٹ دیر سے پہنچے تو اس کی تنخواہ میں سے پیسے کاٹ لئے جاتے ہیں، یہ زندگی نہیں دوست، یہ موت ہے۔ اور پھر ان لمحوں میں کبھی خوشی نصیب نہیں ہوتی، کبھی تو انسان جی بھر کے ہنس لے، کسی عورت سے مسکرا کر بات کرلے، اس کے حسین زندہ بالوں سے کھیل لے۔ کبھی تو عورت کے حسین خطوط کی داد دے سکے، کبھی تو عورت کی دلفریب مسکراہٹ سے لطف اندوز ہوسکے، کبھی تو انسان عورت کے جسم کی گرمی، اس کے بالوں کی خوشبو، اس کی آنکھوں کی دلکشی، اس کی باتوں کی موسیقی سے ہمکنار ہوسکے۔ لیکن اس فلیٹ میں عورت کہاں۔

یہاں تو ہم سب بھوت رہتے ہیں، یا عہدِ پارینہ کے انسان، تم نے بمبئی آنے کے متعلق لکھا

ہے۔ آؤ۔ بڑے شوق سے آؤ، میرے پاس ٹھہرو، جب اسٹیشن سے اترو تو بس میں بیٹھ کر شیواجی پارک کا ٹکٹ خرید لو۔ اور پھر ماہم پوسٹ آفس، ماہم پوسٹ آفس کے سامنے ایک گلی ہے، بس چلے آؤ اس گلی کی طرف، دوسرا مکان نظر آئے گا، اس کی طرف نگاہ اٹھاؤ، آشیانہ بلڈنگ کا نام پڑھ لینا...... اور جونہی داخل ہو گئے، تمہیں ایک پاگل آدمی کا سامنا کرنا پڑے گا، گھبرانا نہیں یہ پاگل خانہ نہیں، یہاں انسان بستے ہیں، یہ پاگل اکثر دروازے کے باہر پڑا رہتا ہے، یہ کیا کرتا ہے؟ روٹی کہاں سے کھاتا ہے؟ اس کا مجھے کوئی علم نہیں، لوگ اسے پاگل کہتے ہیں لیکن میں اسے کبھی کوئی ایسی حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھا، جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ یہ شخص پاگل ہے، اکثر یہ شخص آوارہ پھرتا رہتا ہے، ایک کالی، سیاہ، پھٹی ہوئی قمیض پہنتا ہے۔ اس کے سر کے بال بکھرے رہتے ہیں اور ان میں مٹی جمی رہتی ہے۔ مسلسل فاقوں کی وجہ سے یہ انسان بہت دبلا ہو گیا ہے، میں نے اسے کبھی کسی سے بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا، وہ اکثر خاموش، چپ چاپ لیٹا رہتا ہے اور جب لیٹے رہنے سے تنگ آ جاتا ہے تو گلی میں آ کھڑا ہوتا ہے، اور سر کو جھٹک کر چلنا شروع کر دیتا ہے، یا کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے جیسے زندگی کا سرمایہ کہیں بھول آیا ہے۔ اس کے ساتھ تم ایک کتے کو دیکھو گے، کتا تمہیں دیکھ کر بھونکے گا، کتے کو دیکھ کر خوف زدہ نہ ہونا، کتا ہر نو وارد کو دیکھ کر بھونکتا ہے، اس کی سرخ آنکھوں میں تم غم و غصہ کی جھلک دیکھو گے، اس کے جسم کو دیکھ کر تم آشیانہ بلڈنگ والوں کی بھوک کا اندازہ لگا سکو گے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس گھر کا کتا بھوکا ہے وہاں کے رہنے والے خود کتنے بھوکے ہوں گے۔

نچلی منزل میں ایک میوزک ماسٹر رہتے ہیں، انہوں نے ایک طوائف کو پھانس رکھا ہے، میں نے اس عورت کو اکثر روتے دیکھا ہے۔ اکثر یہ عورت سلاخوں والی کھڑکی میں بیٹھ کر ادھر اُدھر جانے والے لوگوں کی طرف پریشان نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ میوزک ماسٹر ایسی عورت کہاں سے لے آیا اور کس طرح لے آیا۔ میوزک ماسٹر کی شکل ایک بھٹیارے سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن اسکے گھر کے باہر ایک موٹر کھڑی رہتی ہے، یہ موٹر اکثر خراب ہو جاتی ہے، جب رات پڑتی ہے تو میوزک ماسٹر عورت کو کار میں بٹھا کر کہیں لے جاتا ہے، اور رات کے بارہ بجے کے بعد گھر آتا ہے۔ میں نے دونوں کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔ ہر روز کمرے میں سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی ہیں، میوزک ماسٹر کی بیوی زور زور سے چیختی ہے، چلاتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ یہاں سے چلی جائے گی، وہ یہاں نہیں رہ سکتی۔ دونوں خوب زور زور سے باتیں کرتے ہیں، لیکن دوسرے دن پھر اسی کمرے میں رہتے ہیں، سوتے ہیں اور عورت کھڑکی میں بیٹھ کر لوگوں کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟

اب ذرا سیڑھیاں چڑھو۔ دیکھ کر چڑھنا۔ پھسلن ہوگی۔ یہاں ٹھہرو ذرا دم لے لو، ایک ہی بلڈنگ میں تمام ہندوستان کو دیکھ سکو گے، یہاں ایک کرسچن لڑکی رہتی ہے، یہ لڑکی ہے یا عورت ہے یا ماں یا کسی کی بیوی، اس کا

مجھے کوئی علم نہیں، کہتے ہیں اسکے تین بچے ہیں۔ یہ تینوں بچے سیڑھیوں میں کھیلا کرتے ہیں، بچوں کے جسم پر پھوڑے نکلے ہوئے ہیں، کرسچن لڑکی دروازے میں کھڑی ہوکر اپنے بچوں سے انگریزی میں باتیں کرتی ہے، اس کرسچن لڑکی کا کیا نام ہے، نام پوچھنے کی ضرورت کیا ہے، بیچاری کی حالت ابتر ہے، گورنگ سفید لیکن جسم پر گوشت نہیں ہے، چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی ہیں، اور اوپر والے جبڑے کے تین دانت آگے بڑھے ہوئے ہیں، کرسچن لڑکی فراک پہنتی ہے، کاش شلوار یا دھوتی پہنا کرے تو کم از کم اس کی پنڈلیاں تو ہماری نظروں سے اوجھل رہیں، نہایت پتلی پتلی سی ٹانگیں اور کچھ مڑی ہوئیں، جیسے جسم کے بوجھ سے مڑ گئی ہوں، میں نے اس کے خاوند کو کبھی بھی نہیں دیکھا یعنی میں نے اس کے گھر میں کسی مرد کو نہیں دیکھا، بہرحال کوئی مرد تو اس گھر میں آتا ہوگا، ورنہ یہ بچے کہاں سے آگئے، اور بیچاری کرسچن لڑکی گزارہ کس طرح کرتی ہوگی، جب تم پہلی بار آؤ گے تو تم کرسچن لڑکی کو دروازے میں کھڑی پاؤ گے۔ وہ تمہاری طرف دیکھے گی اور منہ موڑ لے گی، وہ ہر روز کس کا انتظار کرتی ہے اس کا مجھے علم نہیں، لیکن اس کی آنکھوں میں اس کے آنے والے محبوب کا انتظار ضرور ہے۔ وہ کب تک انتظار کرے گی؟ میں کیا بتا سکتا ہوں، میں نے ہمیشہ اس لڑکی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے ہمیشہ دروازے میں کھڑے دیکھا ہے۔

کرسچن لڑکی کے دروازے کے سامنے چند مدراسی عورتیں رہتی ہیں بلکہ ایک بیوہ عورت رہتی ہے، جس کی بہت سی لڑکیاں ہیں، لڑکیاں جوان ہیں لیکن وہ شباب ہی کیا جو تمہیں اپنی طرف نہ کھینچ لے۔ وہ عورت ہی کیا جس کی طرف دیکھنے کو جی نہ چاہے، عورت کے حسن میں کشش ہونی چاہیے، اگر تم ایک بار دیکھ لو تو تمہیں یہ محسوس ہوجائے کہ تم ایک زندہ متحرک دائرے کے اندر کھڑے ہو، لیکن آشیانہ بلڈنگ میں حسن مردہ ہے، شباب عنقا ہے، زندگی جامد ہے، میں سمجھتا ہوں کہ زندگی حسن سے پیدا ہوتی ہے۔ خوبصورت چیز کو دیکھ کر خوبصورت بننے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں تو بدصورتی کا مقابلہ ہے۔ لڑکیوں کی ماں بیوہ ہے، اور اس نے اپنی زندگی کے تمام قوانین اپنی بیٹیوں پر عائد کر رکھے ہیں، میں نے لڑکیوں کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا، ان کے گھر سے کبھی قہقہوں کی آواز نہیں آئی، گھر کے دروازے بند رہتے ہیں اور جب کبھی مدراسن کے گھر کا دروازہ کھلتا ہے تو اسمیں سے ایک بیوہ کا چہرہ تمہیں ڈھونڈتا ہے۔ دو موٹی موٹی آنکھیں لمحہ بھر کے لئے چمکتی ہیں، پھر ایک جوان سڈول بازو آگے بڑھتا ہے، اور پھر یہ تمام جسم پیچھے حرکت کرتا ہے، تم نے بیوہ کا چہرہ نہیں دیکھا۔ چہرے پر نفرت کی جھریاں ہیں، مٹتے ہوئے شباب کے آخری لمحے، بیوگی کی تلخیاں، زندگی سے انتہاء نفرت اور ایک نہ مٹنے والی پیاس، اور تشنگی کا اظہار، جو اکثر مدراسن کی آنکھوں سے جھلکتا ہے۔ صرف مدراسن کی آنکھوں سے ہی نہیں، بلکہ اس کا پرتو تم ان جوان لڑکیوں کی آنکھوں میں دیکھ سکتے ہو، صرف آنکھوں میں ہی نہیں بلکہ اس نفرت، پیاس، اس بھوک، اس تشنگی اور بیوگی کی تشکیل، تم ان لڑکیوں کے جسموں میں

دیکھ سکتے ہو، لڑکیاں اکثر خاموش اور اداس رہتی ہیں۔ اور ناریل کے درختوں کی طرف دیکھتی رہتی ہیں۔ ہم سب اپنے کمروں کی چابی مدراسنوں کو دے جاتے ہیں، اگر تم ان لڑکیوں کی جنسی بھوک کا اندازہ کرنا چاہو، تو تم ایک دن کمرے کی چابی خود انہیں دینا، تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کمرے کی چابی دینے کے لئے کتنی بے قرار رہتی ہیں، دروازہ اکثر بند رہتا ہے، آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹاؤ، فوراً دروازہ کھل جائے گا اور ایک بدصورت چہرا تمہاری طرف دیکھے گا۔

چہرا، بالکل بدصورت چہرا، صاف سلیٹ کی طرح، جذبات سے عاری، ہنسی، نہ خوشی، نہ غم، نہ زندگی، نہ موت، بالکل بے حس، بے جان چہرا، اور پھر ایک میلا گندا سا ہاتھ تمہاری طرف بڑھے گا، میری انگلیاں کئی بار غیر ارادی طور پر ان بدنما انگلیوں سے مس ہوئیں، لیکن ایک بار بھی ایسی دھڑکن پیدا نہ ہوئی جو ایک جوان لڑکی کے جسم سے مس ہو کر پیدا ہوتی ہے۔ ان سب لڑکیوں کی شکلیں ایک جیسی ہیں، ان کے چلنے پھرنے کے انداز، ان کے دیکھنے کا طریقہ ایک ہی ہے، وہ تمہاری طرف بار بار دیکھیں گی، لیکن نگاہوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جوانی میں شکست کا احساس ہو چکا ہے، اگر ان لڑکیوں کی تربیت، ان کا ماحول، ان کے رہنے سہنے کے طریقوں کو ایک نئی تربیت، ایک نئی تشکیل دی جائے تو ہوسکتا ہے یہی لڑکیاں آفت کی پرکالہ بن جائیں، اور سوئی ہوئی زندگی میں شعلہ بن کر چمکیں۔

اگر چہ ان کا رنگ سیاہ ہے، لیکن جوانی کو رنگ سے کیا نسبت۔ دور کیوں جاؤ۔ ہمارے محلے میں ایک لڑکی رہتی ہے، جس کا رنگ بالکل ان مدراسنوں سے ملتا ہے، مگر اس کے حسن میں کتنی کشش ہے، جاذبیت ہے، اس کا اندازہ میں ہی لگا سکتا ہوں، یہ لڑکی اکثر سفید ساڑھی پہنتی ہے، سیاہ رنگ اور سفید ساڑھی۔ سفید ساڑھی اور سیاہ رنگ۔ سیاہ رنگ سفید ساڑھی میں خوب چمکتا ہے، خوب پھبتا ہے، لڑکی کو ساڑھی پہننے کا طریقہ خوب آتا ہے، جسم کا ہر خط اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ لڑکی کو بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی ایک مصور ہے۔ جو ساڑھی کو مصور کے برش کی طرح استعمال کرتی ہے۔ ایک ہلکا سا جھٹکا، کہ انسانی جسم نے ایک نئی طرز اختیار کی۔ وہ ہر روز ساڑھی بدلتی ہے۔ کبھی کبھی آسمانی جیسے ناریل کے سبز پتے، کبھی سرخ جیسے شفق کی لالی، سرمئی، نیلا، رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ حسن بدلتا رہتا ہے، جوانی بدلتی رہتی ہے، ہر چیز بدل جاتی ہے لیکن لڑکی کا حسن اسی طرح قائم رہتا ہے۔ اب میرے قریب آؤ۔ وہی لڑکی آ رہی ہے، وہ آ رہی ہے اور آشیانہ بلڈنگ کے سکینڈ فلور کے رہنے والے بالکونی میں کھڑے ہو جاتے ہیں، لڑکی کے ہر قدم کی آواز ان کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو رہی ہے، دور کبوتر ہوا میں پرواز کر رہے ہیں۔ ناریل کے پتے ہوا میں جھومتے ہیں، سورج کی سنہری کرنیں بالکونی میں ناچتی ہیں۔ نگاہیں لڑکی کی طرف لپکتی ہیں، ساڑھی جسم سے چپکی ہوئی ہے، جسم کا ہر خط واضح ہے، پنڈلیوں سے اوپر رانوں

تک اور پھر کولہوں کا سنگم، کتنا دلفریب، کتنا دلکش ہے، مصور کو داد دو، اس کی حنائی انگلیوں کو چوم لو، اگر چوم سکتے ہو، نظر کمر تک جاتی ہے، کمر پر زیادہ گوشت نہیں، اور پھیر سینے کا پھیلاؤ، چھاتیوں کا زیر و بم...... اور سمندر لہریں مار رہا ہے، لہریں آتی ہیں، ساحل سے ٹکراتی ہیں، اور واپس چلی جاتی ہیں، اور اوپر...... ایک چھوٹا سا خوبصورت چہرا، چھوٹے چھوٹے پتلے ہونٹ، اور کسی کی زبان ان پتلے ہونٹوں پر پھرتی ہوئی، نچلا ہونٹ کچھ کچھ کھنچا ہوا، آنکھیں سیاہ پلکیں جوانی کے بوجھ سے جھکی ہوئیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ لوگ دیکھ رہے ہیں، لڑکی شرماتی نہیں، آنکھوں میں مستی ہے، کامرانی ہے، لڑکی کو احساس ہے کہ وہ اپنے حسن سے لوگوں کو مسحور کر سکتی ہے۔ کتنا صحت مند احساس ہے۔ وہ آگے بڑھتی ہے، ہری چند اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک آہ بھرتا ہے۔ اور کہتا ہے ''مار ڈالا۔ مار ڈالا۔ ہائے مار ڈالا'' اور چٹرجی کی ہنسی جیسے مردہ زندہ ہو گیا۔ اور اوتار سنگھ کا جھک کر دیکھنا اور رگھبیر کا شعر پڑھنا ''زندگی چاندی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں'' اور پھر سب کا پیچھے ہٹ جانا اور کرسیوں پر بیٹھ کر گالیاں بکنا۔ خدا کو، تہذیب کو...... سرمایہ داروں کو، ماں باپ کو، سب کو، رگھبیر کا عریاں ہو کر پاگلوں کی طرح کمرے میں چکر لگانا۔ چٹرجی کا کرسی میں دھنس جانا، اوتار سنگھ کا اپنی پگڑی اتارنا اور لمبے لمبے بالوں میں کنگھی کرنا۔ اور میرا لڑکی کی طرف دیکھتے رہنا...... یہاں تک کہ شباب کی خوشبو ہوا میں گم ہو جاتی ہے۔ اور کسی کے قدموں کی مدھم چاپ آہستہ آہستہ خاموش ہو جاتی ہے...... اور صرف گالیوں کی آواز مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح دماغ سے ٹکراتی رہتی ہے، ابے او حرام زادے! ابے۔ او اُلو کے پٹھے...........!

☆☆☆

مہندر ناتھ کی تصانیف ایک نظر میں:

ناول: آدمی اور سکے۔ رات اندھیری ہے۔ سُورج ریت اور گناہ۔ پیار کا موسم۔ ارمانوں کی سیج۔ لیڈر۔ پتھر کے بُت۔ بھائی جان۔ یہاں سے وہاں تک۔ اسکینڈل۔

افسانے: جہاں میں رہتا ہوں۔ نیا بھکاری۔ دو بیل۔ چاندی کے تار۔ ایک دو تین۔ شرافت۔ مائی ڈارلنگ ہوٹل۔ جنوب کا ساتھی۔ سہارا۔ پھر کوئی نہیں آئے گا۔ ہم نے کار خریدی۔ اگر میں مر جاؤں۔ گاڈ بلس یو۔ چائے کی پیالی۔ ڈیڑھ روپیہ۔ لیجئے ہم نے پھر عشق کیا۔ گالی۔ حنائی اُنگلیاں۔ دی بلیو پرنٹ۔ ممی۔ بے ڈھنگا آدمی

فلمیں: مُنّا۔ نقلی نواب۔ باغی شہزادہ۔ گستاخی معاف۔ اُمید۔ من چلی۔

ادھ جلی رات

ٹھاکر پونچھی

آدھی رات کی بھیگی بھیگی سی چاندنی میں اس نے فلورا کو ایک نئے رنگ وروپ میں دیکھا۔ ایک اُداس تھکی سی متین صورت، سفید لٹھے کی شلوار، چھینٹ کی قمیض، گردن کے گرد لپٹا ہوا ریشمی دوپٹہ اوران پر بکھری ہوئی آوارہ زلفیں، اور دیکھنے کا شرمیلا الھڑ سا انداز جیسے پہلی بار گھر کی چار دیواری سے نکلی ہو، جیسے پہلی بار نظریں کسی سے ٹکرائیں ہوں۔ اب اس کے سامنے ہوٹل کے نشہ آلود ماحول کی فلورا نہ تھی، اس کے خوابوں کی ایک سیدھی سادھی دیہاتی لڑکی تھی۔ اور چاروں طرف آدھے چاند کی کھلی پہاڑی فضا۔ وہ فلورا کے شفاف معصوم چہرے سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکا۔ یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ فلورا کی پلکوں کے جھکاؤ میں کہاں کہاں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ کہاں کہاں کی تہذیبیں آکر ستاتی ہیں۔ وہ کچھ جاننا چاہتا تھا۔ لیکن کئی سوال ایک ساتھ شعور میں ابھرے، دب گئے، وہ اپنی زبان نہ کھول سکا، صرف خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ اسے ان پستیوں اور تنہائیوں میں اتارتا رہا جہاں اس کا ایک چھوٹا سا گھر تھا..... جہاں

کچھ ان کے بارے میں:

نام: ٹھاکر پونچھی (جگن ناتھ ٹھاکر)

والد کا نام: بھیم سین

پیدائش: محلہ جرنیلاں، (پونچھ)

تعلیم: بی۔اے

تصانیف: زندگی کی دوڑ (افسانے) ڈیڈی (ناول) وادیاں اور ویرانے (ناول، ہندی، ڈوگری) رات کے گھونگھٹ (ناول) قفس اُداس ہے (ناول) کلیوں کا مزار (ناولٹ) چناروں کے چاند (افسانے) یہ رشتے یہ لوگ (ناولٹ) شمع ہر رنگ میں جلتی ہے (ناول) زلف کے سر ہونے تک (ناول) یادوں کے کھنڈر (افسانے)

ادبی زندگی کا آغاز: 1940ء

پیشہ: نیوز اناؤنسر، ریڈیو کشمیر جموں

ذریعۂ اظہار: اُردو، ڈوگری، ہندی، پنجابی

برسوں سے پازیب کی نقرئی جھنکار کی ضرورت تھی تاکہ برسوں کی زنگ آلود تنہائیاں، جھنجھنا اٹھیں، برسوں کی منجمد تاریکیاں یکبارگی جل اٹھیں.......

رات نے آنکھ جھپکی

پازیب بج اٹھی

نئی فلورا اس پر جھکی ہوئی تھی، پرانی فلورا اب بھی ہوٹل میں رقص کر رہی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں ڈوبا بیٹھا رہا۔

اس نے فلورا کو تب بھی دیکھا تھا جب وہ دس بارہ برس کی تھی، اور ایک کریہہ صورت ادھیڑ عمر مرد کا ہاتھ تھامے شہر کے بڑے بازار میں گھوما کرتی تھی اور جسے دیکھنے کے لئے وہ غیر اختیاری طور پر ہر روز ایک اندھیرے نکڑ پر کھڑا رہتا تھا، جسے دیکھ کر اپنی اجنبی صورت فضاؤں میں محسوس کرتا، جیسے وہ ان لوگوں سے بچھڑا ہوا نہیں ہے، اپنے پہاڑی کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے دور نہیں ہے۔ فلورا اسے اپنی دل کی دھڑکن معلوم ہوتی، اسے دیکھ کر ٹھٹھک جاتی، شرما کر مسکرا دیتی جیسے بچپن کی کوئی یاد ہو، جسے اچانک پہچان لیا ہو۔

اس نے فلورا کو تب بھی دیکھا تھا جب وہ ایک حسین سی جوانی کو اپنائے ہوئے تھی، جس کے بوجھ تلے دبی دبی سی لگتی تھی، اور ایک نوجوان اور خوش شکل لڑکے پر جھکتی جھکتی سی، اپنے پرانے راستوں کو نئے قدموں سے ناپنے کی جسارت کیا کرتی تھی، اور کبھی کبھار اندھیرے اجالے میں نظروں سے نظریں ٹکرا جاتی تھیں، ٹھٹھک کر رہ جاتی تھی، گھور گھور کر دیکھنے لگتی جیسے بیتی عمر کے لمحے آنکھوں کے سامنے تھر تھرا اٹھے ہوں۔

اور پھر ایک رات اس نے فلورا کو شہر کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں رقص کرتے دیکھا، آنکھوں کے سامنے وقت اور عمر کی دھند چھائی ہوئی تھی، لیکن وہ اسے پہچان گیا، اسے نئے ماحول میں، ایک نئے روپ میں دیکھ کر جھینپ گیا۔ محسوس ہوا جیسے اس کا اپنا عمروں کا پیار نیم عریاں لباس میں بک رہا ہو۔ اس رات اپنے اندھیرے کمرے میں بیٹھا ساری رات جاگتا رہا۔ فلورا کے بارے میں سوچتا رہا، جب بھی ملی ایک نئے اجنبی روپ میں ملی، اس نے ہوٹل میں نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن دوسرے روز شام ڈھلتے ہی غیر اختیاری طور پر وہاں پہنچ گیا جیسے اس نے خود ہی اپنے پیار کی نیلامی میں حصہ لینے کا ارادہ کر لیا ہو۔ اس کے بعد بلا ناغہ جانے لگا، ایک کونے میں اکیلا بیٹھا رقص دیکھتا اور چلا جاتا۔ ابھی شاید فلورا کا رقص ہی بکتا تھا جسم نہیں۔

اور آج آدھی رات کی بھیگی بھیگی سی چاندنی میں وہ لمحے اس کی نگاہوں کے سامنے کسمسائے، جب برسوں کی تمنا پوری ہوئی۔ جب فلورا نے اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کیں، بلا جھجک جیسے اسے پہچان لیا ہو، جیسے برسوں سے اسے جانتی ہو، قریب سے دیکھنے کی تمنائی ہو۔

''میرا نام تو سب جانتے ہیں، تمہارا نام کیا ہے''

''کشور''

''دیر تک ہوٹل میں بیٹھے رہتے ہو، اکیلے ہو؟''

''ہاں''

''کوئی ایسا ساتھی بھی نہیں جو وقتی ساتھ ہی دے سکے، جیسے اس ہوٹل کی راتوں میں......''

اس نے بات کاٹ دی۔

''میں ایسے ساتھی کا قائل نہیں''

فلورا اس پر جھک گئی۔

''میں نے پہلے بھی کئی بار تمہیں دیکھا ہے، ہر عمر میں دیکھا ہے''

اس نے اپنی بات کہی۔

''آج بارہ بجے کے بعد ہوٹل ریزرو ہے''

''ہاں''

''آج رقص نہیں ہوگا؟''

''رقص بھی آج ریزرو ہے''

''کس کے لئے؟''

''ایک برات کے لئے''

''یہ کون سی نئی بات ہے، برات تو یہاں روز آتی ہے''۔ فلورا نے بچوں کی طرح معصوم ہنسی ہنس کر کہا۔

''اور شادیاں بھی روز ہوتی ہیں''

''میں سمجھا نہیں''

فلورا نے لہجہ بدل کر کہا ''تم یہاں کس کے لئے آتے ہو، کیوں آتے ہو؟''

''ایک بار کسی کو ڈھونڈنے آیا تھا، تمہیں دیکھا، تب سے روز آتا ہوں''

''میرا رقص دیکھنے؟؟''

''نہیں''

''پھر''

''صرف تمہیں دیکھنے''

''میرا رقص پسند نہیں''

''میں نے تمہارا رقص کبھی نہیں دیکھا۔ صرف ایک خاموش، ساکن بُت دیکھا ہے''

''تم رقص کے گاہک نہیں، میرے اس......''

اس نے بات کاٹ دی۔

''برات نہیں آئی؟''

ہوٹل کا بیرا آ گیا

''منیجر صاحب بلاتے ہیں''

فلورا منیجر کے کمرے کی طرف لپکی

ایک ملاقات ختم ہوگئی، ایک انتظار شروع ہوا۔

آنکھوں کے سامنے ہوٹل کی چار دیواری پھیل گئی، وہ ملاقاتیں ابھریں جن میں کبھی آنکھوں سے باتیں ہوتیں، کبھی مسکراہٹوں سے، اور کبھی کبھار رقص اور سنگیت کی بھاشا میں، کشور کیا چاہتا تھا، اس جیسے تھکے ہارے انسان کا فلورا کی زندگی سے کیا لگاؤ تھا، اسے خود معلوم نہ تھا، فلورا اس میں کیوں دلچسپی لے رہی تھی، شاید وہ بھی نہ جانتی تھی، لیکن کہیں کسی عمر، کسی کے ساتھ ملائم دھاگا ضرور تھا جو دونوں کے دلوں کے بیچ کسی پرانے جنم کے رشتے کو غیر محسوس طور پر استوار کر رہا تھا۔

آج ہوٹل پھر خالی تھا، آج پھر کسی برات نے آنا تھا، آج پھر فلورا اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

''آج بھی کسی بارات نے آنا ہے؟''

فلورا نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''ہاں لیکن تم کس سوچ میں ہو''

''پہلے آج کی برات کی سوچ رہا تھا، اب اس عمر کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو دیکھتے دیکھتے ڈھل گئی، جو دیکھتے دیکھتے جوان ہوگئی، ان فاصلوں کے متعلق سوچ رہا ہوں، جنہیں وقت کی دھند پلک جھپکتے ہی ناپ لیتی ہے، کتنے بد صورت فاصلے تھے، کتنی خوبصورت دھند تھی۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، ہوٹل کی خاموش چار دیواری میں گھنگھرو سے بج اٹھے۔ دیر تک ہنستی رہی جیسے کسی بھولی بسری یاد نے ان نیم وا آنکھوں کو سپنوں میں الجھا کر ہونٹ چوم لئے ہوں۔

ہنستے ہوئے فلورا نے کنکھیوں سے دیکھا۔

''تم بھی روشن کی طرح بہکی بہکی باتیں کرتے ہو، آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے ہو۔ مجھے ان باتوں اور مسکراہٹوں سے سخت چڑ ہے، درحقیقت اب میں ہر ایک خوبصورت چیز سے نفرت کرتی ہوں، اپنی پسند کی چیزوں سے نفرت کرتی ہوں''

کشور چونکا، بہت پیچھے ہٹ گیا۔

''میں ان بہکے ہوئے قدموں کو جانتا ہوں، میں نے ان قدموں کو تمہاری جوان عمر کے ساتھ اٹھتے دیکھا ہے''

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''مجھے بھی خوبصورت چیزوں سے پیار تھا لیکن اب.....!''

''تم خود بھی تو خوبصورت ہو''

''مجھے اپنے جسم سے نفرت ہے''

''کیوں؟''

''اپنے پیار نے مجھے یہی سکھایا''

''کون تھا وہ؟''

فلورا نے اپنی بات کہی۔

''شاید اس نے اپنے لئے رقص سکھایا تھا، گیت دیئے تھے، اپنے لئے ہی نیم عریاں لباس پہنایا تھا، اور دوسروں کی دولت تو برداشت کر سکتا تھا، لیکن نگاہیں برداشت کرنے کی سکت نہ تھی، ایک دن بھاگ گیا، میرا سب کچھ اپنے ساتھ لے گیا، اپنا سب کچھ میرے پاس چھوڑ گیا''

کشور خاموش رہا۔

فلورا نے اپنی بات جاری رکھی۔

''پیار بھی اتنا جھوٹا اور کمزور ہو سکتا ہے، اتنا تنگ دل ہو سکتا ہے، کبھی سوچا نہ تھا، جھوٹے پیار کا آج بھی مجھے انتظار ہے، ایک بار پھر دھوکا کھانا چاہتی ہوں، جس کے ساتھ ایک رات نیم عریاں لباس میں ہوٹل میں داخل ہوئی تھی، اس کے ساتھ باہر نکلنا چاہتی ہوں اور باہر نکل کر......''

فلورا نے جیسے ایک ہی گھونٹ میں اپنے سارے آنسو پی لئے۔ وہ اس کی آنکھوں میں روشن کے نقوش ڈھونڈنے لگا، جواب دھندلے دھندلے سے، پھیکے پھیکے سے تھے۔

''تم اکیلی رہتی ہو؟''

فلورا نے اپنی کہی۔

''میں نے پازیب کی آرزو کی تھی، گھنگھرو ملے، میں نے چھوٹے سے پرسکون گھر کی تمنا کی تھی، ہوٹل کشادہ، مترنم، چاردیواری ملی''۔

کشور نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ''میں تمہیں گھنگھروؤں کی جگہ پازیب دوں گا۔ ہوٹل کی چاردیواری سے نکال کر ایک چھوٹا سا گھر دوں گا''۔

فلورا نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''وہاں اکیلی رہتی ہو؟''

''پہلے ہم دونوں رہتے تھے، روشن چلا گیا، ماسٹر جی کو لے آئی، اس کی وائلن کو لے آئی جس کی چیخوں سے کبھی مجھے نفرت تھی، اب پیار ہے۔ جانتے ہو کیوں؟''

کشور خاموش رہا۔

''صرف اس لئے کہ روشن کو ماسٹر جی پسند نہ تھا اس کی وائلن''

وہ اس کے ماسٹر جی کو پہچانتا تھا، کالا بھجنگ، چیچک زدہ چہرا، نشے میں سُوجی ہوئی موٹی موٹی عقابی آنکھیں جو اس کی گھناؤنی صورت کو زیادہ بھیانک بنا دیتی تھیں۔ ماسٹر جی واقعی کریہہ صورت تھا۔ نفرت کرنے والی چیز تھی۔

کشور نے خشک گھونٹ بھرا۔

''تم اتنی خوبصورت ہو، اور ماسٹر جی اور پھر میں بھی تو......''

اس نے بات کاٹ دی۔

''وہ ایک سنگتراش ہے اور میں بُت۔ بات معصوم دل اور پوتر ہاتھوں کی ہے، سیاہ چہرے کی نہیں''

وہ چلی گئی۔

گیارہ بجے برات آنا تھی۔

کشور سر جھکائے اپنے اندھیروں کی طرف نکل گیا۔

پُرانی عمر کی پُرانی ملاقاتوں کی باتیں تھیں۔ عمر جو بیت چکی تھی، ملاقاتیں جو ختم ہو چکی تھیں، آج آنکھوں کے سامنے نئے عمر تھی، ایک نئی ملاقات تھی، جوان، حسین اور پُرسکون!

آج ایک نئی عمر ایک نئی ملاقات اس پر جھکی ہوئی تھی، اس کی خاموشیوں میں اپنی زندگی کے ہنگامے ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ گھبرا گیا، وہ خیالی دنیا سے اپنی حقیقی دنیا میں آ گیا۔

''آج تم اُداس اُداس اور بدلی بدلی سی دکھائی دے رہی ہو، میرے ذہن سے تمہارا نقشہ اُتر گیا۔ ایک نیا نقشہ میری آنکھوں میں سما گیا''

وہ شرما گئی۔

''اپنے گھر میں ہوں اور پھر تم میرے دل کے گاہک ہو، رقص کرتے ہوئے جسم کے نہیں''

کشور اس کے دل کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

فلورا نے جھنجھوڑا۔

''کیا پیو گے؟''

کشور نے جذباتی انداز اپنا لیا۔

''میں تمہیں اپنے گھر میں دیکھنا چاہتا تھا، دیکھ لیا۔ مجھے بہت کچھ یاد آ گیا۔ میں بہت کچھ بھول گیا حالانکہ......''

فلورا نے بات کاٹتے ہوئے کہا ''میرا ساتھ نہیں دو گے؟''

''لیکن تم تو......!''

اس نے کشور کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کل اور آج میں بڑا فرق ہے۔ کل میں کچھ اور تھی، آج بالکل بدل گئی ہوں، تم میرے ساتھ ہو، اپنا کوئی ساتھ ہو تو پستیوں میں اترنے میں بھی مزا آتا ہے۔ پھر تم بالکل روشن کا دوسرا روپ ہو، پیارا خوبصورت روپ!''

وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی، جیسے اس نے کوئی عزیز ترین شئے کھو دی ہو۔ جیسے اسے کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔

کشور خاموش بیٹھا رہا، ان لمحوں کا انتظار کرتا رہا جو ہر سوال کا جواب اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ فلورا کو بھی شاید ویسے ہی لمحوں کا انتظار تھا، خاموش بیٹھی چھوٹے چھوٹے گھونٹ حلق سے نیچے اتارتی رہی، حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی بکھری ہوئی بدلیاں چاند کی سیمیں وسعتوں میں سما گئیں۔ چاندنی یکبارگی کھل اٹھی، فلورا کی موٹی موٹی آنکھیں جھکتی گئیں۔ برف جیسے سفید اُداس چہرے پر شفق کی لالی اور شوخی تھرتھرانے لگی....وہ خاموش بیٹھا دل ہی دل میں پوچھتا رہا......فلورا! میں نے تمہیں پانے کے لئے آج تک کی عمر کھوئی ہے، میں تم سے پیار کرتا ہوں، میں نے تمہاری یادوں کے سہارے آج تک کی اپنی تاریک تنہائیاں کاٹی ہیں۔ کیا تم بھی روشن کو بھول کر مجھے اپنانے کو تیار ہو؟

فلورا گنگنانے لگی۔ شاید روشن کا گیت تھا، شاید روشن کی یاد تھی، جو گیت کے بول بن کر اس کے ہونٹوں پر

گنگنانے لگے تھے۔

کشور نے دبی زبان میں پوچھا۔

''تمہارا اب اس دنیا میں کوئی نہیں؟''

فلورا نے اپنی بات کہی۔

''بیمار باپ نے روشن سے ملایا، روشن نے ماسٹر جی سے، پھر دونوں نے مجھے ہوٹل، رقص اور نیم عریاں لباس دیا۔ کیا میں اب بھی اکیلی ہوں''؟

فلورا جذباتی ہوگئی، اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ اس نے موضوع بدلا۔

''پہلی بار میں نے تمہیں لڑکپن کے لباس میں دیکھا تھا....... چبھن سی محسوس ہوئی۔ رات بھر سوچتا رہا، دوسری بار جوانی کے لباس میں دیکھا، دل ڈوبنے لگا، رات بھر ڈوبتے دل کو سنبھالتے سوچتا رہا، اور پھر ایک رات رقص کے نیم عریاں لباس میں دیکھا، دل نے ساتھ چھوڑ دیا، دماغ نے چھوڑ دیا سوچوں نے ساتھ چھوڑ دیا، لیکن آج.......''

وہ روتے روتے مسکرا اٹھی۔

''کل تم نہیں آئے، کل بھی ایک بارات آئی تھی''

''کس کی تھی؟''

''اپنی رات کی ہی برات تھی''

''میں سمجھا نہیں''

اس نے تھکی ہوئی آواز میں اپنی بات جاری رکھی۔

''بہت ہی خوبصورت دولہا تھا، بہت ہی حسین دلہن تھی، میری طرح کی ہی ایک لڑکی تھی، زیوروں سے لدی ہوئی بیوی بنی بیٹھی تھی۔ کسی کے گھر کی بہو بنی بیٹھی تھی، ایک دن آئے گا جب اس کے سپنے پورے ہوں گے۔ جب وہ اپنے بچوں میں گھری......'' فلورا بہت زیادہ جذباتی ہوگئی۔

کشور نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''اندر چلو، تمہیں آرام کی ضرورت ہے''

فلورا نے رُندھی ہوئی آواز میں اپنی بات جاری رکھی۔

''دولہا دلہن کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر اپنا رقص بھول گئی، گیت کے بول بھول گئی، روشن بہت یاد آیا، غریب، معصوم سپنوں کا شیدائی روشن۔ جو میرے لئے گیت لکھتا تھا، جو میری آنکھوں پر جھک کر مجھ سے کہتا تھا۔ فلورا! تمہاری ان

نیلی آنکھوں میں میرے گیتوں کی تکمیل ہے، میرے سپنوں کی تعبیر ہے....... فلورا! یہ وقتی تاریکیاں ایک دن مٹ جائیں گی اور ہماری زندگیوں پر صبح کی شفق دور دور تک پھیل جائے گی......''

وائلن کے تار ایک ساتھ فضا میں بج اٹھے۔

وہ چونکی۔

''ماسٹر جی آ گئے۔ آؤ کمرے میں۔ ایسی راتیں بار بار نہیں آتیں، کون جانتا ہے کل کس کی برات آئے۔ آج میں رات بھر ماسٹر جی کی وائلن پر تمہارے سامنے ناچنا چاہتی ہوں۔ صرف اس لئے کہ تم میرے رقص کے گاہک نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میرے دل کے گاہک ہو، مجھ سے پیار کرتے ہو، اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کل تم بھی نہیں آ ؤ گے، میں انتظار کروں گی، تمہارا نہیں، تمہارے پیار کا، صرف تمہاری برات کا، ایک چھوٹی سی معصوم دلہن کا۔ تم نہیں ہو گے، صرف تمہارے پیار کی پرچھائی ہو گی''

ماسٹر جی کو جیسے فلورا کا ہی انتظار تھا۔ اسے دیکھتے ہی وائلن کے تاروں کی تھرتھراہٹ تیز ہو گئی۔ فلورا کے پاؤں آہستہ آہستہ تھرکنے لگے، زلفیں چہرے پر اترنے لگیں اور دوسرے ہی لمحے وہ سراپا رقص بن گئی، سارا چہرا پسینے سے تر بہ تر ہو گیا۔ دیر تک ناچتی رہی، ناچتے تھرکتے حواس باختہ ہو کر چیخی۔

''جانتے ہو، کل رات کی برات کا دولہا کون تھا؟''

وائلن کے سارے تار ایک ہی بار جھنجھنا کر ٹوٹ گئے۔ ماسٹر جی نے وائلن کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

کشور کی آنکھوں کے سامنے جیسے رات ٹوٹ کر بکھر گئی۔

وہ ہانپتی ہوئی بولی ''روشن''

کشور کا جیسے دل ہی ڈوب گیا۔ فلورا کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

''روشن کی طرح تم بھی مجھ سے پیار کرتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ اس پیار کے پیچھے برسوں کی منتظر نگاہوں کا احساس ہے لیکن میں تمہاری عمر سے کبھی شادی نہیں کروں گی، اس عمر سے شادی کروں گی، اُس مکروہ جسم کو اپناؤں گی جس سے روشن کو نفرت تھی، جس سے تم بھی نفرت کرتے ہو، اپنے خوبصورت جسم سے نہیں بلکہ بدصورت پیار سے انتقام لینے کے لئے......'' فلورا بڑبڑاتی ہوئی ماسٹر جی کے قدموں پر گر گئی۔ ماسٹر جی وائلن سینے سے لگائے کھڑا رہا۔ اس کا چیچک زدہ چہرا مسکرا رہا تھا۔ کشور محبت کی پرچھائیں کو سینے سے لگائے باہر نکل گیا۔ آج اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی دیرینہ ساتھی ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا تھا۔ لیکن بچھڑنے والے کا اسے نام یاد نہ تھا۔ شاید اس کی اپنی کوئی دیرینہ آرزو بچھڑ گئی تھی، اور شاید وہ آج خود ہی اپنی ذات سے بچھڑ گیا تھا، ہمیشہ کے لئے مر گیا تھا! ☆☆☆

اُردو ادب کو پونچھ دین

دیانند کپور

قلعۂ معلّٰی کی اُردو، میرؔ، غالبؔ، داغؔ، کی آبِ کوثر سے دھلی ہوئی زبان اُردو جو دیارِ ہند کے زعفرانی میدانوں، دہلی، لکھنو کے شیش محلوں میں پروان چڑھی اور آج مشرق و مغرب میں بلند و عالم گیر زبان کا سکہ منوا کر دینا بھر کے مشہور اداروں اور بلند پایہ دانشوروں سے خراجِ تحسین حاصل کر رہی ہے۔ تہذیب و تمدن سے پچھڑا پونچھ اُردو کی شانہ گیری کا دعویٰ کرے تو بخدا یہ تو ایسا ہے جیسے کیا پدی کیا پدی کا شوربہ؟۔ لیکن اس حقیقت، اس معجزے سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ اُردو ادب کو پونچھ کے کوہساروں نے چاند سورج کی وہ جوڑی یا دو کوہ نُور ہیرے دیئے جن کی آب و تاب نے اُردو ادب کے پرستاروں کو چندھیا دیا اور ملکۂ ادب کے تاج زرنگار میں دو کوہ نُور ہیروں کی چمک دمک سے ایوانِ ادب جگمگا اٹھا۔

زباں میری پہ یوں بار خدا یہ کس کا نام آیا۔ زبان پر ایک نام۔ خلدِ آشیانی کرنل چراغ حسن حسرت ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کا ہے، دوسرا نام

کچھ ان کے بارے میں:

نام: دیانند کپور

قلمی نام: دیانند کپور

پیدائش: 1909ء

ادبی زندگی کا آغاز: 1926ء میں ہفت روزہ پربھات کے اجراء کے ساتھ۔

تعلیم:

ادیب فاضل۔ میٹرک (لاہور)

پیشہ:

صحافت۔ ریڈیو کشمیر سرینگر سے وابستہ رہے۔

ذریعۂ اظہار:

اُردو

تاریخ وفات: 19 جولائی 1981ء

کرشن چندر ایم اے، صدر کُل ہند انجمن اُردو کا ہے۔ یہ دو نام اُردو ادب کو پونچھ کی دین ہیں۔ ان دو ناموں کی تاریخ اُردو ادب کی وہ تاریخ ہے جو قبول عام اور بقائے دوام کی سند حاصل کر چکی ہے۔

حسرتؔ اور کرشن چندر دونوں شہر پونچھ کی گلیوں میں پروان چڑھے، دونوں نے اسی پونچھ میں تعلیم کی ابتدائی منزلیں طے کیں۔ یہیں سے جا کر راولپنڈی مین میٹرک کے امتحان دیئے اور پنجاب یونیورسٹی سے سندیں پائیں۔ اس زمانہ میں پونچھ میں کوئی کالج نہ تھا۔ دو ہائی اسکول تھے وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول اور انجمن اسلامیہ ہائی اسکول۔ کرشن چندر کے والد پونچھ کے سکھد یو ہسپتال میں سرجن تھے۔ اس لئے کرشن چندر مالی لحاظ سے آسودہ تھے۔ لیکن بیچارے حسرتؔ مالی اعتبار سے بڑے غیر آسودہ تھے۔ کرشن چندر کالج کی تعلیم پانے کے لئے پہلے لاہور اور پھر کلکتہ جا پہنچے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے انہوں نے انگریزی میں ایم اے کی ڈگری لی۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ لاہور اور کلکتہ مین انگریزی دورِ تعلیم میں ہی کرشن چندر اُردو افسانہ نگاری کے میدان میں قدم بہ قدم بڑھ رہے تھے۔ لاہور کے ادبی ادارے کرشن چندر کے افسانوں کے طلب گار تھے اور کرشن چندر کی شہرت کا چرچہ اوسط درجے کے ادبی رسالوں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس زمانے میں کسی فرانسیسی افسانے کا ترجمہ یا چربہ میں نے ''پربھات'' کے سالانہ نمبر میں اشاعت کے لئے پایا، حسرتؔ پاس بیٹھے ہوئے تھے، میں نے مسودہ دیکھا تو معنی خیز مسکراہٹ سے کہا ''ہاں اٹھان اچھی ہے''۔ کرشن چندر بولے ''پورا پڑھ تو لیجئے''۔ جواب میں حسرتؔ چپ رہے۔ میرے اصرار پر دوبارہ مسودہ دیکھا۔ عنوان سے لے کر آخر تک کانٹ چھانٹ کی ضرورت ہے۔ یہ زحمت کون اٹھاتا۔ عنوان بدل دیا ''تین بندوقچی''، پہلا عنوان تھا ''تین آدمی''۔ یہ کرشن چندر کا پہلا افسانہ تھا۔ جو پونچھ کے اُردو اخبار میں چھپا اور اُردو ادب میں خشتِ اول بنا۔

حسرتؔ بصد یاس و حسرت پہلے پریس میں نائب کاتب اور پھر اسلامیہ اسکول میں مدرس رہے۔ تنخواہ بیس روپے ماہوار، بیوہ ماں، دو چھوٹے بھائیوں کا بوجھ سر پر تھا۔ گزارہ مشکل تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ انجمن کے صدر سے الجھے اور بات بگڑ گئی۔ جب حسرتؔ صاحب کو کچھ نہ سوجھا تو پونچھ سے راہِ فرار اختیار کی۔ چار مہینے جائے پناہ کی کھوج ہوتی رہی۔ آخر سی ایچ بٹلر ہائی اسکول شملہ سے میرے نام خط آیا۔ معلوم ہوا آوارۂ وطن حسرتؔ کسی پادری ماسٹر کی توسط سے ایچ بٹلر ہائی اسکول میں ماسٹر جی بنے ہیں۔ اور منشی فاضل کے امتحان کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ شملہ سے لاہور دور نہ تھا۔ پہلے منشی فاضل، پھر انگریزی میں بی اے کی سند پنجاب یونیورسٹی سے پائی۔ لاہور کا اُردو ادبی ماحول اور ادبی محفلیں عروج پر تھیں۔ حسرتؔ اس ماحول میں چھا گئے۔ ڈاکٹر اقبالؔ کی محبت دیوانے پر ہُو کا کام کر گئی۔ جب مولانا ابو الکلام اور ''الہلال'' کی شہرت سنی تو کلکتہ جا پہنچے، الہلال میں کچھ دن کام کیا۔ آزادؔ کے

اس قدر نزدیک ہو گئے کہ ''ارے بھائی حسرت'' کے سوا مولانا کی زبان پر دوسرا کوئی جملہ نہ تھا۔ کلکتہ میں ہی روزانہ اخبار نئی دنیا اور رسالہ ''آفتاب'' جاری کیا۔ کلکتہ سے لاہور پہنچے تو ادب کے آفتاب مولانا ظفر علی خان نے ادارہ ''زمیندار'' میں حسرت کی آمد کے خیر مقدم کا اعلان انیس کے مشہور شعر سے کیا۔

خبر کرِ دو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو   لگا رہوں مضامین نو کے پھر انبار

ظفر علی خان جیسا باکمال صحافی اور ادیب کامل حسرت کی شان میں اس شعر کو دہرائے اس سے زیادہ اُردو ادب میں حسرت کی برتری اور سرفرازی کا کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے؟ چنانچہ اس سرفرازی نے حسرت کو اخباری دنیا سے نکال کر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں پہنچا کر دم لیا۔ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ انگریزوں کو گوبلز کا سامنا تھا۔ جھوٹ کو سچ بنانے کے ساتھ ساتھ شیریں نوائی، لوچ، فصیح اُردو کا پیارا لب ولہجہ درکار تھا۔ حسرت کا اندازِ بیان دہلی کے اہل زبان پر سبقت لے گیا۔ آپ کو نہ صرف اُردو خبروں کی نشریات بلکہ تمام اُردو پروگراموں کا چیف پروڈیوسر بنا دیا گیا تھا۔۔ یہاں سے نئے فوجی اخبار کے ایڈیٹر بن کر سنگاپور پہنچے۔ تھوڑے ہی دنوں میں چیف ایڈیٹر اور کرنل کے رینک سے نوازے جانے کے بعد بمبئی، بمبئی سے سیدھے پونچھ چلے آئے۔ اس وقت کی ایک قلمی تصویر موتی لعل کپور کے قلم سے یوں ابھرتی ہے ''ایک وجیہہ ہستی، خاکی سرج کی فوجی وردی، کندھوں پر چمکتے اسٹار، کمر میں فوجی پستول، بلند پیشانی، ستواں ناک، بھرا بھرا پُر رعب کتابی چہرہ، گندمی رنگ، ترشی ہوئی سیاہ مونچھیں، گھنگھریالے بال، مسکراتے ہوئے لب اور موٹی موٹی شربتی آنکھیں غرض ہر پہلو سے پیکرِ عظیم دوہرا جسم قد اور جوانی۔ یہ تھے کرنل چراغ حسن حسرت''۔

مارچ 1947ء میں حسرت پونچھ آئے۔ اس منحوس سال کی منحوس پرچھائیوں میں امن وسکون کی فاختہ دم توڑ رہی تھی، مئی یا جون میں لاہور سے روزنامہ امروز کے منیجر حسرت کو ساتھ لے جانے کے لئے پونچھ پہنچے۔ اصرار پر وطن میں کچھ دن ٹھہرے پھر جموں کے راستے لاہور اور لاہور سے کراچی پہنچے اور اُردو ادب کے صاحبِ طرز ادیب پطرس بخاری کی جگہ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ عالم شباب کا آفتاب ڈھلنے سے پہلے 1959ء کے سال سیاہ میں درد جگر کی شدت آفتاب ادب پر گہن بن کر چھا گئی اور لاہور میں انتقال کر گئے۔ وائے قسمت۔ ؎   رات باقی تھی ہم بچھڑے تھے   کٹ گئی عمر رات باقی ہے

مشہور ہستیوں کے ادبی بیان میں سوانح حیات کی ضرورت نہیں ہوا کرتی لیکن تعارف سے تسلسل بیان کے لئے یہ ناگزیر ہے۔ اعتراض ہے کہ جب حسرت پاکستانی نہیں تھے تو عین ہنگامہ دار وگیر میں پاکستان کیوں چلے گئے۔ اس کی مختصر وجوہات ہیں، لاہور کی ادبی سوسائٹی میں ترقی پانے کی کشش۔ میں نہیں جانتا ان ترغیبات کے

سامنے کون ٹھہر سکتا ہے وطن میں بیکاری کے سوا کیا تھا؟

حسرؔت کے دل میں نہ تو پاکستان سے عقیدت تھی، نہ ہند کے پیار کا نمائشی جذبہ تھا۔ انہیں اپنے وطن سے پیار تھا، اور اس پر فخر تھا، وہ صحافی تھے اور صحافت کا دامن تنگ نہیں ہوتا۔ اس لئے صحافت کی جولان گاہ کے ہر معرکہ میں فتح ان کی ہم رکاب رہی۔

یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ حسرؔت ہم تینوں بھائیوں میں چوتھے بھائی تھے اور کرشن چندر سے رسمی راہ و رسم البتہ ان کے والد کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ بازار شہر پونچھ میں میری چھوٹی سی دوکان تھی لیکن دکان میں کتب فروشی کم۔ کتب بینی زیادہ تھی۔ زمانے بھر کی نئی پرانی کتابوں، قصوں، ناولوں، افسانوں اور رسالوں کے انبار کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان گرد آلود انباروں میں ادیب، شاعر، عالم، سیاست داں، سرکاری افسر اور ملازمین مجھے گھیرے رہتے۔ میرے اخبار ''پربھات'' اور پربھات پریس کی انتظامیہ کا دفتر، سبھی کی یہیں بیٹھک تھی۔ اس بیٹھک میں مسلسل بیٹھنے والوں میں اخبار کے کاتب، میں اور حسرؔت تھے۔ کبھی کبھی کونے میں پڑے بنچ پر کرشن چندر بھی آکر گھنٹوں چپک جایا کرتے تھے۔ مجھ میں اور حسرؔت میں دن بھر ہی نہیں بلکہ رات گئے تک اُردو ادب اور شعر و سخن کے چرچے بلکہ بعض اوقات تلخ بحث و مباحثے بھی چلتے رہتے تھے۔ اخبار کا کام بھی ہوتا رہتا اور خوش گپیاں بھی۔ کرشن چُپ چاپ سنتے رہتے اور پھر کوئی ناول یا رسالہ لے کر چلے جاتے۔ اُردو میں ادیب فاضل پھر جرنلزم (صحافت) کے امتحانات میں نے حسرؔت کے ساتھ عرب ہوٹل میں رہائش کے دوران دیئے، پھر حسرؔت کی رہنمائی میں لاہور کے متعدد اخبارات میں اخبار نویسی کی تربیت بھی پائی۔

کہتے ہیں ''وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا''، پونچھ کے چمن سے دو لالۂ صحرا نکلے اور گلشنِ ہند میں یوں مہکے کہ ایک عالم محو حیرت ہوا۔ ہند کے خیابانِ ادب میں کیا کیا معرکے اور کیا کیا گل تراشیاں ہوئیں یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں۔ میں کرشن چندر اور حسرؔت کی سوانح حیات مرتب کر رہا ہوں۔ اس میں تفصیلی رموز و اسرار منظر عام پر آئیں گے، آج اس بات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا کہ اپنی زاد بُوم پونچھ کو انہوں نے کیا دیا۔

اُردو ادب کے دو حصے ہیں۔ نثر، نظم۔ نظم میں چٹخارہ ہے، نثر میں دلنشینی، پہلے میں نظم کو ہی لیتا ہوں۔ دورِ ماضی میں پونچھ کی راج بھاشا ڈوگری، دفتری زبان فارسی و انگریزی، عوام کی بول چال گوجری، کشمیری، سُدنی، پوٹھواری اور جہلم کی پنجابی بولیوں کا مجموعہ تھی اور آج بھی ہے۔ ظاہر ہے ایسے ماحول میں غریب اُردو کا کیا گزارا؟۔ اتفاق سے یوپی کے خان بہادر احمد دین پونچھ میں سیشن جج بن کر آئے۔ انہوں نے اس ویرانے میں اُردو کی تخم ریزی شروع کی۔ محنت بار آور ہوئی اور ان کی پرائیویٹ شبانہ محفلوں میں شعر و شاعری کی

چک نے صاحبِ ذوق نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچا۔ ان محفلوں کا اہتمام پونچھ کے سابق وزیر اعظم میاں نظام الدین کے صاحب زادے میاں مہتاب دین کرتے تھے۔ نہ جانے کس بات پر اکھڑی کہ دو دھڑے بن گئے۔ ایک دھڑے نے مہتاب دین کی ہجو کی۔ دوسرے نے خان بہادر کی۔ حسرتؔ نوعمر اور خان بہادر کی محفلوں کی شمع تھے۔ ڈرتے ڈرتے میاں مہتاب دین پر ایک ہجو کہہ ڈالی۔ مطلع تھا۔

ان کو مہتاب دین کہتے ہیں

سر پہ ہیں بال تین کہتے ہیں

یہ حسرتؔ کی شاعری کا آغاز تھا۔ غور کیجئے کس بلا کی آمد تھی، اسے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہاں مہتاب دین فی الواقعہ گنجے بھی اس قدر تھے کہ چاند پر تین ہی بال تین باقی چاند چاندنی تھی۔ یہاں ایک لطیفہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ نئی دہلی میں ایک اُردو مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کا اہتمام حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے سپرد تھا۔ مصرعہ طرعہ اس طرح تھا۔

''قاروں نے کیا خزانہ لٹایا ہے راہ میں؟''

دہلی کا کاندھلہ قریبی قصبہ ہے۔ کاندھلہ کے بہت سے کہنے والے مشاعرہ میں شرکت کے لئے پہنچے۔ اتفاق یہ ہے کہ جو بھی شاعر کاندھلہ سے آیا گنجا تھا۔ جوشؔ گنجے شاعروں کا لشکر دیکھ کر ہنس پڑے، منہ سے بے اختیار نکلا۔

آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے ساتھ گنج

قاروں نے کیا خزانہ لٹایا ہے راہ میں

جوشؔ کی زرینہ پھبتی اور حسرتؔ کی حقیقت بیانی کا موازنہ کیجئے۔ پلہ حسرتؔ کا بھاری رہے گا۔ راجہ سکھدیو سنگھ سور گباشی (راجہ پونچھ) کی تقریبِ تاج پوشی پر احباب کی تحریک پر ظہوریؔ کے رنگ میں قصیدہ کہا۔ اس قصیدے کی تشبیب کو پونچھ کی شان زبانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا مطلع کی اٹھان دیکھئے۔

یہ کوہ و دمن مہکے یہ سنبل وریحانی — سبزہ کی قبا پہنے عمامۂ نورانی

عمامۂ نورانی کی ترکیب قابلِ توجہ ہے، یعنی برف کا دستار۔ پیر پنچال کی چوٹیوں پر اُستاد رساؔ بھدرواہی اپنی غزل کے ایک شعر پر مشہور ہو گئے، شعر کا دوسرا مصرعہ ہے ''کفر اسلام کا سہارا ہے''۔ مگر رساؔ صاحب کو اپنے اُردو کلام پر ناز نہیں ہے۔ وہ اب کہتے ہیں، میں نے دل سے کچھ کہا ہے تو کشمیری میں، چنانچہ ان کی کی کشمیری غزل کا ایک شعر ہے۔

رسا پھیروس گامہ تے شہار　　　　کُنہہ نے ڈیوٹھم میہہ کشتواڑ

ترجمہ '' ہے رسا گاؤں شہروں پھرا کہیں کشتواڑ نہیں دیکھا''۔ کیون نہیں دیکھا، اس لئے کہ کشتواڑ رسا کی زاد بوم ہے۔ ورنہ حسن فطرت ہر پہاڑی گاؤں اور قصبوں مین بکھرا پڑا ہے۔ اس حسن کی فراوانی میں، نہ پونچھ کم ہے نہ کشتواڑ زیادہ۔ اس حسن فطرت کی محویت نے مولانا ظفر علی خان کو اپنا دیوانہ بنا کر لاہور بھیجا۔ مولانا روٹھے ہوئے حسرت کو منانے کے لئے کشمیر سے پونچھ پہنچے۔ دو دن ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ پورے اٹھارہ دن قیام کے بعد لاہور گئے۔ جاتے میں '' زمیندار'' کے سرورق پر پونچھ سے والہانہ عقیدت کی پوری نظم شائع کی۔ نظم کا قافیہ تھا، دل کہیے گل کہیے وغیرہ۔ افسوس کہ ایک ہی مصرعہ یاد رہ گیا۔ ''پونچھ کو خطۂ کشمیر کے عارض کا تل کہیے''

اب عارض کشمیر کے تل کے متعلق حسرت کو سُنیے۔

میں پُونچھ کی مسکان میں ہم رنگِ گدا ہوں　　　　کیا شان الٰہی ہے کہ ٹٹو پہ لدا ہوں

حسرت انجمن اسلامیہ اسکول میں ماسٹر تھے اور انجمن کے صدر پیر حسام الدین سجادہ نشین مُلا خانقاہ تھے ان کے صاحب زادے کی ٹیوشن میں حسرت کو پیر صاحب نے کچھ شالی مرحمت کی۔ بدقسمتی سے یہ شالی بھی خالص سجادہ نشین نکلی۔ اس پر چند شعر مرزا سودا کے رنگ میں کہہ دیئے۔

ہمیں آج پیروں سے شالی ملی ہے　　　　زمانے سے لیکن نرالی ملی ہے

وتھو کرژ وتمرن زمستان چھ یاون　　　　کہ شالی میں آدھی پرالی ملی ہے

لگائیں نہ کیوں اس کو آنکھوں سے حسرت　　　　نقابِ حسینہ کی جالی ملی ہے

یہ طنز پیر صاحب کے کشمیری نژاد ہونے پر نقابِ حسینہ کی جالی کی تشریح پیر صاحب کے حضور ہوئی تو پیر صاحب جلال کے عالم میں جھنجھلا اٹھے، نتیجہ یہ کہ حسرت کو جالی کے جال میں آ کر وطن بدر ہونا پڑا۔ پھر پیر صاحب بھی سیاسی تعزیز میں دربار کشمیر کے حکم سے ریاست بدر ہو گئے۔ مدتوں لاہور، امرتسر میں بھٹکتے پھرے۔ معافی ملنے پر پونچھ آئے محلہ خانقاہ کے استقبالیہ گیٹ پر اتفاق سے حسرت بھی کھڑے تھے۔ جواب ماسٹر نہیں '' زمیندار'' کے ایڈیٹر تھے۔ مسکراتے اور کش لگاتے ہوئے یوں خوش آمدید کہی۔

بت خانۂ تہذیب وتمدن کو چھوڑ کر　　　　آئے حسام دین ہیں پھر خانقاہ میں

سنا یار حسرت کو شالی ملی ہے　　　　دیئے دام تھے یا سوالی ملی ہے

مال روڈ لاہور کی لان میں پنجاب کا البیلا شاعر اختر شیرانی، حسرت اور میں بیٹھے امرود کھا رہے تھے۔ سبز پتی کے جھاڑ میں سفید گلاب کی کلیاں جھول رہی تھیں۔ ان کلیوں کی طرف اختر کی ٹکٹی بندھ گئی، منہ سے بے

اختیار نکلا۔ مجھے ان بیمار کلیوں سے محبت ہے۔ حسرتؔ مسکراتے ہوئے'' آگے کہو

کوئی کانِ ملاحت ہے کوئی کانِ صباحت

مجھے تو دوست ان بیمار کلیوں سے محبت ہے

اخترؔ سوچنے لگے۔ حسرتؔ نے دوسرے مصرعے کا لقمہ دیا

ابھی الھڑ پنے کے دن ہیں ۔۔۔ شرمانے کی عادت ہے

غرض حسرتؔ بولتے اخترؔ دھراتے اور اپنے مصرعے بھی لگاتے جاتے تھے۔ یہ پیاری نظم اختر کے کلام میں موجود ہے۔ ان مثالوں کو فروعات یا شروعات سمجھئے۔ ورنہ حسرتؔ کی شاعری ان سے بلند تر چیز تھی۔ بابائے اُردو میر تقی میرؔ کا شعر ہے۔

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو ۔۔۔ ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

قادر الکلام مرزا سوداؔ کہتے ہیں۔

سودا کے جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت

خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

مرزا سوداؔ کی طرح حسرتؔ بھی زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے تھے۔ لیکن کہتے اور لکھتے میرؔ کے رنگ میں تھے، ایک ہی مثال کافی ہوگی۔ ہند کے مایہ ناز شاعر مکمل جنتِ نشاں مولانا روشؔ صدیقی جن کا ایک شعر فلسفۂ حیات و ممات کی تبصیر ہے۔ کہتے ہیں ۔

اے گرفتارِ فریبِ آشیاں ۔۔۔ زندگی پرواز ہی پرواز ہے

اُن ہی کی غزل کا ایک شعر ہے۔

مرحلے وادیٔ انسان تو سبھی ختم ہوئے

ایک قدم جانبِ اقلیم گماں اور سہی

حسرتؔ کہتے ہیں۔

ہنگامۂ دار و گیر سے گھبرا گیا تھا میں

صدقے اجل کے جس نے رہا کر دیا مجھے

آپ ہی موازنہ کیجئے۔ روشؔ کا شعر اگر واہ ہے تو حسرتؔ کا شعر آہ ہے

حضرت روشؔ صدیقی اہل زبان بھی تھے اور عالم بھی۔ جب آل انڈیا ریڈیو دہلی کے چیف پروڈیوسر

بنے تو جموں آئے۔ایک دن حضرت میکش کاشمیری کو ساتھ لئے میرے رین بسیرے پہنچے۔زینہ پر پاؤں رکھنے سے پہلے چوکھٹ کی خاک اٹھا کر آنکھوں سے لگائی۔ میں متعجب ہوا۔یا خدا یہ کیا؟ پھر آپ ہی نے توضیح کی۔ کہنے لگے، آپ حسرتؔ کے ساتھی ہیں۔اس لئے آپ کی چوکھٹ کی خاک میرے لئے صد فخر ہے۔جب میں پہلی بار ریڈیو اسٹیشن میں اُردو پروگرام میں حصہ لینے کے لئے بڑے فخر وغرور سے پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں میز کے کونے پر میری تصویر کٹی پھٹی پڑی ہے۔اور غزل کے کتنے ہی شعر قلم زد ہیں۔ برہم ہو کر پوچھا یہ کیا؟ جانتے ہو میں روشؔ صدیقی ہوں، عینک کے اندر سے شوخ نظروں اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے جواب ملا۔جی ہاں جانتا ہوں! میرا نام حسرتؔ ہے۔پھر کچھ نہ پوچھئے کیا ہوا۔کیا نہ ہوا۔قاموس،لغت،صرف و نحو،رومی، جامی، قاآنی،ظہوری، حافظ، بیدل، ابوالفضل سے ہوتے ہوئے میرؔ، غالبؔ، داغؔ، اقبالؔ پر بحث ختم ہوئی۔خدا کی پناہ۔با محاورہ فصیح اُردو زبان کی روانی، حافظہ کا جواب نہیں۔لب ولہجہ پیارا، روزمرہ اُردو کا چشمہ تھا کہ ابل رہا تھا، میرے پسینے چھوٹ گئے۔مرعوب ہی نہیں ہوا تھا گھبرا اٹھا۔سب چھوڑ چھاڑ بھاگتے ہی بنی۔اپنے آپ سے بیزار لاحول واللہ کس بلا سے سامنا ہوا۔اس کے بعد لوہا لینے کی ہمت نہ پڑی۔اور تسلیم کرنا پڑا کہ حسرتؔ کے علمی پایہ کا دوسرا کوئی شخص دلی میں نہیں ہے۔

اُردو کے اہل زبان خاندان میں سے دلی کے مولانا غلام ربانی تاباںؔ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔جموں کے ریڈیو اسٹیشن سے ان کی زبان سے غزل سننے کا اتفاق ہوا، مقطع تھا۔

میرے شعروں میں جاری وساری تاباںؔ　　　حسن دلی بھی ہے نغمۂ شیراز بھی ہے

یہ سن کر میں دل ہی دل میں ہنسا۔اللہ اللہ تاباںؔ صاحب بھول گئے کہ اُن کا حسنِ دلی پہلے پانی پت کے مولانا لوٹ کر لے گئے۔پھر پونچھ کے پہاڑوں کا ایک پہاڑیا نغمۂ شیراز کا حسن، دلی کی مسندِ ناز پر جا بیٹھا۔جس کے سامنے عصر حاضر کے بڑے بڑے مولانا، ادیب، شاعر اور صحافی جھک گئے۔حسن دلی کے وارثوں نے کڑے مقابلے کئے۔اس پہاڑی دیو کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے اور خراج عقیدت پیش کرتے۔یہ میں روشؔ صدیقی ہی نہیں مشہور افسانہ نگار (مرحوم) سعادت حسن منٹو کہتا ہے۔حضرت منٹو یا بقول حسرتؔ اس ادبی بھانڈ کی کتاب ''لاؤڈ اسپیکر'' میں آنکھوں دیکھا حال نہایت دیانت داری سے بیان کیا گیا۔اس ادبی بھانڈ نے نہ ڈاکٹر تاثیرؔ کو بخشا ہے نہ کرشن چندر کو اور نہ جوشؔ ملیح آبادی کو لیکن حسرتؔ کی چوٹیں سہتا بھی تھا اور کباب بھی ہوتا تھا۔جواب دینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔جواب تو کُجا حسرت کا سامنا کرتے ہوئے یوں کتراتا تھا جیسے لاٹھی کے سامنے خارش زدہ کتا دبک جاتا ہے۔

لاہور کے صحافتی میدان میں یوں تو کتنی قابل ذکر معرکہ آرائیاں پیش آئیں۔ان میں ڈاکٹر محمد تاثیر اور

حسرتؔ کی نظمیں جنگ وامروز اخباروں کی فائیلوں میں آج بھی زندہ ہے۔ یہ قلمی جنگ جی کھول کر لڑی گئی اور ڈاکٹر اقبالؒ جیسی شخصیت اس جنگ کا لطف لینے اور تھپکیاں دینے والی تھی۔ تاثیر حسرتؔ کے مداح ہی نہیں گہرے دوست بھی تھے۔ پہل آغا حشرؔ کے کلام سے ہوتی۔ ڈاکٹر تاثیرؔ نے عروض کی فنی غلطیوں کو اُچھالا۔ حسرتؔ نے جواب دیا۔ دونوں روز ناموں کے ایڈیٹر تھے۔ پہلے نثر کا جواب نظم میں پڑھتے اور لطف اندوز ہوتے۔ ایک سے بڑھ کر دوسرا تھا۔ مزید یہ کہ روز شاہنامۂ فردوسی کا منظر عام پر آنا کوئی دل لگی نہ تھی۔ سنجیدہ فن عروض شعر میں ڈھل کر آنے کے ساتھ گہری چوٹیں اور داد بھی تھی۔ افسوس کہ یہ ادبی جنگ تاثیرؔ کی بے وقت موت پر ختم ہوگئی، حسرتؔ جنازے کے ساتھ تھے اور روتے جاتے تھے۔

کہاں تک لکھوں ''ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا'' پہاڑی زبان فصیح اُردو کی ادائیگی کا اندازہ کہاں سے پائے۔ یہاں وہ عرض بے جا نہ ہوگی۔ کلکتہ میں جب حسرتؔ مولانا آزاد کی محفل میں پہنچے تو مجھے خب لکھا۔ لکھتے ہیں۔ بھائی حسرتؔ کہتے ہیں۔

نثر آزاد کی سُنی جب سے   نظم حسرتؔ میں کچھ مزا نہ رہا

اس شعر کے مصداق اپنے کلام پر آپ شرمسار ہوں۔ طے کیا ہے اُردو نظم میں نئی راہ اپنائی جائے، کیونکہ گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے۔ پھر اُردو کی راہ میں وہ رنگ بھرا کہ مولانا عبدالمجید سالکؔ جیسے طنز نگار رشک کا شکار ہوئے۔ کسی دوسرے موقعہ پر حسرتؔ کی نثر کے شاہکار بھی پیش ہوں گے۔

حسرتؔ اُردو، فارسی، انگریزی ادب پر یکساں عبور رکھتے تھے، زورِ بیان اور زورِ قلم کی روانی بھی ایک سی تھی۔ شعر کو شاعرانہ لے میں پڑھتے تو سامعین پر وجد طاری ہو جاتا تھا۔ وہ افسانہ نگاری یا داستان نگاری کو بلند معیاری ادب نہیں سمجھتے تھے۔ وہ تحقیق اور تاریخ کے ساتھ اندازِ بیان کو ترجیح دیتے تھے،۔ انہوں نے جو کتابیں لکھیں وہ بھی اسی نوعیت کی ہیں، وہ کامیاب صحافی تھے اور عروض میں بھی کوئی ان کا مدِ مقابل نہ تھا۔ اس لئے وہ حسرتؔ عروضی بھی کہلاتے تھے۔ وہ تاریخ، تبصرہ کے فن میں ماہر تھے اور حافظہ غضب کا پایا تھا۔ شعر کہنے اور سمجھنے میں ان سے بڑھ کر دوسرا نہ تھا، اکبر الہ آبادی کہتے ہیں۔ ''شعر کہتے کہتے ڈپٹی کلکٹر بن گیا''۔ اور حسرتؔ شعر کہتے کہتے پہلے کرنل پھر ڈائریکٹر جنرل بن گئے۔

پونچھ کے سفید ریش لوگ جانتے ہیں میری زندگی کا مقصد نہ تجارت رہا نہ ملازمت، ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ''۔ یہ زندگی پونچھ کے پہاڑوں میں ادب کا ذوق پیدا کرنے اور اُردو کی اشاعت میں گزری۔ شخصی دورِ حکومت میں پونچھ کا پہلا اُردو اخبار صبح کے ستارے کی طرح پونچھ کے پہاڑوں سے طلوع ہوا اور ان حروف شناس

ہاتھوں میں پہنچا جو کسی پڑھے لکھے سے پڑھوا کر سنتے اور سر دُھنتے تھے۔

''پربھات'' ادبی پرچہ نہ تھا، سیاسی تھا۔ لیکن اس میں جرئت مندانہ مضامین، دشمن کو بھی اعتراف شکست پر مجبور کر دیتے تھے۔ پربھات کی نادیدہ گرویدگی کا یہ عالم تھا کہ اُس زمانے میں انگریز کا نمائندہ گورنر بر ہما ہزا یکسلنسی خان بہادر عطا محمد خان چڑالہ سے پربھات کو خراج تحسین پیش کرنے اور ایڈیٹر پربھات سے ملاقات کے لئے دفتر یا دکان کے سامنے آ کھڑے ہو گئے، فقط پونچھ میں ہی نہیں، جموں وکشمیر میں بھی پربھات کے زورِ قلم کے مداحوں میں مولانا مسعودی، دینا ناتھ مست، جانکی ناتھ زتشی، بلدیو پرشاد شرما، نرسنگھ نرگس، لالہ ملک راج صراف، معراج الدین اور چوہدری غلام عباس جیسے صحافی تھے۔ یہ سب کچھ حسرت کے فیضان محنت کا نتیجہ تھا کہ پونچھ میں بزم سخن، بزم ادب وغیرہ کے ناموں سے پونچھ کی ادبی محفلوں میں پرانے اور نئے اُردو ادیب وشاعر ابھرے اور ادبِ اُردو نے فروغ پایا۔ میں نے دربار بال منڈی میں ہفتہ وار ادبی محفلوں اور مشاعروں کا اہتمام کیا۔ جس میں بغیر کسے صلے کے اُردو میں کہنے والوں کا حلقۂ ادب وسیع ہوتا گیا۔ اور میں نے ان کارروائیوں کو اشاعت دی۔ ان مشاعروں میں سامعین کی کثرت اکثر ہنگاموں کا باعث بن جایا کرتی تھی۔

1947ء میں آزادی کے خواب پورے ہوئے مگر ان کی تعبیر میرے جیسے آزادی کے طلب گاروں کے لئے تباہی کا تحفہ بھی لائی۔ سب کچھ لٹ لٹا کر جانِ ناتواں کو ایک پرانے چھکڑے پر لاد کر جموں پہنچا یہاں بھی ذوقِ شعر وسخن گلوگیر رہا۔ جموں کے مایہ ناز شاعر اور ادیب حضرت میکش کاشمیری اور لالہ منوہر لعل دلؔ ہم نشین پائے۔ شعر وسخن کے چرچے جاری ہوئے۔ میں نے بزم ادب بنانے کی رائے دی۔ میکش اور دل کے نام میں کشش تھی۔ یہ انجمن بہت جلد قائم ہوگئی اور جموں کے ہونہار ادیب وشاعر اس کے رکن بن گئے۔

1947ء کے دورِ آشوب کے بعد پونچھ کی جنت دوزخ کی بھٹی بن گئی۔ مجھ جیسے لٹے ہوئے آزادی کے قافلہ سالار کو جموں ریڈیو اسٹیشن میں پناہ ملی۔ پربھات پریس پاکستانی توپ کی زد میں آ گیا۔ ہزاروں روپے کا پربھات کا اسٹاک رفیوجی ایندھن بن گیا۔ نہ دوکان رہی نہ اسٹیشن کا اثاثہ۔ نہ گھر نہ در۔ در بدر ہونا پڑا۔ حسرت کا مقدر نہ تھا، نہ کرشن چندر کی شان امارت کی ہوس تھی۔ پونچھ کو دورِ جمہوری میں سربلند دیکھنے کی تمنا اُردو ادب کا سودا سر میں تھا۔ افسوس تھا ان خون گشتہ آرزوؤں کا۔ مداوا کسی در نے نہ پایا۔ سوچتا ہوں جو فرش پر اوندھے منہ پڑے تھے عرش پر جا بیٹھے۔ عرش کے فرشتوں کی عبادت میں شیطان کی حکومت نکل آئی۔ کیا میری قربانیوں کا نتیجہ یہی تھا۔ کاش پونچھ سے ہجرت قسمت میں نہ ہوتی

زمانہ بڑے غور سے سُن رہا تھا ہمی سو گئے داستاں کہتے کہتے

حسرت غریب الوطنی میں وفات پا گئے۔ کرشن چندر پھولوں کی سیج پر کروٹیں بدل رہے ہیں، ان دونوں

کے درمیان لٹکتا ہوا میں قسام ازل سے شکوہ سنج ہوں

یارب اگران کردہ گناہوں کی سزا ہے ۔ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرتؔ کو ملے داد

کرشن چندر نے اُردو میں رومان یا رومانس کا چلن عام کر دیا۔ پونچھ کی پہاڑی اصطلاحیں اور نام اُردو ادب میں سمو دیئے۔ کنکولی، بھورا، تلہ، ترناڑی، سنبلو، گُچھ، رت گلا وغیرہ۔ پریم چند کے بعد کرشن چندر کے مقدر داستان گوئی یا افسانہ نگاری کا جو مقام ہے وہ دنیا بھر کے ادب مین اپنا سکہ جما چکا ہے۔ کرشن چندر نے اچھا کیا نظم کے بکھیڑوں میں نہیں پڑے۔ انگریزی تعلیم پاکر اُردو نثر کو اپنا لیا۔ اور پریم چند کی طرزِ تحریر میں ڈوب کر لکھنا شروع کیا۔ پریم چند افسانوی ادب کا مختصر اثاثہ چھوڑ کر شہرت دوام پا گئے لیکن کرشن چندر نوجوانی سے اب بڑھاپے تک اپنے افسانے خرِعیسیٰ کی پیٹھ پر لادنے سے زیادہ لکھ چکے ہیں۔ اور ابھی لکھتے جا رہے ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ افسانے جو پریم چند کی طرح دیہاتی معاشرت کے عکاس تھے۔ نہ صرف مقبول ہوئے بلکہ متعدد زبانوں میں ترجمے کی عزت افزائی بھی پا چکے ہیں۔ آج کرشن چندر اس فن کی بدولت، دولت، عزت، شہرت جیسی دنیاوی نعمتیں پارہے ہین

یہاں مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ کرشن چندر نے پونچھ کو جو دیا، وہ حسرتؔ نہیں دے سکے، شاید اس لئے کہ جہاں حسرتؔ کی علمی فضیلت اور وسعتِ نگاہ کا دائرہ ادب محدود نہ تھا۔ وہاں کرشن چندر کا دائرۂ ادب اور قوتِ مشاہدہ کا ذہنی تصور پونچھ کے مرکز کے گرد گھومتا رہا۔ ان کی کوئی کہانی، کوئی قصہ، کوئی ناول شاید ہی ایسا ہوگا، جو پونچھ کے نفسیاتی تصور سے خالی ہو ورنہ ان کا ہر افسانہ پونچھ کی غیر مرئی پرچھائیوں سے معمور ہے۔ کردار، ماحول، منظر حتیٰ کہ نام تک پہاڑی رنگ کے پائے جاتے ہیں۔ نوری چھم آبشار کے منبع ''گرجن سر'' سے متعلق ''گرجن کی ایک شام'' افسانہ لکھا۔ یہ افسانہ جب اُردو کے مشہور نقاد آل احمد سرورؔ کی نظر سے گزرا تو آپ نے کرشن چندر کے قلم کی بلائیں لیتے ہوئے جی کھول کر کرشن چندر کو خراج تحسین پیش کیا۔ یہ کرشن چندر کی عظمت کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔

1965ء کے کارزار میں ''حاجی پیر'' کی فتح سے متاثر ہو کر آپ نے اپنی ذات اور پونچھ سے متعلق چھوٹا سا غیر مربوط افسانہ لکھا ''مٹی کے صنم'' اس افسانے میں آپ نے مادرِ وطن کا سچا سپوت ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں، میرے سامنے کوئی پونچھ کا نام بگاڑ کر منہ چڑاتا تھا۔ تو میں اس سے لڑ پڑتا تھا۔ کہیے حب الوطنی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

اُردو ہندی کی بحث پرانی ہو چکی ہے۔ اب اُردو کو غیر ملکی یا اسلامی زبان کہا جا رہا ہے۔ غریب اُردو کو ذبح کرنے کے اس نئے ہتھیار کو سان چڑھانے والوں میں مولانا پیش پیش ہیں جو خاصی سلیس اُردو کو ''مولویانہ''

اُردو بنا کر دینیات کی اشاعت میں ثوابِ دارین حاصل کر رہے ہیں۔ دوسری طرف کئی بھارتی سجن پُرش اُردو کی کمائی کھا کھا کر اُردو میں بھدے، بھونڈے اور غیر مانوس شبدوں کو ٹھونس کر اسے شدھ بھارتی بھاشا بنا رہے ہیں۔ اب کیا کہوں کہ بیچاری اُردو نہ ہندو ہے۔ نہ مسلمان۔ نہ ملکی ہے نہ غیر ملکی، سورج کی روشنی، چاند کی ضیاباریوں کو کوئی ملکی یا غیر ملکی کیسے کہہ سکتا ہے۔ اُردو تو دجلہ و فرات، گنگ و جمن کے سنگم کی پیداوار ہے۔ اس پیداوار کو کسی ہندو یا مسلمان نے نہیں انسان کی ذہنی صلاحیتوں کے ارتقاء نے نکھارا، سنوارا اور دنیا کے سامنے ہند کی دلہن بنا کر پیش کیا۔ اس دلہن کے حسن کے متعلق داغؔ کا دعویٰ ہے۔

اُردو ہے جس کا نام ہمی جانتے ہیں داغؔ　　　　سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اسی عالم میں دھوم مچانے والی اُردو کو جن مسلمان دانشوروں نے پروان چڑھانے میں اپنی زندگیوں کو قربان کیا۔ اخیر میں اس پر اپنا تن من دھن نچھاور کر کے اُردو کا سودائے خام پورا کر گئے۔

کرشن چندر اہل زبان نہیں زبان دان ہیں۔ مگر آج اہلِ زبان بھی ان کے قلم کا سکہ مانے ہوئے ہیں۔

وہ امسال موسم خزاں میں اپنے اجڑے ہوئے چمن کی خزاں دیدی بہار دیکھنے کے لئے آئے تو ڈاک بنگلہ سے سیدھے میرے جھونپڑے میں ملاقات کی خواہش اور یہ درخواست لے کر پہنچے کہ میں بطور ساتھی ان کی دستاویزی فلم میں آؤں۔ پھر رخصت ہوتے وقت میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ روما کے سات ٹیلوں پر پونچھ کے بارہ ٹیلوں کو ترجیح دینے والے بین الاقوامی مصنف کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جمہوری دور کو چھوڑیئے، شخصی دور کے پُرعظمت شہر پونچھ کی تُربت پر قلم سے نہیں آنکھوں سے ہی آنسو بہائے تو کم نہیں۔

آج پونچھ میں کرشن چندر کی شہرت اور حسرتؔ کی علمی فضیلت کے کتنے مداح پونچھ میں ان کی یادگاروں کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں، اور مایوس ہو کر لوٹتے ہیں۔ غالبؔ کے رہائشی مکان کو شیشے کے خول میں محفوظ کیا جا رہا ہے اور پریم چند کی یادگار پر ہزاروں روپے صرف کئے جا رہے ہیں مگر پونچھ کے غالبؔ اور پریم چند کی کوئی یادگار پونچھ میں قائم نہیں۔ جمہوریت کے دارا اور سکندر مسجد و معبد تو بنا ڈالتے ہیں، مگر اپنے شہیدوں کا کوئی مقبرہ نہیں۔

☆☆☆

سکّے

مالک رام آنند

جب سے سریندر نے آرٹ سینٹر والی دوکان کا ''ہاف بار'' لائسنس لے کر دوکان کھولی تھی (جواب آرٹ سینٹر سے وائین سینٹر میں تبدیل ہوگئی تھی) ہم سب دوست ادھر ہی چوری چھپے پینے لگے تھے۔ حسب معمول جب ہم ایک دن بیٹھے پی رہے تھے تو ایک آواز نے میرے خیالات کا سلسلہ سناٹے کے ساتھ توڑ دیا۔ عجب سی آواز تھی، نہ تو اس میں بھرپور نسوانیت تھی اور نہ ہی مردانہ تمکنت۔ اس کے جسم پر صرف کمر کے گرد ایک میلا سا چیتھڑا لپیٹا ہوا تھا۔ جو شاید اس کی ستر پوشی کے لئے کافی تھا۔ چند ہی لمحے ہوئے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا لالہ جو ہمیں دیکھ کر دوکان میں در آیا تھا۔ کاؤنٹر پر ہی کھڑا کھڑا ایک بیئر کی بوتل پینے لگ پڑا۔ شاید وہ پہلے کہیں باہر سے پی کر آیا تھا اور اب وہ سفید دھوتی، سفید واسکٹ، سفید قمیض اور سفید پگڑی میں ملبوس اسے حریص نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ آواز شراب کی چمکتی ہوئی بوتلوں سے ٹکراتی ہوئی میرے ذہن کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ سی گئی۔

کچھ ان کے بارے میں:

نام: مالک رام

ولدیت: مولراج آنند

قلمی نام: آنندؔ

پیدائش: 5مئی1939ء، بمقام سھڑا، پاکستانی کشمیر۔

تعلیم: میٹرک

پیشہ: سرکاری ملازمت محکمہ جیک فیڈ۔

ذریعۂ اظہار: اُردو

تصانیف: (ناول) اپنے وطن مین اجنبی، جانے وہ کیسے لوگ تھے، نئے دن پُرانے سال، دھکتے پھول شبنم آنکھیں۔ وغیرہ۔

سکونت: 592پیر مٹھا، جموں

وفات: 7جنوری2003ء۔ جموں

''دینا، ایک دو پیسہ .... بابو.....''

میں نے بغور دیکھا، سب کے چہرے ایک عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گئے تھے۔ لیکن فقط ایک چہرا ایسا تھا جس کی آنکھوں میں لال ڈوروں کے ساتھ ساتھ جنسی خواہش بھی رقص کرنے لگی تھی۔ ہم میں سے ہی کسی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے یہ بھکاری ہے یا بھکارن.......''

سب کے چہرے ستے ہوئے تھے، سریندر بھی پینگ میں تھا۔ اور باہر تاریکی بھکارن کے رنگ سے میل کھاتی در بدر کشکول لئے بھیک مانگتی آرہی تھی۔ سریندر ہکا بکا دیکھ کر لالہ نے جھٹ سے اپنی سفید واسکٹ سے پیسوں کی مٹھی بھر کر کاؤنٹر پر بکھیر دی تھی اور وہ بھکارن انہیں آہستہ آہستہ چننے لگی تھی۔ اب اس طرح وہ کم بخت لالہ آہستہ آہستہ اس کے ننگے جسم کے سارے زاویے، سارے نقوش، سارے خدوخال چننے لگا تھا اور اگر اس کا بس چلتا تو وہ اُس کی کمر پر سے چیتھڑا بھی نوچ کر پھینک دیتا ''اُہوں کیسا آدمی ہے یہ''........ میں نے دیکھا کہ سب دوستوں کی نگاہیں بھی کچھ ٹٹولنے لگی تھیں۔ شاید ان کے ذہن بھی لالہ جیسی سوچ کی آماجگاہ بن چکے تھے۔ سب کی یہی چاہ تھی۔ کاش! اُن کی جیب میں بھی لالہ کی طرح سکے ہوتے اور اُسی طرح انہیں کاؤنٹر پر بکھیر دیتے اور وہ بھکارن اپنے مخروطی سینوں کی نمائش کر کے آہستہ آہستہ ان کو چنتی رہتی اور یہ نوچ کھسوٹ کا کھیل جاری رہتا۔ میری ساری شراب اُتر گئی تھی۔

پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے تمام کپڑے مل کر میرے دوستوں نے پھاڑ دیئے ہوں اور اب میں چوراہے پر الف ننگا گھوم رہا ہوں اور وہ بھکارن (میرے ننگے جسم کا ہر زاویہ بڑے غور سے دیکھتی ہوئی رقص کناں ہوا، اس کے سارے سکے گلی میں بکھر گئے ہوں اور میرے سارے دوست ان پر جھپٹ پڑے ہوں......!!

☆☆☆

سورگ سیڑھی

ٹھاکر مدن سنگھ

اس دن کے لئے ہی دادی اماں بڑھاپے کا بوجھ سنبھالے زندہ تھی۔ آج تک جہنم کے شعلوں سے کھیلتی آئی تھی، ایک لمبی عمر کے دُکھ اور مصیبتیں جھیلتی آئی تھی۔ صرف یہ آرزو لئے زندہ تھی کہ دنیا میں جیون کا سکھ نہیں ملا۔ کم سے کم دوسری دنیا میں تو سکھ ملے گا اور دھرم گرنتھوں میں لکھا ہے کہ پڑپوتا وہ سیڑھی تھام سکتا ہے جو سیدھی سورگ کو جاتی ہے۔ اس لئے دادی ماں نے نام رکھنے کی رسم ادا ہوتے ہی سونے کی ایک چھوٹی سی سیڑھی اپنے پڑپوتے کے گلے میں لٹکا دی تھی۔ جس کے سہارے اس نے نرک سے سورگ تک کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ آج وہ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ ہون کنڈ کی مقدس آگ کے پاس بیٹھی اپنی عمر سے بہت چھوٹی دکھائی دے رہی تھی۔ سب کی نظریں اس کے معمر چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ جن کی جھریاں نہ جانے اپنے کون سے بیتے دکھوں پر مسکرا رہی تھیں۔ ہونٹ وفورِ مسرت سے کانپ رہے تھے۔ جیسے اپنی بوڑھی بے سری آواز کو نوجوان لڑکیوں کی میٹھی سریلی آواز

کچھ ان کے بارے میں:

نام: ٹھاکر مدن سنگھ (ٹھاکر پونچھی کے تایازاد بھائی)

قلمی نام: ٹھاکر مدن سنگھ

پیدائش: 13 جولائی 1928ء بمقام محلہ جرنیلاں، پونچھ

تعلیم: میٹرک

ادبی زندگی کا آغاز: دورانِ ملازمت

پیشہ: پہلے مدرس بعد ازاں محکمۂ اکاؤنٹس میں کیشئر رہے

ذریعۂ اظہار: اُردو، ڈوگری، ہندی

موجودہ پتہ: محلہ جرنیلاں، نزد قلعہ مبارک، پونچھ (جموں و کشمیر)

میں تحلیل کرنا چاہتے ہوں۔

''رسی کھینچے پنگوڑا تے ماما کھچے تگی''

رسی کھینچتی رہی پالنا اور ماما کھینچتی رہی ننھے کو۔اور ننھا دادی ماں کی سورگ سیڑھی کو گلے میں لٹکائے سوگیا۔دادی اماں اپنے پڑپوتے پرنظریں جمائے گم سم بیٹھی رہی۔وہ جیسے خیالوں ہی خیالوں میں سونے کی سیڑھی پر آہستہ آہستہ پاؤں جماتے جنت کی طرف بڑھتی چلی جارہی تھی۔اس جہنم کو چھوڑ رہی تھی جس میں جلتے اپنی عمر کے پورے اسی برس خون کے آنسو پئے تھے۔یکبارگی ایک کونے سے بوڑھی عورتوں نے تان چھیڑی۔ہون کنڈ کے شعلے ایک ہی بار خوشبودار دھوئیں کی طرف لپکے اور مدھم پڑ گئے۔اب صرف بوڑھی آواز کا سنگیت تھا، پہاڑی گیت کے بول تھے جو نہ جانے کتنی صدیوں سے اسی لے اور سُر میں گائے جارہے تھے۔صدیاں بوڑھی ہوگئیں لیکن گیت کے بول اسی طرح جوان تھے، سنگیت اسی طرح جوان تھا، ابھی تک بیتی عمروں کی یاد تازہ کررہے تھے۔

''جس دن میرا ہری جمیا''

ہر کسی کو اپنے بیٹے یاد آئے، وہ دن یاد آئے، جب مائیں بنی تھیں، دادیاں بنی تھیں، بوڑھی تھکی تھکی سی آواز کا سنگیت پورے جوبن پر تھا، بڑھاپا عمر کی تھکن اور افسردگی سے بے نیاز گارہا تھا، دادی اماں کی کانپتی آواز بھی اس میں شامل تھی۔وہ جیسے اپنی آواز کا یوں تعاقب کرتی ہوئی عہدِ رفتہ کی بھولی بسری یادوں تک پہنچ گئی تھی، اُس سیڑھی کو بھول گئی تھی جو دوسری دنیا کی جنت کو چھوتی تھی، اپس سیڑھی کو اپنا لیا تھا جو اپنی موجودہ دنیا کے جہنم کو اپناتی تھی، جسے اپنائے ہوئے آج تک زندہ رہنے کی جستجو کررہی تھی۔

آواز میں آواز سموتے دادی ماں کی آنکھیں بند ہوگئیں۔جیسے بے نُور آنکھوں میں ماضی کے دھندلے نقوش جھملانے لگے ہوں، مری مٹی آوازیں تھرکنے لگی ہوں۔

''پدمنی! اس روگی زندگی کا کیا بھروسہ۔میرے بیٹے کی اچھی طرح پرورش کرنا، ہم دونوں کا یہی اثاثہ ہے'' پتی کی آس تھی، جو جوانی میں ہی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔

ہون کنڈ کی آگ بجھ گئی۔دادی ماں کی آواز بند ہوگئی، وہ اپنی ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ اور آواز سے بچھڑ گئی۔اب اسکی نگاہوں کے سامنے اپنے شوہر کا جنازہ تھا اور جوان بیوہ، گود میں ایک معصوم بچہ اور سفر کتنا طویل، کٹھن، کتنا اکیلا تھا!

دادی اماں نے اپنے پتی کی نشانی کو باندھے رکھنے کے لئے اپنا جیون دیا۔اپنے سارے دکھ دیئے۔پڑھایا، لکھایا، ٹھاٹھ باٹھ سے بیاہ رچایا، لیکن ایک دن بیٹا وہ بھی پتی کی طرح جوانی میں ہی ساتھ چھوڑ

گیا، اب صرف وہ تھی، جوان بہو تھی اور بہو کی گود میں دو برس کا بچہ تھا۔

مرنے کی عمر پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے تک رہی تھی، جینے کی عمر آنکھیں موند کر سو گئی تھی۔

دادی ماں کے سامنے زندگی کی کتاب کے اوراق سر سرا رہے تھے۔

پتی کی موت!

بیٹے کی موت!

اور پھر ایک دن جوان بہو کی موت!!!

اور صرف ایک خالی گود............ جس میں پہلے اپنے بیٹے کو سنبھالے رکھا اور پھر ایک دن اپنے پوتے کو، اور اب نہ جانے......... سوچوں میں ڈوبے ہوئے دادی ماں نے اپنی گود کو دیکھا، خالی تھی۔ اُسے اب خالی ہی رہنے دینا چاہتی تھی۔ شاید اسلئے آج تک اپنے پڑ پوتے کو اپنی گود میں نہ لیا تھا۔ شاید اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی گود ہی منحوس ہے۔ دادی ماں کی آنکھوں کے سامنے تین جنازے گزر گئے۔ ایک خالی گود آنکھوں کے سامنے تن گئی۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ماضی کے نقوش بھیانک اور ڈراؤنے تھے۔ وہ بہو کی طرف لپکی جو لفافوں میں پتاشے ڈال رہی تھی۔ اپنا جھریوں والا چہرا سکیڑ کر بولی۔

''کئی بار کہا ہے کہ آرام سے لیٹی رہو۔ کمزوری اور بیماری کی حالت میں زیادہ ہلنا جلنا اچھا نہیں ہوتا۔ جا کر آرام کرو۔ میں خود کام کر لیتی ہوں''۔

بہو کے لئے نئی بات تھی۔ کل تک یہی دادی ماں تھی جو اسے ہزار ہزار صلواتیں سناتی تھی۔ لیکن آج اور کل میں کتنا فرق تھا۔ آج تو دادی ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، آنکھوں میں چمک تھی، آج تو وہ بوڑھی بھی نہ دکھائی دیتی تھی۔ آج عمروں کی تھکان عمروں کے دکھ ختم ہو چکے تھے، بہو دادی ماں کا نیا رنگ دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

دادی ماں نے پوچھا

''خاموش کھڑی کیا دیکھ رہی ہو؟''

وہ سر جھکائے اپنے کمرے میں جانے لگی تو دادی ماں نے روک لیا۔ دیر تک اس کے معصوم چہرے کو دیکھتی رہی۔ اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا نام لے لے کر میں اپنے آپ کو کوستی تھی۔ تم تو گھر کی لکشمی ہو، تم نہ ہوتیں تو میرا پڑ پوتا کہاں سے مجھے ملتا، کس کے گلے میں سورگ سیڑھی ڈالتی۔ کس کے سہارے سورگ میں جاتی۔ تم نے میرا جیون سپھل بنا دیا۔ خوب ہنسا کرو، مسکرایا کرو، یہی تو عمر ہے''۔

اور پھر خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ دیر تک ہنستی رہی اور لفافوں میں پتاشے ڈالتی رہی۔

دادی ماں ایک خاندانی عورت تھی، جو میکے والوں سے ہزاروں لائی تھی، لیکن چھوٹے نصیبوں کی تھی، جوانی میں بیوہ ہوگئی، اکلوتا بیٹا تھا جسے اپنے خاندان کی زندگی اور مستقبل سمجھ کر پالا پوسا۔ لیکن وہ بھی ایک دن ہمیشہ کے لئے روٹھ گیا اور اس کے ساتھ ہی بہو چلتی بنی۔ اور جاتے جاتے پانچ سال کا بچہ دادی ماں کی گود میں ڈال گئی۔ دکھ تو جان لیوا تھا لیکن یہ سوچ کر کہ اب پوتا ہی ایک دن اپنے خاندان کو بڑھاوا دے گا۔ اور اپنے بیٹے سے بھی زیادہ لاڈ پیار سے پالا پوسا۔ لیکن بڑھاپے کا اندھا پیار۔ وہ ہوش سنبھالتے ہی آوارہ اور عیاش ہوگیا۔ تعلیم بھی پوری نہ کر سکا۔ زمین جائیداد کے بل بوتے پر اس کی شادی بھی ٹھاٹھ باٹھ سے کی۔ شادی ہوئے سات برس ہو چکے تھے لیکن بہو کی گود ہری نہ ہوئی۔ اپنے خاندان کے مستقبل کو تاریک ہوتے دیکھ کر سٹپٹا جاتی۔ گالیوں پر اتر آتی۔ اس نے اپنا سارا جیون ہی روتے دھوتے گزارہ تھا۔ اب وہ اپنی عاقبت سدھارنے کی فکر میں تھی۔ جہنم سے چھٹکارا حاصل کر کے جنت کو اپنانا چاہتی تھی۔ جس کے لئے پڑپوتے کا منہ دیکھنا ضروری تھا کیونکہ وہی اس کے لئے جنت کی سیڑھی بن سکتا تھا۔ پوتے کی آوارگی اور اس کی بیوی کا بانجھ پن دادی ماں کے لئے بوجھ بنتا گیا۔ اسی غم میں گھل گھل کر آخر ایک دن چارپائی سنبھال لی۔ لمبا روگ تھا، لیکن نہ موت آتی تھی اور نہ کہیں زندگی کی رمق دکھائی دیتی تھی۔ آخر ایک دن موت کا وقت بھی قریب آگیا۔ زبان بند ہوگئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ گھر میں رونا دھونا شروع ہو گیا۔ روتے دھوتے کسی ہم عمر سہیلی نے اس کے کان میں کہا۔

''گھر میں تمہارا پڑپوتا آنے والا ہے، اور تم نے جانے کی تیاری کرلی''

یہ سنتے ہی دادی اماں کی آنکھوں میں چمک آگئی ہونٹ آپ ہی آپ حرکت کرنے لگے، جیسے اب وہ مرنا چاہتی ہو۔ اور ایک دن محلے والوں نے دیکھا کہ وہ چارپائی پر بیٹھی حسبِ معمول اپنے پوپلے منہ سے اپنا پیارا بھجن گا رہی ہے۔

''میرے ہری بناں، میرے رام بناں، دن نکے تے راتاں بڈیاں''

اور پھر ایک دن وہ کبڑی ہو کر آہستہ آہستہ صحن میں پھرنے لگی۔ اس قدر شدید اور جان لیوا علالت کے بعد اس کی ہمت دیکھ کر سب حیرت میں پڑ گئے، لیکن وہ ان سب باتوں سے بے نیاز آنے والے مہمان کے لئے چھوٹی چھوٹی چیزیں سجاتی سنوارتی رہتی، اور بھجن گاتی رہی.........

دادی ماں ہنستی، قہقہے لگاتی اپنے کام میں لگی ہوئی تھی، نہ جانے گیتوں کی تانیں کب ٹوٹیں، بینڈ باجے والے کب چلے گئے، شام ڈھل چکی تھی، گلی محلے والے اور رشتہ دار دعوت سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ

گئے تھے۔ بہت بڑی دعوت تھی۔ دور دور سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ کون کب آیا، کب گیا، دادی ماں کو کچھ معلوم نہ تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک لمبی عمر کی کہانی تھی، وہ اسی میں سارا دن الجھی رہی۔

وہ بہت رات گئے چارپائی پر لیٹی۔ دن کا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ سب کھا پی کر سو چکے تھے۔ پوجا گھر کے سامنے اس کا پوتا پورن سویا ہوا تھا۔ سوتے میں بڑبڑا رہا تھا۔ ایک طرف بہو ننھے کو سینے سے لگائے لیٹی ہوئی تھی۔ وہ پورن کے بارے میں سوچنے لگی۔ اپنے من ہی من میں باتیں کرنے لگی......... کیا پورن کبھی انسان بنے گا؟...... ٹھیک راستے پر آئے گا؟ اپنے اس خاندان کے بارے میں سوچے گا جس کی ہمیشہ ایک شاخ ہری ہوئی اور سوکھ گئی؟ جس شاخ کو میں نے آج تک گرمی سردی سے بچائے رکھا وہ دوسری چھوٹی موٹی شاخوں کو جنم دے گی؟ کیا وہ خود قائم رہے گی؟ کیا پورن؟......... من ہی من میں باتیں کرتے دادی ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دور سے ننھے کو دیکھا جس کے گلے میں پڑی سونے کی سیڑھی مدھم مدھم روشنی میں جھلملا رہی تھی۔ اس پر نظریں پڑتے ہی پنڈت جی کی باتیں یاد آئیں......... بچے کی عمر لمبی۔ ودیا اونچی، خاندان اور زمین و جائیداد کی اُنتی، پتا کو راستے پر لائے، خاندان کا نام روشن کرے......... پنڈت جی کی باتیں یاد آتے ہی اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ اس کے معصوم ہونٹوں پر معصوم سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وفورِ مسرت سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ چارپائی سے اٹھ کر پورن کے پاس دیر تک بیٹھی رہی۔ وہ دیکھتی رہی، اس کی پیشانی چومتی رہی، بہو کی چارپائی کے پاس گئی، اس کے ایک ایک زیور کو چھوا، اس کا ماتھا چوما، اپنی خالی گود سمیٹ کر ننھے کو دیکھا، اسے گود میں اٹھا کر سینے سے لگانا چاہتی تھی۔ جھجک گئی، اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سونے کی سیڑھی کو چھوا، ہونٹوں سے لگایا اور پوجا گھر میں جا کر بیٹھ گئی، آج دادی ماں کا دن تھا، آج اس کی رات کو بھی اپنا بنانا چاہتی تھی۔ بھگوان کی مورتی کے سامنے بیٹھ کر اپنا پیارا بھجن گنگنانے لگی۔ گاتے گاتے اس نے آنکھیں موند لیں۔ اب بھگوان کی مورتی کہیں نہ تھی، صرف ننھے کی مورتی تھی، جس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے سورگ سیڑھی تھام رکھی تھی۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں آہستہ آہستہ سیڑھی چڑھنے لگی۔ سیڑھی چڑھتے چڑھتے جیسے تھک گئی ہو۔ سارا جسم کانپنے لگا، سانسیں، تیز ہو گئیں، جیسے وہ تھک ہار کر اسی پرستانے بیٹھ گئی ہو۔

صبح سویرے دادی ماں کے ارد گرد اپنے پرائے سب جمع تھے۔ ہر کسی کی آنکھوں میں آنسو تھے، صرف ننھا مسکرا رہا تھا جیسے اس نے دادی ماں کی ایک دیرینہ آرزو پوری کر کے اپنے خاندان کے سر سے برسوں کا مقدس قرض اُتار دیا ہو

ٹھاکر پُونچھی، ہم اور وہ

ٹھاکر مدن سنگھ

آنجہانی ٹھاکر پونچھی کا جنم اکتیس دسمبر 1922ء کو ریاست جموں وکشمیر کی ایک چھوٹی سی ریاست پونچھ کے محلہ جرنیلاں میں ہوا۔ گھر میں اکثر منشی پریم چند، عظیم بیگ چغتائی، چراغ حسن حسرتؔ اور کے ایل سہگل کا تذکرہ ہوتا تھا۔ گھر میں ہورہی ان باتوں کو بڑے انہاک سے سنا کرتے تھے۔ وہ ابھی چھٹی جماعت کے طالب علم تھے کہ انہوں نے باقاعدہ ہارمونیم بجانا سیکھ لیا تھا۔ وہ اسکول کے ڈراموں میں گیت گاتے اور اکثر انعام پاتے تھے، اسکول کا ماحول نہایت ادب پرور اور ادب مزاج تھا علاقے کے شہرۂ آفاق اُستاد سرفراز حسین خان تحسین جعفری اسکول میں اُردو کے ٹیچر تھے۔ (جو بذاتِ خود بہت اچھے شاعر اور ادیب تھے اور تحسین تخلص فرماتے تھے) اسکول کے ذہین طلباء کو حوصلہ افزائی کرنا تحسینؔ صاحب کا شیوہ تھا۔ اس لئے ٹھاکر پونچھی کو خاص عزیز رکھتے تھے۔ ٹھاکر پونچھی نے سولہ برس کی عمر میں میٹرک پاس کیا اور مزید تعلیم کے حصول کے لئے جموں روانہ ہوگئے۔ پرنس آف ویلز کالج جموں میں داخلہ لیتے ہی انہوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ افسانہ نویسی کی صنف میں دلچسپی لینا بھی شروع کر دیا۔ ان کے ابتدائی افسانے جموں کے ہفت روزہ اُردو اخبار ''چاند'' میں شائع ہونے شروع ہوئے۔

جب وہ جموں سے پہلی مرتبہ واپس پونچھ تشریف لائے تو انہوں نے پونچھ میں کرشنا ڈرامیٹک کلب کی بنیاد ڈالی۔ اس کلب کی ثقافتی سرگرمیوں کے دوران انہوں نے ''شاردا''۔ ''چتر لیکھا'' اور ''سکندر'' نام کے ڈرامے پونچھی عوام کے سامنے دلکش انداز میں اسٹیج کر کے خوب داد پائی۔ ان ڈراموں میں ان کی دلچسپی اور شمولیت کا یہ عالم تھا کہ ہدایت کاری کے ساتھ ساتھ موسیقی کے فرائض بھی خود انجام دیتے تھے۔ ٹھاکر صاحب نے گھر میں ایک ایسا ہارمونیم رکھا تھا جس میں اپنے پیروں کی تھاپ کے ذریعے ہوا بھری جاتی تھی اور اکثر گھر کے باہر گلی میں سے گزرتے ہوئے پچا رحمانے کو بلا کر ایک آدھ کشمیری گیت کے علاوہ خصوصی طور پر ''اکھیاں ملا کے جیا بھرما کے چلے

نہیں جانا'' جیسا ایک مشہور فلمی گیت سنا کرتے تھے۔

بی اے پاس کرنے کے بعد وہ محکمۂ فوڈ اینڈ سپلائز میں بہ حیثیت کلرک ملازم ہو گئے۔ ملک کی تقسیم کے فوراً بعد جب حکومتِ ہند نے ریڈیو اسٹیشن جموں کا قیام عمل میں لایا تو عظیم افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کی ہدایت پر ٹھاکر صاحب دہلی چلے گئے اور نیوز سروس ڈویژن میں بحیثیت ڈوگری اناؤنسر کام کرنے لگے۔ انہی دنوں ''امن'' کے موضوع پر ایک کل ہند کہانی مقابلہ ہوا جس میں ہندوستان کے اس وقت کے تمام سرِ فہرست ادیبوں نے شرکت کی۔ کہانی مقابلے میں پانچ انعام رکھے گئے تھے۔ ٹھاکر صاحب کے افسانے ''موت کے سائے تلے'' کو چوتھا انعام ملا۔ جبکہ اول، دوم، سوم اور پنجم مقامات کے لئے بالترتیب خواجہ احمد عباس، خدیجہ مسرور، ہاجرہ مسرور، اور سرلا دیوی (ہمشیرہ کرشن چندر) کا انتخاب ہوا۔ بعد ازاں ٹھاکر مرحوم کی یہی کہانی عالمی کہانی مقابلے میں بھی شامل ہوگئی۔

ٹھاکر پونچھی کی پہلی کہانی '' خانہ بدوش'' تھی جبکہ ان کا آخری افسانوی کارنامہ ''یہ موتی ابھی کچے ہیں''۔ اس آخری افسانے کا پس منظر کشمیر کی وادی ہے۔ مرحوم کا پہلا ناول ''ڈیڈی'' تھا۔ یہ ناول اونچے لوگوں کے سماج کے قول و فعل اور کردار کی عکاسی کرتا ہے۔ اور ان کا آخری ناول ''اب میں وہاں نہیں رہتا'' ہے۔ یہ آخری ناول ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس ناول میں ٹھاکر پونچھی نے ریاست جموں وکشمیر کے ماضی اور حال کو حوالہ بنا کر داستان رقم کی ہے۔ ان کا ایک ناول ''وادیاں اور ویرانے'' اُردو ہندی اور ڈوگری میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ ناول پہاڑوں اور وادیوں کے کلچر اور ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ شہرت اور مقبولیت کے اعتبار سے دیگر ناولوں میں۔ زلف کے سر ہونے تک۔ اُداس تنہائیاں۔ جب پتھر روتے ہیں۔ رات کے گھونگھٹ۔ پت جھڑ کے بچھڑے۔ قفس اُداس ہے۔ پیاسے بادل۔ چاندنی کے سائے اور کلیوں کا مزار قابلِ ذکر ہیں۔ ٹھاکر مرحوم کے افسانوں اور کہانیوں میں دو پیڑھی۔ پگڑی۔ سفر۔ بلور خان۔ اور ایک عورت ایک مرد ایک کتا۔ معیاری ادب میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ڈراموں کی بات کریں تو قیامِ دلی کے ابتدائی ادوار میں اسٹیج کے لئے لکھے گئے ان کے ڈرامے اپنی دنیا۔ آخری راستہ۔ اور سنجوگ بے حد مقبول ہوئے۔ یہ تینوں ڈرامے ٹھاکر مرحوم نے رضا کارانہ طور پر حکومت کے اصرار پر ریلیف فنڈ کے لئے لکھے تھے۔

دسمبر ۱۹۲۲ء سے ۱۴ اگست ۱۹۷۴ء تک اپنی ۵۲ سالہ زندگی میں ٹھاکر پونچھی نے دو درجن سے زائد ناول اور پونے چار سو کے قریب افسانے لکھے۔ جبکہ اسی دوران ان کے دو افسانوی مجموعے ''زندگی کی دوڑ'' اور ''چناروں کے چاند'' کے عنوان کے تحت شائع ہوئے۔ ٹھاکر صاحب کی بیشتر کہانیوں کے ترجمے ہندی، پنجابی، مراٹھی، ملیالم، اور بنگلہ میں بھی ہوئے جبکہ ان کے کچھ ناول '' آئینۂ ادب'' لاہور جیسے معتبر ادارے نے شائع

گئے۔ برسوں قبل ٹھاکر صاحب کی طویل کہانی ''زندگی سے پہلے اور موت کے بعد'' کو ساغر نظامی مرحوم کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ ''ایشیاء'' میں اشاعت پذیر ہونے کا اعزاز ملا تھا۔ ایک نئے اور اچھوتے موضوع کے حوالے سے ایک ریل حادثے کے متعلق لکھی گئی یہ کہانی مشہور فلم ڈائریکٹر رمیش سہگل کو اتنی پسند تھی کہ ایک مرتبہ انہوں نے اس کا ذکر کرشن چندر سے کرتے ہوئے انہیں ریل حادثہ کے موضوع کو لے کر ایک فلم بنانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ فلم تو بہر حال نہ بن سکی۔ لیکن مرحوم ٹھاکر کی یہ کہانی کرشن چندر کے مشہور ناول ''دل کی وادیاں سوگئیں'' کا محرک ضرور بن گئی۔ جس کا اعتراف کرشن چندر نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ اپنے متذکرہ ناول کے دیباچے میں کیا ہے۔

ٹھاکر پونچھی کی ناول نگاری کے بارے میں مشہور نقاد ڈاکٹر شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں کہ ٹھاکر پونچھی کے ناول تشکیک کے پندار کو توڑتے ہیں۔ اور جو نفسیاتی الجھاؤ ان ناولوں میں پائے جاتے ہیں اور دوسرے ناول نگاروں کے ہاں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ بے شک اُردو ناول نگاری میں ٹھاکر پونچھی نے ناول نگاری کی لاج رکھ لی ہے۔

ٹھاکر پونچھی نے اپنے چوبیس برسوں پر مشتمل ادبی دور میں اُردو ادب کی بے لوث خدمت کی ہے ادب کے ساتھ ساتھ اپنے لگاؤ کے طفیل انہوں نے اُردو ادب کو کچھ نامور ادیب بھی دیئے۔ انہی خدمات کے پیش نظر ان کی اچانک وفات پر مشہور بین الاقوامی مصور کشمیر کے غلام رسول سنتوش نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے سرینگر میں ٹھاکر پونچھی کے حوالے سے ایک مصورانہ نمائش کا اہتمام بھی کیا۔ عالمی پیمانے کی اس نمائش کو دیکھنے کے لئے خصوصی طور پر شیر کشمیر شیخ محمد عبد اللہ بھی تشریف لائے تھے۔ جہاں ڈوگری کی مشہور شاعرہ پدما سچدیو ٹھاکر صاحب کی مداح تھیں، وہیں ٹھاکر پونچھی نے پدم شری پروفیسر رام ناتھ شاستری اور ڈوگری کے معتبر شاعر کبیر سنگھ مدھو کو بھی ادبی حلقوں میں متعارف کروانے میں خاصی دلچسپی لی۔

ٹھاکر پونچھی والیِ ریاست جموں وکشمیر لداخ وتبت ہائے متحدہ کے نہایت قریبی اور معتبر جرنیل وزیر رتنوں (رتنا) والد وزیر پنوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وزیر پنوں ریاست جموں وکشمیر کے اولین ڈوگرہ گورنر تھے۔ اسی خاندان کی ایک شاخ نقل مکانی کر کے جموں سے پونچھ چلی آئی تھی۔ ٹھاکر مرحوم کی دادی اماں کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ انہوں نے والیِ ریاست پونچھ راجا بلدیو سنگھ کی پہلی اولاد (جو کہ ایک راجکماری تھیں) کو دودھ پلایا تھا۔ جبکہ ٹھاکر مرحوم کی پردادی اماں نے بھی مہاراجہ رنبیر سنگھ جی کے جنم کے وقت ان کو بچپن میں اکثر دودھ پلایا تھا۔ انہی نزدیکیوں اور تعلقات کے سبب ٹھاکر پونچھی کا خاندان ہمیشہ ریاست پونچھ کے ڈوگرہ حاکموں کی قربت میں رہا۔ وزیر

رتنوں کو بعد کشمیری مورخوں نے وزیر رتنا بھی لکھا ہے اور بعد ازاں شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ صاحب کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی بنا پر ان کے بھی بہت قریبی گردانے جاتے تھے۔ مشہور کانگریسی سیاست دان نے اپنے ایک کالم میں ان کو ریاست چمبہ (ہماچل پردیش) کا باشندہ بتایا ہے۔ جبکہ یقیناً یہ بات درست نہیں ہے بلکہ محض قیاس پر مبنی ہے وہ تحصیل جموں کے گاؤں چلاّ کے رہنے والے تھے۔

ٹھاکر پونچھی مرحوم کے والدِ محترم کا نام بابو بھیم سین تھا اور راجا سکھد یو سنگھ جی کے اے ڈی سی تھے۔ ٹھاکر مرحوم کے والد بھیم سین کے دو اور حقیقی بھائی تھے۔ ایک میرے والد مرحوم ٹھاکر سندر داس جوان سب سے بڑے تھے اور ایک ان سے چھوٹے ٹھاکر نند لال۔ ٹھاکر نند لال کا بچپن موتی محل کی چہار دیواری میں ہی گزرا۔ ڈرائنگ اور مصوری میں کمال رکھتے تھے۔ بطور ٹائپسٹ ڈی سی آفس پونچھ میں کافی عرصہ تعینات رہے۔

ٹھاکر پونچھی کے والد مزاجاً کافی ادب نواز طبیعت کے مالک تھے اور اپنے علاقے میں پولو اور نیزہ بازی کے ایک مشہور کھلاڑی واقع ہوئے تھے۔ ٹھاکر پونچھی کا گھریلو نام سوہن لال یا سوہن سنگھ تھا۔ گھر میں اکثر انہیں سوہن اور اسکول میں جگن ناتھ پکارا جاتا تھا۔ اہل پونچھ اور اہل دربار ٹھاکر جی کو ''جگنو'' کے نام سے پکارتے تھے۔ ٹھاکر جی کی شادی جموں میں ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ اور جہاں ٹھاکر جی کی شادی ہوئی وہ گھرانہ بھی ایک مشہور وزیر اور جاگیردار کا خاندان تھا۔ ٹھاکر جی کی بیگم زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ کیونکہ اس زمانے میں ہم ٹھاکر لوگوں میں پردے کا سخت رواج اور اہتمام ہوتا تھا اور لڑکیوں کی پڑھائی لکھائی کو معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ طالب علمی کے دور میں ٹھاکر صاحب ایک ذہین طالب علم ہوئے تھے۔ اپنے والد کی طرح کھیل کود کے بھی سخت دلدادہ تھے۔ ہمارا محلہ فوجی جرنیلوں کا مسکن تھا۔ اسی لئے اس محلے کا نام محلہ جرنیلاں مشہور ہوا۔ شخصی حکومت میں ہمارے محلے کے تقریباً ہر خاندان کے پاس نجی یا راجاؤں کی پرائیویٹ جاگیروں کی ملکیت تھی۔

ہمارے محلے کی اس شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کا یہ اثر تھا کہ راج پریوار ہماری منشاء کے مطابق ہی ہم سے غلے کا حساب لیا کرتے تھے۔ اپنے جاہ و حشم کی وجہ سے ہمارے محلے کا ہر گھر اور خاندان ایک جاگیر سے کم نہ تھا۔ ہم لوگ اپنے ہاتھوں سے کوئی کام کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور دوسرے لوگوں پر حکم چلانا ہمارا ازلی حق ہوا کرتا تھا۔ مزدور کو بطور مزدوری ہم جو کچھ بھی عطا کرتے تھے وہ اسے خوشی خوشی قبول کر لیتا تھا اور اس مزدوری کو اپنے حق حلال کی کمائی سمجھنے کے بجائے خدا کا کرم تصور کرتا تھا۔

ان تمام باتوں کے برخلاف ٹھاکر پونچھی ابتدا سے ہی ان تمام رسوم وقوائد کے خلاف تھے۔ زیادتی اپنے سے ہو یا پرائے سے ان کا دل پسیج جاتا تھا۔ اکثر سود وزیاں کی پرواہ کئے بغیر زیادتی کرنے والے سے الجھ جایا کرتے

تھے۔ اکثر کسی صاحب کی دادا گیری دیکھنے کے بعد وہ اس بات کی کم ہی پرواہ کرتے تھے کہ اس کی ذات منزلت اور رتبہ کیا ہے۔ عمر اور رتبے کی تمام سرحدیں ان موقعوں پر پھلانگ جانا ٹھاکر جی کا شیوہ تھا۔ وہ ظالم سے صرف اور صرف نفرت کرنے کے قائل تھے۔

آج سے چونسٹھ برس پہلے میرے والد صاحب کی وفات ہوئی تو گھر کے کچھ افراد نے ہمیں بوجھ سمجھ کر خود سے الگ رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن انہوں نے کسی کی نہیں چلنے دی۔ بے دھڑک کہا ''تایا مر گئے تو کیا ہوا آپ سب تو نہیں مر گئے''۔ اور انہوں نے جو کچھ کہا وہ کر بھی دکھایا۔ انہوں نے نہ صرف مجھے پڑھایا لکھایا بلکہ دلی جانے سے پہلے میرے بڑے بھائی کو اپنی کلرکی کی پوسٹ پر تعینات کرا گئے۔ وسعت خیالی اور انسانی خلوص کا یہ عالم تھا کہ اپنی سگی بہنوں کی شادی پر بلانے پر بھی نہیں آئے۔ لیکن آج سے اٹھارہ برس پہلے جب میری بہن کی شادی ہوئی تو بن بلائے آدھمکے اور اپنے والد صاحب کو جو گھر کے سربراہ تھے، میری بہن کی شادی پر پانچ ہزار نقد بطور امداد بھی دیئے۔ رشتہ دار عورتوں نے طنزاً پوچھا ''سگی بہنوں کی شادی پر تو آئے نہیں لیکن اس کی شادی پر بن بلائے آپہنچے، کیا یہ بڑی سگی ہے؟''۔ انہوں نے اپنی سگی بہنوں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا ''ان کا باپ زندہ ہے اور اس کا مر گیا ہے۔ جب ان کا بھی مر جائے گا تو آجاؤں گا''۔ ان کا یہ کورا سا جواب سنتے ہی سب کھسیا گئیں۔

(یہ مضمون ٹھاکر پونچھی کی وفات کے بعد لکھا گیا اور اُس وقت ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی کے دسمبر ۱۹۷۶ء کے شمارے میں شائع ہوا)

☆☆☆

گوری

آنند لہر

کچھ ان کے بارے میں:

نام: شام سندر

قلمی نام: آنند لہر

پیدائش: 2 جولائی 1954ء محلہ سرائے، پونچھ۔

تعلیم: بی ایس سی، ایل ایل بی

ادبی زندگی کا آغاز: کالج دور سے

تصانیف: انحراف (افسانوی مجموعہ)۔ پتسوی کون (ڈرامہ) اگلی عید سے پہلے (ناول)۔ نروان (ڈرامے) سرحد کے اُس پار (افسانوی مجموعہ)

پیشہ: وکالت

ذریعۂ اظہار: اُردو

موجودہ پتہ: مکان نمبر 19 بخشی نگر جموں (جموں و کشمیر)

رات کے بنائے ہوئے مٹی کے برتن گوری دن کو بیچتی ہے اور ان برتنوں سے دکان یوں سجاتی ہے جیسے آسمان، چاند ستاروں سے، وہ بوڑھے باپ کا سہارا ہے اور مٹی کے برتن گوری کا سہارا ہیں۔ گوری مٹی کا کھیل کھیلتی ہے اور اپنے فن سے اس کو قسم قسم کے خوبصورت برتنوں کی شکلیں عطا کرتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مٹی کے ان روپوں کی حقیقت بھی بس مٹی ہی ہے۔

روشن بھی گوری کے ساتھ ہی جوان ہوا تھا، اس نے گوری کے بدن پر ابھار اگتے دیکھے تھے، اور گوری نے اس کے چہرے پر داڑھی اور مونچھ۔ انہوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں کے اندر حرارت محسوس کی تھی اور انگلیوں میں ایک دوسرے کی خواہش کی جنبش، جسموں نے ایک دوسرے کی آرزوؤں کو اپنے اندر محسوس کیا تھا اور گوری نے برتنوں کے ساتھ اپنے آپ کو بھی سجانا شروع کیا تھا۔ روشن ہر صبح ایک گھڑا خرید تا پھر اسے توڑ دیتا۔

گوری کا بھائی گلاب بھی عام لڑکوں کی طرح

ہی جوان ہوا تھا گیندے کے پھولوں پر اُس برس بھی نکھار آیا۔ گیندے کا پھول عجیب طرح سے کھلتا ہے۔ گلاب کا پھول کُھل کر کھلتا ہے اسے اس طرح سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے جس طرح اٹھارہ برس کی لڑکی دانت دکھانے کی کوشش میں بے وجہ ہنستی ہے، گلاب کی آنکھیں پھولوں کی کیاری میں کام کرنے والی گو پا سے ٹکرا گئیں اور مٹی کے کھیل نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ سیب کے پودوں پر پھول لگے تھے کہ اتنے زور سے آندھی چلی اور انہیں اڑا لے گئی پھر سب کو یہ خیال آیا جس نے جو پایا، وہی اسکا مقدر جو جہاں پہنچا وہی اس کی منزل۔

آرزوؤں کے اس کھیل میں گلاب زخمی ہو گیا، لگا کہ اس کی خواہشیں اس پر بوجھ بن گئی ہیں۔ گو پا دور سے اس کھیل کا مزہ لے رہی تھی اور گوری مٹی کے برتنوں کے کھیل میں کھو گئی تھی۔ ایک دن کنارے پانیوں سے جا ٹکرائے اور گلاب کی کشتی بھنور کا کھیل کھیلتے ڈوب گئی، گو پا مٹی کے کھیل میں مست ہو کر کھلونوں سے دل لگا چکی تھی۔ وقت کی آندھی نے کھلونوں کو زخمی کر دیا۔

وہ زخم گو پا نے اپنے دل پر محسوس کئے، پھر گو پا وقت کی ہو گئی، گلاب بے وقت دیش چھوڑ کر چلا گیا اور گوری بالکل اکیلی رہ گئی۔

روشن ہر روز گوری کی دکان سے برتن خریدتا اور کوشش کرتا کہ اس کی انگلیوں سے گوری کی انگلیاں چھو جائیں۔ ایک دن یہی ہوا، آنکھوں نے چیخ کر کہا'' جوانی کی مستی عمر سے بغاوت کرنا چاہتی ہے اور دعا کی کہ اے بھگوان دو برس کھل کر جینے دے''۔ کانوں کو دو نام اچھے لگے'' روشن، گوری''۔

رات ہوتے ہی روشن اپنا گھڑا توڑ دیتا اور صبح اٹھ کر گوری کی دکان پر چلا جاتا، ایک دن روشن کو دیکھتے دیکھتے گوری کے ہاتھوں سے گھڑا گر کر ٹوٹا اور بستی کا یہ بھرم بھی ٹوٹا کہ ہندو مسلمان پیار نہیں کر سکتے۔

لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ روشن اور گوری ایک دوسرے کو چاہتے ہیں'' روشن اور گوری کی جوڑی کتنی اچھی ہے''۔ گوری کے باپ نے سوچا کاش روشن مسلمان ہوتا، روشن اور گوری کی جوڑی جیسے بھگوان نے خود بنائی ہو۔

روشن کی ماں نے سوچا'' کاش گوری ہندو ہوتی'' سوچوں کا یہ سلسلہ جاری ہونے لگا۔ چاہتیں آگے بڑھیں اور خواہشوں کے زینوں کو پار کرنے لگیں۔

پیار کا نور بھی کیا چیز ہے جو عقیدوں کی روشنی کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ چہروں کی خوبصورتی ہوا چرا لیتی ہے اور پھولوں کے حسن سے ہی موسموں پر نکھار آتا ہے۔ آنکھوں میں جب عشق کی لگن لگتی ہے تو آسمان کی وسعت بھی ان میں چھپ جاتی ہے۔ پیار کے چشمے کو جب پھوٹنا ہوتا ہے تو مذہبوں، ذاتوں اور عقیدوں کی زمین کمزور ہو جاتی ہے۔ لفظ ترنم بن کر ہونٹوں سے نکلتے ہیں اور لگتا ہے ستارے ہاتھ توڑ رہے ہیں اور پھر اس وقت

سرد ہوائیں سانوں کو گرم کرتی ہیں اور سخت و کھردری چٹانوں پر پاؤں نرم ہوتے ہیں۔

گوری برن بناتی گئی اور روشن خریدتا گیا، برتن نہ ہندو ہوتے ہیں اور نہ مسلمان یہ تو بس مٹی کے ہوتے ہیں۔ مٹی جس کا کوئی دھرم نہیں، مذہب نہیں، یہ تو بس مٹی ہے جہاں بھی ہے مٹی ہے۔

محبت کے ایک لفظ کے آگے مذہبی کتابوں کے فلسفے جھوٹ نظر آتے ہیں۔ ایک دن ان دونوں نے سوچا وہ صرف گوری روشن ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ بہن، بھائی، چچا، دوست اور دشمن تو آگے ہی تھے پھر یہ ہندو مسلمان بننے کی کیا ضرورت تھی۔ آدمی ہندو نہ ہو کر بھی اچھا ہو سکتا ہے، پوجا کر سکتا ہے، دان دے سکتا ہے اور مسلمان نہ ہو کر بھی اسلام کے اصولوں پر چل سکتا ہے، نماز پڑھ سکتا ہے، غریب کی مدد کر سکتا ہے۔ یتیموں کا سہارا بن سکتا ہے۔

گوری اور روشن کا پیار آگے بڑھا مذہبوں کی دیواریں لوگوں کو کمزور کرنے لگیں۔

لوگ پیار کی ندی کے بہاؤ کو روکنے کے لئے ریت کی دیواریں بنانے میں مصروف ہو گئے۔ جھوٹ کے پہرے دار سچائی پر چوری کا الزام لگانے لگے۔ یہ بھول گئے کہ سچ اپنی پہچان خود ہے۔ اسے مذہبی لباس کا سہارا نہیں چاہیے اور نہ ہی وہ عقیدوں اور ذاتوں کے گھروں میں رہتا ہے۔

گوری ایک دن پریشانی کے عالم میں اپنے گھر کے اندر بیٹھی ہوئی تھی، روشن آیا اور کہنے لگا ''گوری خوش ہو جا۔ سارا مسئلہ ہی ختم ہو گیا، میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ میں بالکل ویسا ہی ہوں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑا مگر لوگ خوش ہو گئے''

گوری نے ایک دم جواب دیا'' یہ تم نے کیا کیا، تجھے معلوم نہیں تجھے پانے کے لئے میں پہلے ہی ہندو بن گئی ہوں''۔

☆☆☆

عرفان

خوشدیو مینی

چاہا تھا جنہیں وہ میت گئے

خوشیوں کے زمانے بیت گئے

ہم ہار گئے وہ جیت گئے

گویا اپنی دھن میں محبت کا گیت گائے جا رہا تھا، شاعر کے بول سامعین کے کانوں میں شہد گھول رہے تھے۔ بول جو دل سے نکل کر دلوں میں اتر رہے تھے۔ لفظ جو محبت کا اظہار، عشق کا تحفہ اور دوستی کی علامت تھے، جو بے وفائی کی داستان اور ایثار و قربانی کا ثبوت تھے، جو محبوب کا پیکر اُس کے لب و رخسار چہرے کا نور اور آنکھوں کا سرور تھے، شاعر کے گیتوں میں ڈھل کر سامعین پر وجد طاری کر رہے تھے۔ سب کی نگاہیں شاعر کی منتظر تھیں لیکن شاعر، شاعر تو سامعین سے دور شیدائیوں سے پرے مرکزی ہال کے عقب میں پت جھڑ کے شجر کی طرح ویران کھڑا تھا۔ اور مسلسل سگریٹوں کے کش لگائے جا رہا تھا۔ شاعر جس کی زبان اس کے جسم کی طرح لرز رہی تھی جس کا جسم اس کی آنکھوں کی طرح جھکا ہوا تھا جس کی آنکھیں اس کے خیالات کی طرح الجھی ہوئی تھیں اور جس کے خیالات اپنی تخلیق کے حقیقی کردار کو ڈھونڈنے میں مصروف تھے، دور اندھیرے کی اوٹ میں ایک ستون کا سہارا لئے کھڑا اپنی ہی تخلیقات پر مبنی پروگرام سن رہا تھا۔

لیکن شاعر اس وقت اپنے جسم میں کہاں تھا وہ تو بیتے ہوئے لمحوں کی سنگلاخ بلندیوں پر کھڑا اپنے محبوب کو پکار رہا تھا۔ اسکی نگاہیں تو ماضی کی دھند سے خوشیون کے وہ زمانے ڈھونڈ رہی تھی جب پہلی بار اُسے محبوب کا قرب نصیب ہوا تھا اور دوستی اور رفاقت کے جذبوں سے سرشار اس نے محبوب کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر محبت کا اظہار کیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا ہاتھ تھا جو صنفِ نازک کی مخروطی انگلیوں سے مس ہوا تھا اور اسے اپنی انگلیوں کے

پوروں میں مسرت آمیز اور راحت بخش برقی رو سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ پھر جلد ہی یہ لبھاونی گداز کیفیت اس کے سارے وجود میں پھیل گئی تھی۔ اور اس کا شعور، فہم، ادراک اس کے ہوش وحواس ایک عجیب قسم کی مستی سے تر بتر ہو گئے تھے اور اُسے اس طرح لگا تھا جیسے ایک ہی ساعت میں ہزاروں کلیاں چٹخ کر پھول بن گئی ہیں۔ آوارہ ندیوں کو دریاؤں کا قرب اور متلاشی دریاؤں کو سمندروں کا وصل نصیب ہوا جیسے ہزاروں گھنٹیاں اور شنکھ ایک ساتھ بج اٹھے ہوں اور سکھ شانتی کے منگل گائے جا رہے ہوں اور جیسے قدیم مٹھوں کی دیوداسیوں کی روحیں دو اجنبی ہاتھوں کے پہلے ملاپ پر پکار اٹھی ہوں۔ مبارک۔ مبارک

شاعر کا ہاتھ محبوب کے ہاتھ میں پگھل رہا تھا اور تسکین بھری رواُن کے جسموں میں کنمنا رہی تھی۔ ذہن سرور اور خوشیوں سے معطر تھا، ہر طرف شانتی سکون اور محبت کی ہوا چل رہی تھی کیا یہی نروان ہے؟۔ یہ سوچتے ہی شاعر کو زندگی کا حاصل محبت کی تکمیل میں نظر آیا تھا۔

شاعر نے اس وقت محبوب کے ہاتھوں کے لمس کو اپنے ہاتھوں پہ محسوس کیا اور سوچا کہ کاش یہ ہاتھ اُس نے کبھی نہ دھویا ہوتا کہیں نہ چھوا ہوتا لمس کی بھینی بھینی کیفیت کو سنبھال کے رکھتا کہ ان ہاتھوں کو محبوب کے ہاتھوں کے وصل کا فیضان حاصل ہوا تھا۔

مرکزی ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور داد کی گھن گرج سے گونج رہا تھا۔ شاعر کی نظمیں سامعین کے دلوں میں جادو جگا رہی تھیں، اس وقت گویا شاعر کے ایک مشہور گیت کے اس شعر کو سُروں کا لباس پہنایا جا رہا تھا۔

جب باغ میں کوئل بولے گی
کانوں میں مدھر رس گھولے گی (دت)

گویّے کی آواز دور کھڑے شاعر کے کانوں میں گھوڑے کی ٹاپ کی طرح گونج رہی تھی۔ تبھی شاعر آواز کے اس گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس باغ میں جا پہنچا، جہاں کوئل اور پپیہے بول رہے تھے۔ ٹھنڈی ہواؤں کے خنک جھونکے بدن کے بوسے لے رہے تھے۔ جہاں چنار اور سرو کے سربلند درختوں تلے شاعر اور اس کے محبوب نے ایک دن محبت وفا اور دوستی کے وعدے کئے تھے، اُس روز سرخ سورج افق کو گلنار بناتا ہوا اس کی خوشیوں میں شریک ہوا تھا۔ پھولوں پر منڈلاتے ہوئے بھنوروں نے بھوں بھوں کر کے خوشی کے نقارے بجائے تھے، چنبیلی کے سبز پتوں نے سربسجدہ انہیں خوش آمدید کہا تھا اور طوطے رنگ گھاس نے شاعر اور اس کے رفیق کو اپنی نرم دوب پر بیٹھنے کی ترغیب دی تھی۔ اور وہ گھاس کی مخملی قالین پر بیٹھے ہوئے پرسکون انداز میں ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔ تب خاموشی گھونٹ گھونٹ اُن کے حلق سے اتر رہی تھی، محبت بوند بوند ان کے دلوں میں ٹپک رہی تھی اور عشق قطرہ قطرہ ان کے

بدن میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ تب آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں نے ساتھ ہمیشہ ساتھ دینے اور ساتھ رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور سوچ لیا تھا کہ اب وہ ایک ساتھ سوچا کریں گے اور اپنی ہر خوشی اور غم رات اور دن، ذہن اور دل کو ایک دوسرے کی رفاقت، کشش اور قربت سے سرشار رکھیں گے۔ وہ خاموش تھے اور پر سکون تھے اور محوِ گفتگو تھے وہ اب روپ اور اروپ لفظ اور خاموشی دونوں صورتوں میں ہم کلام تھے اس وقت ان دونوں کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے وجود میں شامل ہیں۔ اسی لئے اب اُن کے لئے دو جسموں کے ایک ہو جانے کے احساس نے بھی اپنی کشش کھودی تھی کیوں کہ محبت نے دونوں کو ختم کر دیا تھا اور وہ ایک ہو چکے تھے تب شاعر اس حقیقت سے روشناس ہوا تھا کہ محبت ہی اصل حقیقت ہے۔ زندگی کا حاصل اور تسکین کا مرکز یہی ہے۔

اب طبل کی تھاپ بدل چکی تھی، سُروں نے لباس تبدیل کر لیا تھا، گویّے کی آواز سراسیمگی میں ڈوب رہی تھی اور گیت کے بول مایوسی کے نمک میں گھل رہے تھے۔

لوگ کرتے ہیں عہدِ وفا ٹھیک ہے
کتنے ہوتے ہیں وعدے وفا سوچ تو
کیسے ہوتے ہیں عاشق جدا سوچ تو

یہ بول سنتے ہی شاعر کے ذہن میں جدائی کے وہ لمحے عود کر آئے جب محبت قانون، سماج اور مذہب سے سند حاصل کرنے کے لئے منظر عام پر آئی تو اس کا گلا گھونٹ دیا گیا اور ذات برادری، اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کے تفرقوں نے دو کھلتے ہوئے پھولوں کپھلا کر رکھ دیا۔ اب شاعر اور اس کے رفیق کے درمیان فقط محبت ہی نہ تھی بلکہ وقار اور فرقت کے پہاڑ بدلتی ہوئی ساعتوں کے ساتھ ہی ساتھ بلند سے بلند تر ہوتے چلے گئے تھے۔

یہ سوچتے ہی شاعر کے چہرے پر غمگینی نے ویرانی کا سایہ ڈال دیا تھا۔ اُس کی شریانوں کے خون میں سرعت اور سبک رفتاری آ چکی تھی، نسیں پھول رہی تھیں اور جسم کی لرزشیں شدت اختیار کر گئی تھیں اور شاعر کو اپنے سینے میں بلوری کرچیں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

تبھی مرکزی ہال سے گونجتی ہوئی گویّے کی آواز نے شاعر کے خیالات کو نئی سمت عطا کی اور وہ ماضی کی چٹان سے ٹکرا کر چابک کھائے ہوئے گھوڑے کی طرح واپس پلٹ کر اپنے جسم میں داخل ہو گیا۔ ادھر مرکزی ہال میں شاعر کا یہ گیت ہوا کے دوش پر رقص کر رہا تھا۔

ہم کو جینا ہے اس دہر میں دور میں
اس سے کٹ کر جئیں گے تو مر جائیں گے

آؤ ضد چھوڑ دو زخم بھر جائیں گے

یہ بول سنتے ہی شاعر کے ذہن میں جدائی کے لمحے عود کر آئے جب محبت قانون، سماج اور مذہب سے سند حاصل کرنے کے لئے منظر عام پر آئی تو اس کا گلا گھونٹ دیا گیا اور ذات برادری، اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کے تفرقوں نے دو کھلتے ہوئے پھولوں کو جھلسا کر رکھ دیا۔ اب شاعر اور اس کے رفیق کے درمیان فقط محبت ہی نہ تھی بلکہ وقار اور فرقت کے پہاڑ کی بدلتی ہوئی ساعتوں کے ساتھ ہی ساتھ بلند تر ہوتے چلے گئے تھے۔

یہ سوچتے ہی شاعر کے چہرے پر غمگینی نے ویرانی کا سایہ ڈال دیا تھا۔ اس کی شریانوں کے خون میں سُرعت اور سبک رفتاری آچکی تھی، نسیں، پھول رہی تھیں اور جسم کی لرزش شدت اختیار کر گئی تھی اور شاعر کو اپنے سینے میں بلوریں کرچیں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

تبھی مرکزی ہال سے گونجتی ہوئی گویئے کی آواز نے شاعر کے خیالات کو نئی سمت عطا کی اور وہ ماضی کی چٹان سے ٹکرا کر چابک کھائے ہوئے گھوڑے کی طرح واپس پلٹ کر اپنے جسم میں داخل ہو گیا۔ ادھر مرکزی ہال میں شاعر کا یہ گیت ہوا کے دوش پر رقص کر رہا تھا۔

ہم کو جینا ہے اس ہر میں دور
اس سے کٹ کر جئیں گے تو مر جائیں گے
آؤ ضد چھوڑ دو زخم بھر جائیں گے

پر زخم آج بھی ہرے تھے ٹیس تو اب بھی اٹھ رہی تھی۔ اور درد جلتی ہوئی گیلی لکڑیوں کی طرح مسلسل سلگ رہا تھا۔ لیکن شاعر کے لئے یہ زخم محبوب کا تحفہ تھے وہ ان زخموں کی ہی تپش سے زندگی کی توانائی حاصل کر رہا تھا۔ اب تو وہ اس کرب اور اذیت سے مانوس ہو چکا تھا اور جب اُسے محبت دو جسموں کے ملاپ کے بجائے تیاگ کرنے اور اذیت سہنے میں نظر آئی تو محبت محبوب کے وجود سے نکل کر کائنات کے ذرے ذرے میں پھیل گئی اور خود شاعر ریزہ ریزہ ہو کر کائنات کے ہر ذرے میں شامل ہو گیا۔ اس طرح اب اس کا پیار معشوق کے دل میں دھڑکنے کے بجائے ہر دل میں دھڑکنے لگ پڑا تھا۔ اب سوال یہ نہیں تھا کہ کون کس کو بھول گیا۔ اور کس نے کس کو دھوکا دیا۔ سوال یہ بھی ختم ہو چکا تھا کہ اُس کی محبت جو ریاضت اور عبادت کی منزلیں طے کر چکی تھی، اس کا انجام کیا ہوگا، بلکہ سوال تو یہ تھا کہ اس نے محبت سے گیان حاصل کر لیا تھا۔ اور عشق مجازی نے زندگی کی اصل حقیقت کو اُس پر آشکارہ کر دیا تھا۔ اور وہ اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں ہر دکھ میں سکھ تھا۔ ہر رنج میں راحت اور ہر کوفت میں مسرت تھی۔ اس لئے اس کے چار سو محبت ہی محبت تھی۔

اسے یاد آیا ابھی کچھ دیر پہلے اس کا ادیب دوست اس پر ترس کھا کے اُسے انتقام کا درس دے رہا لیکن وہ ادیب کیا جانے کہ کون کس پر ترس کھا رہا ہے۔ اے نادان دوست یہ بھی ممکن ہے مجھے ہی تم پر رحم آ رہا ہو شاعر نے سوچا کیونکہ تم جو انتقام اور عمل کی راہوں پر گامزن ہو محبت کی حقیقت سے بے بہرہ ہو۔ تم کیا جانو کہ اس اذیت اور کرب میں کتنا قرار ہے۔ آنند ہے، سرور ہے تم نہیں جان سکتے کیوں کہ تم وہ ہو جنہوں نے محبت کے محلوں کو آگ لگا کے تماشا دیکھنا سیکھا ہے۔

اُس ادیب نے شاعر کو پسپائی اور فرار کا طعنہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ شاعر نے اپنی زندگی کی کشتی کے سارے چپو سمندر میں پھینک دیئے ہیں۔ شاعر نے سوچا کوئی اس خبطی ادیب سے پوچھے کہ یہاں کون ہے جس نے زندگی کی بندرگاہ دیکھی ہے یا جو کنارے پر اترا ہے یہاں تو سبھی وقت کے سمندروں میں ہچکولے کھا رہے ہیں اور حالات کے فیصلے سہتے چلے آ رہے ہیں۔ اس لئے اے بے وقوف دوست سن کہ میں نے اپنا جسم حالات اور ماحول کے سپرد کر دیا ہے۔ اور خود تماشائی بن کر دور جا کھڑا ہوا ہوں میرے لئے اب دنیا کی کسی بھی شئے میں کشش نہیں، کیونکہ ہر شئے کے بدلے میں محبت لے لی ہے اور محبت لے کر میں نے دنیا کی ساری خوشیاں ساری خوشبو اور سارا حسن حاصل کر کر لیا ہے۔ اب میں کس چیز کی تمنا کروں اور کیوں کروں۔ اب تو یہی تمنا ہے کہ کوئی تمنا ہی نہ کی جائے۔ کیونکہ یہاں تو ہر شئے فانی ہے، فنا ہے، تغیر پذیر ہے، لیکن محبت اٹل ہے، امر ہے، امٹ ہے، اس احساس سے روشناس ہونے کے بعد شاعر کو کھانے چھونے اور دیکھنے کی لذتوں سے اکتاہٹ ہو چلی تھی اور اُس نے اپنی ہر حسرت، ہر تمنا اور ہر خواہش پر لفظ محبت لکھ دیا تھا، اور زندگی کی ہر شئے سے بے نیاز ہو کر شاعری کا جامہ پہن لیا تھا اور محبت کے گیت لکھنا شروع کر دیے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ شاعری کی بساط سُروں پر بچھی ہے اور سُر ابدی ہے۔ اس طرح جب تک سُر رہے گا اس کی شاعری رہے گی۔ جب تک شاعری رہے گی اسکی محبت زندہ رہے گی، اور جب تک اس کی محبت کے گیت زندہ رہیں گے وہ دوسروں کی زبان پر رقص کرتا رہے گا، اس طرح شاعر نے خود کو فنا ہونے سے بچا لیا تھا۔

اب مرکزی ہال میں پروگرام اختتام پذیر تھا سامعین نے شاعر کے تخیل کی پرواز اور شعروں کے حسن کا لوہا مان لیا تھا۔ نقادوں نے اسے دورِ حاضر کا بہترین نظم نگار کہا تھا۔ اور اس کی حوصلہ افزائی اور ادبی کاوشوں کے اعتراف کے طور پر شاعر کو بہت بڑے انعام کا مستحق قرار دیا تھا۔ لوگوں کی نظروں میں اس کی عزت ارتقا کی بلندیوں کو چھو رہی تھی اور وہ اتنے بڑے فنکار کی ایک جھلک دیکھنے کو بیتاب تھے۔ مائیک پر بار بار اس کا نام پکارا جا رہا تھا تا کہ وہ انعام واکرام سے نوازا جائے۔

لیکن شاعر دور اندھیرے کی اوٹ میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا اُس سے محبت چھین کر عزت دی جا رہی ہے تا کہ وہ ان بیساکھیوں کے سہارے کچھ دیر اور تڑپ سکے پر اسکی نظروں میں انعام و اکرام اور قدر و منزلت کی کوئی وقعت نہ تھی، اس کے لئے تو تعریفیں اور حوصلے اپنی کشش کھو چکے تھے، اب وہ لفظ اور معنی کی پرکھ میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اب وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے محبت کا سامنا کیا تھا۔ اس لئے اسے محبت کے سوا دنیا کی ہر شئے ہیچ اور حقیر لگ رہی تھی پھر یک لخت اسے یہ احساس ہوا کہ وہ زمان و مکان سے اوپر اٹھ رہا ہے۔ وہ ہمیشہ موجود تھا، موجود ہے اور موجود رہے گا۔ کیونکہ وہ سراپا محبت ہے، یہ سوچتے ہی اسے سکون، راحت اور ٹھنڈک محسوس ہوئی اور اُس کے ذہن کے پردوں پر شاکیہ منی کے یہ الفاظ گونج گئے ''کہ اُن لوگوں کو ریاضت مبارک جنہیں شانتی میسر آ گئی ہے''۔ اس طرح شاعر نے اس جذبے سے متاثر ہو کر سامعین سے داد و تحسین حاصل کرنے کے بجائے اندھیرے کے سمندر میں چھلانگ لگا دی ار و وقت کی آنکھ سے اوجھل ہو گیا

☆☆☆

کے ڈی مینی کی تصانیف ایک نظر میں

تاریخ پونچھ (اُردو)۔ پونچھ تاریخ و ثقافت کے آئینے میں (اُردو)۔ چادر (اُردو افسانے) گپیں (اُردو طنزیہ و مزاحیہ انشائیے) اُڈیکاں (پہاڑی افسانے)۔ رمزاں (پہاڑی لوک ادب)۔ تاریخ شاہدرہ شریف (اردو)۔ تاریخ راجوری (انگریزی) چاند کے ساتھ ساتھ (اُردو شاعری)۔ پہاڑی قبائل تاریخ اور تشخص (اُردو)۔ سنکن (پہاڑی شاعری)

کچھ ان کے بارے میں:

نام: شیخ خالد محمود
قلمی نام: شیخ خالد کرآر
ولدیت: الحاج شیخ قمر الدین
پیدائش: 19 دسمبر 1976ء بمقام سمہوت، سرنکوٹ
تعلیم: بی اے (آنرز) ڈپلوما ان کمپیوٹر سافٹ ویئر۔
ادبی زندگی کا آغاز: بحیثیت افسانہ نگار 1995ء میں غالباً۔
تصانیف: آخری دن سے پہلے (افسانوی مجموعہ)۔ آنگن آنگن پت جھڑ (شعری مجموعہ)۔ سوا نیزے پہ سورج (شعری مجموعہ، زیر ترتیب)۔ پیشہ: تجارت (کمپیوٹر کے شعبے میں) ذریعہ اظہار: اُردو
پتہ: "کاشانۂ قمر" اقبال نگر، سرنکوٹ، پونچھ (جموں و کشمیر)
فون: 01966230708
موبائل: 9419389950

اب گلدانوں میں بھوک سجائیں

شیخ خالد کرآر

''حیرت ہے''، میں نے کہا۔

''حیرت ہے؟''۔ اُس نے میری بات دوہرائی اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے چُپ ہو گیا۔

''پھر............ میں نے پُر اشتیاق لہجے میں سوال کیا۔

''پھر!'' اس نے میز پر پڑے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ کو گھورتے ہوئے پُر خیال لہجے میں کہا'' پھر سیلاب نے اس عمارت کو بھی چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا''۔

وہ کچھ دیر خاموش ہو گیا اور پیکٹ سے سگریٹ نکال کر ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

میں بدستور گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتا رہا، عجیب حالت تھی اس کی، لمبے میل میں اٹے بال، ٹھوڑی پر داڑھی کی صورت بالوں کا ایک عجیب بے ہنگم سا گچھا، لمبی اور بدوضع مونچھیں جنہیں شاید مہینوں سے بنایا

نہیں گیا تھا.......... جگہ جگہ سے پھٹا وہ براؤن کوٹ جو کبھی براؤن رہا ہوگا مگر اب تو بے تحاشہ میل نے اس کا اصل رنگ ہی چھپالیا تھا............ ادھ پھٹی پتلون اور پُرانے گھسے ہوئے سینڈل !!

اوائل دسمبر کے طلوع ہوتے ہوئے سورج کی زرد شعاروں میں ہم دونوں لان کے ایک کونے میں بیٹھے دھوپ تاپنے کی ایک ناکام سی کوشش کررہے تھے۔ سگریٹ کے دوتین کش لگانے کے بعد اُس نے خود ہی بات شروع کی۔

''تمھیں حیرت ہوئی نا! کہ بھوک میرا مذہب اور افلاس میرا وطن ہے''۔

''ہاں..........!'' میں نے جواب دیا۔'' ظاہر ہے کہ میں نے انتہائی سنجیدگی سے تم سے پوچھا تھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہو؟ اور تم فلسفہ بگھارنے لگے ہو''۔

''فلسفہ.......... اُونہہ''۔ اُس نے ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''فلسفہ نہیں دیوانگی کہو............ کیونکہ غیر شائستہ زبان میں اسے دیوانگی ہی کہا جاتا ہے''۔

وہ پھر چُپ ہوگیا چند لمحے منہ سے دھواں خارج کرتا رہا پھر بولا'' جانے کیوں جو بات ہم سمجھ نہیں پاتے، جو ہماری عقل سے ماوراء ہوتی ہے اسے ہم فلسفہ قرار دیتے ہیں اور اکثر فلسفہ کہنے والے کو دیوانہ.......... فلاسفر!!''

وہ دوبارہ چُپ ہوگیا اور چند لمحوں کے بعد اُس نے خود ہی بات شروع کی تو اس کے ہونٹوں پر ایک حقارت آمیز تبسم تھا۔

''جاننا چاہتے ہو میں کہاں سے آیا ہوں؟ تو سنو............ میں فلسطین، افغانستان، بوسنیا، روانڈا، دارفور اور زائرے کی پیداوار ہوں، یہ سب میرے ہی وطن ہیں اور میرا مذہب بھوک ہے!!''

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور اُس نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بات جاری رکھی۔

''تم شاید سوچ رہے ہو کہ میں دیوانہ ہوں، میری باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں حالانکہ نقص تمہارے ذہن کا ہے، قصور میرا نہیں.......... کیوں؟''

اُس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا مگر میں خاموش رہا تو وہ بولا۔

''تم نے مجھ سے پُوچھا تھا کہ میں یہاں تک کیسے پہنچا، سو میں تمھیں بتاتا ہوں مگر..........!'' وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

''مگر کیا.......... ''

''میں نے کئی دن سے عبادت نہیں کی''۔اس نے جواب دیا

''عبادت نہیں کی؟ کیا مطلب..............؟''میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ میرا مذہب بھوک ہے.......!''۔اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی بات کو سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہو گیا۔

ناشتے کے دوران وہ مسلسل خاموش رہا اور میں نے بھی کوئی سوال نہیں کیا،اور اس کے بعد ہم دونوں دوبارہ لان میں آ بیٹھے،اُس نے سگریٹ سُلگائی اور تشکر آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں اے میرے محسن!تم نے میرے لئے تکلیف اٹھائی''

''کچھ نہیں''میں نے جواب دیا۔''انسان ہی تو انسان کے کام آتا ہے''۔

''نہیں میرے دوست!''وہ مغموم ہو کر بولا''انسان کے لئے انسان کے کام آنے کے دن اب قصے،حکایتیں بن چکے ہیں''

''بہر کیف.........''میں نے کہا''میں تمہاری سرگزشت سننے کے لئے بے چین ہوں''۔

کچھ دیر وہ فضا میں ٹکٹی باندھے کچھ سوچتا رہا پھر دھیمے لہجے میں بولا:

''وہ افغانستان کے برفاب پہاڑوں سے آنے والی ٹھنڈی ہواؤں بھری ایک شام تھی نہیں نہیں.........فلسطین کی کوئی خوف میں ڈوبی ہوئی صبح تھی یا شاید.........بوسنیا کی لہو رنگ دوپہر،مجھے اچھی طرح یاد نہیں بہر حال سیلاب نے اس عمارت کو بھی گھیرے میں لے لیا،خوف و ہراس،بارود اور اسلحے کا سیلاب.........وہ ہماری بھوک کا پہلا دن تھا،میں اور میرا دوست اس رہائشی فلیٹ میں پھنس چکے تھے جو دوطرفہ جنگجوؤں کے محاصرے میں تھا،پوری عمارت کے سارے فلیٹ خالی تھے،لوگ بہت پہلے سے بھاگ چکے تھے،صرف ہمارا اور اس سے اوپر والا فلیٹ آباد تھا جس میں ایک نو بیاہتا جوڑا رہتا تھا اور نیچے والے فلیٹ میں ہم دونوں یعنی میں اور میرا دوست یا پھر اس کی پالتو بلی''۔

''ہم دونوں بھی اپنی املاک،زمین،جائیداد و مکان کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر آئے تھے اور دیگر مہاجرین کی طرح نکلا ہی چاہتے تھے کہ اچانک محاصرہ ہوا اور گولہ بارود برسنے لگا''۔

یہاں تک کہہ کر وہ چپ ہوا،اپنے خشک ہونٹوں کو تر کیا اور دو تین لمبے لمبے سانس کھینچنے کے بعد گویا ہوا۔

''بارہ دن.........اوہ خداوندا!!بارہ دن کی وہ قیامت۔تم شاید یقین نہ جانو کہ بارہ دن ہم نے کیسے گزارے،محاصرے کے بعد تین دن کے اندر فلیٹ میں کھانے پینے کا جو کچھ تھا ختم ہو چکا تھا۔گیارہویں دن ہم

میں بولنے کی بھی سکت باقی نہ رہی۔ اس روز میرے دوست کی پالتو بلی نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا اور شاید پیٹ کی آگ سے تنگ آکر چپکے سے کہیں نکل گئی۔

گیارہویں ہی دن کی سہ پہر کو پیٹ کی آگ نے ان دیکھی گولی کا خوف ہمارے دلوں سے نکال دیا۔ ہم دونوں بالکونی میں کھڑے وحشت زدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے، ہماری حالت ناقابلِ بیان حد تک خستہ تھی۔

ہم بالکونی میں کھڑے جنگجوؤں کی نقل وحرکت دیکھ رہے تھے کہ اچانک اس وقت کپڑے کی ایک گٹھری ''دھپ'' سے ہمارے قدموں میں آگری.......... گٹھری اوپر والے فلیٹ سے آئی تھی، ایک ساعت، ہم پُر امید ہو کر گٹھری کی طرف دیکھتے پھر میرے دوست نے آگے بڑھ کر اسے کھول ڈالا۔ جانتے ہو اس گٹھری میں کیا تھا.......؟ نہیں نہیں........... بھلا تم کیسے جانتے ہو، میں بتاتا ہوں سنو!!

''اس گٹھری میں بظاہر میرے دوست کی پالتو بلی کا سر، ٹانگیں اور کھال لپٹی ہوئی تھی مگر...... حقیقتاً وہ ساری دنیا کے انسانی حقوق کا پلندہ تھا جسے میں نے اور میرے دوست نے فوری طور پر اپنی بھوک کے گلدانوں میں سجا لیا۔ اس وقت میرے دوست نے جو کہا وہ مجھے آج تک یاد ہے، اس نے کہا:

''اے دنیا کے امن پسندو!
تم کہ امن کی خاطر جنگ کرتے ہو
اور میں کہ بھوکا ہوں
سنو!!
کوئی Anti Hunger ہتھیار بناؤ
اور مجھ پر داغ ڈالو
میں منظور کرتا ہوں ایک قرارداد
اپنی بھوک کے خلاف
اور انسانی حقوق کی گولی کھا کر سو جاتا ہوں
امن زندہ باد!!
انسانی حقوق پائندہ باد!!''

یہاں تک کہنے کے بعد وہ اجنبی خاموش ہو گیا اور اچانک کرسی سے اٹھا، میز سے اپنی پرانی بدوضع ہیٹ اٹھائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا.......... ☆☆☆

شاردا

سرلا دیوی

شاردا اور شریف ایک دوسرے کو بہت پہلے سے جانتے تھے۔ یہ دونوں پارٹی ممبر تھے۔ بنگال کے قحط کے دنوں میں جب شاردا کلکتہ میں تھی تو شریف وہاں گیا تھا۔ انھوں نے کئی ڈرامے کھیلے تھے۔ٹولیاں بنا کر جگہ جگہ گھومے تھے، ساتھ ساتھ رہ کر کام بھی کیا تھا مگر کوئی خاص بات نہ ہوئی تھی۔ پھر فسادات ہوئے اور شاردا کلکتہ سے دلی آ گئی، اور وہاں کیمپوں میں کام کرتی رہی۔ شریف سے اس کی ملاقات ہوتی تھی، تقریباً ہر پارٹی کے جلسہ میں۔ لیکن پھر بھی کوئی قابلِ ذکر بات نہ ہوئی، ان کی اصلی ملاقات تو ان دنوں ہوئی جب مقامی پارٹی پر Ban لگا ہوا تھا اور کچھ ممبر گرفتار کر لئے گئے تھے اور باقی کے روپوش ہو گئے تھے ایک دن پارٹی کا ایک خفیہ جلسہ ہونے والا تھا ،شاردا کو بھی ایک خاص وقت پر ایک خاص جگہ پہنچنے کی اطلاع ملی۔ اس دن اور عین اسی وقت وہ بتائی ہوئی جگہ پر پہنچی۔ مگر وہ چوراہے پر ہی تھی کہ ایک شخص جو کھدر کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا ، نے اسے ٹھوکا مارا اور پھر بڑے جانے

کچھ ان کے بارے میں:

نام :سرلا دیوی

بنت :ڈاکٹر گوری شنکر

زوجہ: ریوتی سرن شرما

ہمشیرہ کرشن چندر

"سرلا دیوی کے متعلق مکمل کوائف باوجود کوشش دستیاب نہیں ہو سکے۔

(شبنم)

پہچانے آدمی کی طرح ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر بولا'' آپ اچھی تو ہیں'' شاردا بھونچکی رہ گئیں ، اسے غصہ بھی آیا۔اس نے تیکھی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔لیکن اتنی دیر میں سڑک پر جاتے ہوئے اُن کے پاس والے آدمی دُور نکل گئے تھے اور اس ٹوپی والے انجان آدمی کے چہرے کی بناوٹی مسکراہٹ دور ہوگئی تھی ، بہت خفیہ اور سنجیدہ لہجے میں وہ بولا'' شاردا واپس لوٹ جاؤ، پولیس کو ہماری میٹنگ کا پتہ چل گیا ہے۔مکان کے گرد خفیہ پولیس لگی ہوئی ہے۔اس لئے آج جلسہ نہ ہوگا''۔شاردا نے شریف کو پہچان لیا۔کچھ آدمی قریب آگئے تھے۔اس نے شرماتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے کہا'' آپ دلی سے ابھی ابھی آئے ہیں؟ آیئے گھر چلئے نا''...... اور وہ شریف کو لے کر پاس والی گلی میں مڑ گئی...... اس گلی میں کوئی نہ تھا۔ میں تو بہت مشکل میں پھنس گئی ہوں''...... ''کیوں کیا ہوا؟'' شریف نے سہم کر پوچھا:'' میں اب تک جہاں چھپی ہوں اب وہاں نہیں رہ سکتی۔آس پاس کے لوگوں میں چرچا چل گیا ہے کہ فلاں مکان میں ایک انجان بنگالی لڑکی آتی ہے۔کسی دن بھی پولیس کو میرا پتہ چل سکتا ہے۔ میں یہ معاملہ پارٹی کے سامنے رکھنا چاہتی تھی''۔

''تو کیا تم کسی اور جگہ نہیں جاسکتیں''؟

نہیں میں دلی میں اور کسی کو نہیں جانتی اور پھر پناہ دے کر اپنی جان کون جوکھم میں ڈالے گا''۔شریف کی پیشانی پر سلوٹیں اور گہری ہوگئیں۔'' شاردا فی الحال میں تمہیں اپنے پاس رکھ سکتا ہوں، اگر تم منظور کرو۔ میں اپنے ایک دوست کے یہاں رہ رہا ہوں اُس کے یہاں ایک بوڑھی ماما کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔تم وہاں رہ سکتی ہو۔اگلی دفعہ جب میٹنگ ہو تو اپنے لئے کوئی دوسرا انتظام کرا سکتی ہو''۔

پچھلے دنوں سے شاردا بہت گھبرا گئی تھی۔وہ اپنی موجودہ جگہ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے جانا چاہتی تھی۔اس نے شریف کے ساتھ رہنا منظور کر لیا۔

جب شام کو وہ شریف کے دوست کے گھر کی طرف روانہ ہوئی تو اُسے بہت سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے سر آئی ہوئی بلا ٹل گئی ہے، اور وہ ہر خطرے سے محفوظ ہوگئی ہے۔لیکن جوں جوں وہ اپنے ٹھکانے کے قریب پہنچنے لگی ، اس کا جی بیٹھنے لگا اس کی خوشی بجھنے سی لگی ۔تو ایک مسلمان کے گھر رہنے جا رہی ہے؟'' اس کے سنسکار جاگنے لگے۔بچپن سے اس کے دل میں مسلمانوں کے لئے جو گھن سی پیدا کر دی گئی تھی اور جس پر اس نے نئے اور انقلابی خیالات کی مدد سے قابو پالیا تھا، پھر سے ابھرنے لگے۔اس کے دل میں یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ مسلمان بہت گندے رہتے ہیں، ان کے گھر میں صفائی کا قطعی خیال نہیں رکھا جاتا۔وہ ایک ہی لوٹے سے سب کام لیتے ہیں اور ایک ہی برتن سے پانی پی کر اُسے گھڑے میں ڈال دیتے ہیں۔اُس کے خیالات کی سطح تڑخنے لگی اور جذباتی تعصبات

رنگ لانے لگے۔مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔دوسرا ٹھکانہ نظر آتا تھا۔دل پر جبر کر کے وہ وہاں پہنچ گئی۔

مکان مسلمانی ڈھنگ کا بنا ہوا تھا۔ایک بڑا سا آنگن اور بڑے بڑے دالان۔مکان کی پُتائی اور مرمت برسوں سے نہیں ہوئی تھی۔جگہ جگہ سے پلستر اکھڑ گیا تھا۔دیواریں کائی سے سیاہ ہوگئی تھیں۔فرش کی اینٹیں گھس چکی تھیں۔صحن میں مرغیاں کڑکڑا رہی تھیں۔ایک طرف گھرونچی پر کائی آلود گھڑے رکھے ہوئے تھے۔پاس ہی پتیل کے ٹوٹنی دار لوٹے تھے،جن پر شاید برسوں سے ہاتھ نہ پھیرا گیا تھا۔ادھر اُدھر ٹوٹے ہوئے روغنی پیالے لڑھک رہے تھے۔کونے میں سوکھی ہوئی ہڈیوں اور لہسن کے چھلکوں کا ڈھیر لگا تھا۔ایک سوکھی مریل سی غلیظ ماما لیترے گھسیٹتی ہوئی اس کے استقبال کو آئی۔اس کے منہ سے باس اُٹھ رہی تھی۔شاردا کا جی گھن سے بھر گیا وہ اپنے کو کوسنے لگی۔آخر وہ یہاں کیوں چلی آئی۔

اس کا سامان ایک بہت بڑے پلنگ پر رکھوا دیا گیا۔پلنگ پر گرد اور مرغیوں کی بیٹ کے تھپلے جمے ہوئے تھے۔شریف اندر آیا اور بولا''سارا گھر خالی ہے۔تم بڑے اطمینان اور آزادی سے رہ سکتی ہو۔میں نے ماما سے کہہ دیا ہے،یہاں تمہیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی.....میں ذرا باہر جاتا ہوں ماما تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہے''۔اور وہ بغیر رکے باہر چلا گیا۔شاردا کا دل گھن اور غم و غصے سے جلنے لگا وہ کہاں آ پھنسی؟کس غلاظت میں اسے رہنا پڑے گا۔اس نے چپل نکال کر زمین پر قدم رکھا ہی تھا کہ اس کا پاؤں مرغی کی تازہ گرم گرم بیٹ پر پڑ گیا تھا۔کراہت کی ایک پھریری اس کے جسم میں دوڑ گئی۔اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اسے ایک ساتھ اپنے گھر کی اور ماں کی یاد آ گئی.......کتنا صاف ستھرا تھا ہمارا گھر۔اماں کتنا خیال رکھتی تھی صفائی اور پوتر تا کا''۔

پلو کو منھ میں دے کر وہ پلنگ پر بستر کھول کے پڑ گئی۔

اس گھر میں شروع کے تین دن شاردا نے کیسے کاٹے یہ وہی جانتی تھی۔اس کا بستر سے اُٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔فرش پر قدم رکھتے ہی بیٹوں کی وجہ سے اتنی گجگجاہٹ محسوس ہوتی کہ مر جانے کو جی چاہتا۔اُدھر بالٹی اتنی غلیظ تھی کہ اس میں سے پانی لے کر نہانے کو جی نہ کرتا۔اس گھر کی کسی چیز کو ہاتھ لگاتے ہوئے اُسے گھن آتی۔ماما کے پاس سے گزرتے ہوئے اُسے ابکائی آنے لگتی۔اس کے منہ،کپڑوں سے،بالوں سے بُو کے بھبکے نکلتے تھے۔

تین دن تک شریف نہ آیا.........اسے کوئی ضروری کام سونپا گیا تھا۔چوتھے دن وہ لوٹا۔اس نے ماما سے شاردا کے بارے میں پوچھا۔عین اسی وقت شاردا آ گئی۔کچھ ضروری کاغذ لینے۔

''شاردا کیا بات ہے''شریف نے شکایت آمیز لہجے میں کہا''ماما کہتی ہے تم یہاں ٹھہرتی نہیں ہو۔چائے نہیں پیتیں،حتیٰ کہ ہاتھ منھ بھی نہیں دھوتیں۔میں نے تمہارے کھانے وغیرہ کا انتظام بھی یہیں کرایا تھا''

شاردا کو آج صبح نہانا نصیب نہ ہوا تھا۔ بغیر نہائے اس کا جی بڑا میلا میلا سا ہو رہا تھا۔ روٹی بھی ابھی تک اس نہیں کھائی تھی۔ شریف کی بات سن کر اس کا چڑ چڑا من جل اٹھا۔ مگر وہ خاموش رہی اور اندر چلی گئی۔ شریف کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر اس نے ماما کو آواز دی ''ماما چائے اور توش بنا کر لے آؤ۔ میں کراؤں گا آج انہیں ناشتہ''۔ یہ سنتے ہی شاردا کا ضبط ٹوٹ گیا۔

''اب یہ مجھے اس گھر کے گندے برتنوں میں چائے اور اس غلیظ ماما کے ہاتھ کے توش کھلائے گا؟ وہ پھوٹ پڑی۔ نہیں نہیں میں کچھ نہیں پیوں گی۔ میں اس گھر کی کسی چیز کو چھونا نہیں چاہتی۔ میرے لئے یہ گھر نرک سے زیادہ گندا ہے۔ میں یہاں ایک منٹ نہیں رہنا چاہتی'' اور یہ کہتے کہتے شاردا بچوں کی طرح رو پڑی اور بستر میں منہ دے کر پڑ گئی۔ شریف نے اس کی آنکھوں میں نفرت اور کراہت کی جھلک صاف دیکھ لی تھی۔

اس رات شریف جب باہر سے لوٹا تو اپنے ساتھ بہت سے نئے برتن لایا۔ بالٹی ، پتیلی ، تھالی ، لوٹا ، طشتری ، گلاس اور کٹوریاں۔ وہ ایک چوکی بھی لایا۔ اس نے یہ سب سامان لا کر شاردا کے پاس رکھ دیا۔ شاردا بستر میں منہ دیئے پڑی تھی۔ آواز سُن کر اٹھی..... ''یہ کیا؟''۔ یہ تمہارے لئے برتن ہیں شاردا..... تم یہیں رہو گی۔ اور تمہاری ہر چیز علیحدہ ہوگی۔ کوئی تمہاری چیزوں کو ہاتھ نہیں لگائے گا''

لیکن..... لیکن مجھے تو الگ چیزوں کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو ایسا نہیں کہا''

''لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ تم ہر بات اپنے منہ سے کہو..... میں جانتا ہوں تم زیادہ صفائی سے رہنے کی عادی ہو۔ تمہارے گھر میں شُدھتا کو بہت مانا جاتا ہے۔ آج تیسرے پہر کے واقعہ کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اس گھر میں واقعی بہت گندگی ہے، یہاں برتن ہر روز صاف نہیں کئے جاتے۔ یہ ماما مہینوں نہیں نہاتی۔ مرغیاں گھر بھر میں بیٹ کرتی پھرتی ہیں۔ جن باتوں کو ہم لوگ برداشت کر جاتے ہیں۔ تم انہیں برداشت کرنے کی عادی نہیں ہو''۔

''لیکن میرا یہ ہرگز مقصد نہیں تھا۔ میں آپ لوگوں کے رہن سہن کو گندا نہیں سمجھتی''

''لیکن میں نے بھی تو نہیں کہا، شاردا یہ ہماری بدقسمتی اور جہالت ہے کہ ہم صفائی کے معاملہ میں بھی مذہبی روایات کے غلام ہیں۔ ہم بہت سی گندی چیزوں کو بھی اپنی تہذیب کا حصہ سمجھ کر چھاتی سے لگائے ہیں لیکن ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ جو چیز صاف نہیں، حسین نہیں، سلیقہ کی نہیں وہ میری تہذیب کا حصہ نہیں۔ میں اس کی طرف اشارہ کئے جانے کا بُرا نہیں مانتا تھا۔ شاردا، یہ کاہی آلود۔ مٹکے یہ بغیر منجھے ہوئے لوٹے۔ یہ غلاظت پھیلاتی مرغیاں یہ کالی دیواریں، یہ سب ایک مرتے ہوئے بوسیدہ نظام کی علامتیں ہیں۔ مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں تو خود ایک نئے طرزِ زندگی کا منتظر ہوں۔ تم نے مجھے شاید غلط سمجھا''۔

شاردا کی جیسے چوری پکڑی گئی۔ شریف نے اس کے دل کا تعصب بھانپ لیا تھا۔ اسکی گردن شرم سے جھک گئی۔ اس کے سانولے چہرے پر خون کی سُرخی سے ایک عنابی جھلک پیدا ہو گئی....... ندامت سے بھرے ہوئے لہجہ میں وہ بولی ''مجھے معاف کرو۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا۔ میرے اندر پُرانا تعصب جاگ اُٹھا تھا۔ میں بے حد شرمندہ ہوں''۔

شاردا کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ آنسوؤں سے چھلکتی ہوئی آنکھوں کو اٹھا کر اُس نے شریف کی طرف دیکھا۔

''شاردا ہم کو اپنی شخصیت سے ان پُرانے تعصبات کو نکال پھینکنا ہوگا۔ اس لئے جب تم ہمارے طرز زندگی کی گندگی کو ظاہر کرتی ہو یا میں تم لوگوں کے چھوت کے ڈھنگ کے خلاف آواز اٹھاتا ہوں تو ہم ایک دوسرے کی مخالف نہیں کرتے۔ ہم ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اپنی تربیت کرتے ہیں۔ اوہ، میں بھی کیا فلسفہ لے بیٹھا ہوں تم اٹھو، میں انگیٹھی لاتا ہوں۔ اپنے ہاتھ سے چائے پلا کر ذرا مجھے تو شدھ کرو۔ بنگالی موشائے کی طرح''۔

دونوں ہنس پڑے۔

اس کے بعد ایک ہی ہفتہ میں گھر کی صورت بدل گئی۔ شریف نے اپنے دوست سے کہہ کر مرغیاں کسی اور آدمی کے یہاں بھجوا دیں۔ فرش کو کھرچ کھرچ کر اور دھو دھو کر صاف کرایا۔ ایک طرف ایک چوکی بچھا کر برتن اس پر سجا دیئے۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر پلنگ جھاڑے۔ چھت کے جالے صاف کئے۔ کونوں میں پان کی پیک کے داغوں کو دھویا۔ شاردا نے ایک طرف خوب صفائی کر کے اپنی انگیٹھی رکھی اور شریف نے دری بچھا کر اور گدے ڈال کر بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی۔

اب شاردا اپنے ہاتھوں سے کھانا بناتی اور دونوں ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ اس کے لئے شاردا نے شریف پر کچھ پابندیاں لگائی تھیں۔ اور شریف نے انہیں بخوشی منظور کر لیا تھا اس کو باہر سے آنے پر اپنے ہاتھ دھونے پڑتے۔ جُوٹھے گلاس کو وہ گھڑے میں ڈبو کر پانی نہ پی سکتا۔ جوتے اتارے بغیر اُس جگہ نہ جا سکتا جہاں کہ شاردا کھانا بناتی تھی۔

شاردا کی یہ تمام باتیں ماننے کے لئے شریف نے کچھ شرطیں لگا رکھی تھی۔

''دیکھو مجھے مسلمان سمجھ کر تم اپنے آپ سے، اپنے کھانے سے اور اپنے کھانے کی چیزوں سے الگ نہیں رکھو گی۔ مجھے شدھ بنانے کے لئے گائے کا گوبر نہیں کھلاؤ گی۔ اور ہر روز باہر سے آنے پر گنگا جل نہیں چھڑکو گی''۔

یہ شرطیں سُن کر شاردا بہت ہنسی تھی اور اس ہنسی نے شاردا کے دل کی کدورت کو بالکل دھو دیا تھا۔

پارٹی سے Ban ہٹ گیا۔ گرفتار کیے ہوئے ممبر رہا ہو گئے۔ روپوش ممبر ظاہر ہو گئے۔ پارٹی کے ہوسٹل میں لوگ آنے لگے۔ شریف بھی اپنے دوست کے گھر سے اپنے گھر آ گیا اور شاردا بھی ہوسٹل چلی آئی۔ دونوں جدا ہو گئے مگر اس تھوڑے عرصے میں وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے، انھوں نے اپنے درمیان حائل کتنی ہی اونچی دیواروں کو گرا دیا تھا۔ وہ فراخدلی سے ایک ساتھ بنا کھانا پینا سیکھ گئے تھے...... ایک بنگالی ہندولڑکی نے ایک مسلمان کے پاس رہ کر تجربہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اُن میں کوئی اشدھتا نہ تھی۔ گھِن کرنے یا نفرت کرنے کی کوئی چیز نہ تھی۔ صرف ان چند عادتوں کا قصہ تھا۔ جو آپس کا میل ملاپ نہ ہونے کی وجہ سے فطرت میں اتنا گھر کر گئی تھیں کہ ایک معقول آدمی کو بھی گھل مل جانے سے روکتی تھیں۔

لیکن یہ نہ تھا شاردا اس نتیجے پر بالکل آسانی سے پہنچ گئی تھی۔ اس نے شریف کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ شعوری طور پر اور غیر شعوری طور پر اسنے اپنے دل کا چور شریف پر ظاہر کیا اور اس کے دل میں چھپی باتوں کو بھانپنے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر اس نے شریف کو بہت بلند پایا اسے معلوم ہوا شریف مسلمان نہ تھا۔ وہ شاردا کو بھی ہندو سمجھنے پر تیار نہ تھا اس کا ایک نیا مذہب تھا۔ اس کے دماغ میں تہذیب، رہن سہن، اور دوسری باتوں کا ایک نیا تصور تھا، ایک ایسا تصور جو پیدائش یا مذہب کی بنا پر آدمی ادمی میں فرق کرنے یا اس سے نفرت کرنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ وہ ہر اس چیز کو جو آدمی آدمی میں فرق پیدا کرتی تھی، جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ صفائی اور خوبصورتی اور صحت کا متلاشی تھا اور یہ چیزیں جہاں سے ملتیں، لینے کو تیار تھا۔ جہالت گندگی اور مردہ روایات کو وہ اپنی تہذیب کا حصہ ماننے کے حق میں نہ تھا۔

شاردا نے شریف کو کئی نازک موقعوں پر پرکھا۔ اس نے فسادات کے دوران میں مسلمانوں کی دردناک حالت کا ذکر کیا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح فساد کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ وہ اس ملک میں دوسروں کے رحم پر رہ رہے ہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر دل روتا ہے لیکن اسے معلوم ہوا کہ شریف ان چیزوں کو قطعی دوسرے زاویہ نظر سے دیکھتا ہے۔

''شاردا فساد کے دنوں میں مسلمانوں کے قتل سے میرا خون بھی کھلا تھا۔ نفرت کا سیاہ خون میری نسوں میں بھی دوڑا تھا مگر پھر میں نے سوچا...... یہ مسلمان کا قتل نہیں ہے۔

پاکستان میں ہندو سکھ کا قتل نہیں ہے۔ یہ تو دو مرتی ہوئی تہذیبیں ہیں، جو ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہی ہیں۔ اس واقعہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ سارا نظام غلط ہے، زہریلا ہے انسان انسان میں نئے سرے سے ایک رشتہ

قایم ہونا چاہیے۔میں اس نئے رشتے پر ایمان رکھتا ہوں، پھر میں اس فساد میں حصہ لے کر مُردوں کے منہ میں پانی کیوں ڈالوں؟ میرے آنسو اور میرا خون تو اس نئے نظام اور نئے رشتے کو قائم کرنے کے لئے محفوظ رہنا چاہیے''

شریف کی ان باتوں کے پیچھے جتنا خلوص چھپا تھا، اس نے شاردا کو بے حد متاثر کیا، اُسے اپنے دماغ میں روشنی سی پھیلتی محسوس ہوئی۔شریف نے واقعی بہت حد تک اپنے مذہبی تعصبات کو ختم کر دیا تھا۔وہ ایک سچا ترقی چاہنے والا انسان تھا۔

شریف کے ساتھ رہ کر شاردا ایک بار گھریلو زندگی کی عادی بن گئی تھی۔دونوں نے وہ دن کتنے ہنسی اور شانتی سے کاٹے تھے۔اُسے گھر سے واقعی محبت ہوگئی تھی۔اس لئے جس دن وہ اُس گھر سے چلے، اس دن شاردا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔اس نے آنسوؤں کو چھپالیا تھا۔مگر وہ آنسو اس کے کلیجے کو جلا رہے تھے۔اس گھر کی چھوٹی سی چھوٹی چیز اس کے لئے عزیز ہوگئی تھی۔مگر اسے سب کچھ چھوڑنا پڑا۔وہ ہوسٹل چلی آئی۔مگر اس کے ساتھ ہی جیسے اس کی زندگی خالی خالی سی ہوگئی۔اب اسے اکیلا پن ستانے لگا۔وہ مزدور سبھاؤں میں جاتی، کیمپوں میں کام کرتی، مگر اس کا من اب کچھ اور چاہتا۔راتیں بڑی لمبی لمبی ہوگئیں۔ہر وقت جی چاہتا کہ وہ شریف کے ساتھ باہر جائے۔کام کرے اس کی باتیں سُنے۔شریف کی عظمت اور اس کی چاہ شاردا پر چھا گئی۔

''تو کیا تیرا شریف سے شادی کرنے کا ارادہ ہے؟'' بملا نے چونک کر شاردا سے پوچھا۔

''ہاں بملا، میں اب شریف کے بغیر نہیں رہ سکتی۔میں گھر کی ہو کر رہ جانا نہیں چاہتی۔میں پارٹی میں کام کرنا چاہتی ہوں۔لیکن شریف کے بنا اب میں کچھ نہیں کر سکتی۔اس کا سہارا پا کر ہی اب میں اونچا اٹھ سکتی ہوں۔آگے بڑھ سکتی ہوں''۔

لیکن شریف مسلمان ہے شاردا۔ہم ویسے کہہ سکتے ہیں کہ ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہیں، لیکن عملی طور پر ایک ہندو لڑکی مسلمان کے ساتھ مشکل سے رہ سکتی، یہ مانتی ہوں کہ تم ہندو دھرم میں یقین نہیں رکھتیں۔مندر میں نہیں جاتیں، پوجا نہیں کرتیں، مگر تمہارے سنسکار تو ہندو کے ہیں۔روزمرہ کی زندگی میں کتنے مواقع آتے ہیں۔جب ایک ہندو، ہندوؤں کے طریقے سے برتاؤ کرتا ہے اور مسلمان، مسلمان کے طریقے سے۔دونوں کے درمیان ایک بڑی خلیج حائل ہے''۔

''میرے ذہن نے اس خلیج کو پاٹ دیا ہے بملا، اب ڈر کی کوئی بات نہیں ہے''۔

''مگر تمہارا دل؟ تمہارا دل تو مسلمان کے ساتھ رہ کر خوش نہ رہ سکے گا۔دیوالی کی رات یہ دیئے جلانے کو تڑپے گا۔ہولی کے دن رنگ کھیلنے کو مچلے گا۔عید کے دن تمہاری آنکھوں میں وہ چمک پیدا نہ ہو سکے گی اور محرم کے

دنوں میں تم کبھی وہ اُداسی محسوس نہ کرسکو گی جو تمہارا شوہر محسوس کرے گا۔ ذرا سوچو کیا تم اپنے بچے کا نام اپنی مرضی سے رکھ سکو گی؟ کیا تمہارا شوہر اس بات کی اجازت دے گا کہ تم ہندوؤں کی طرح اسے پال پوس کر بڑا کرو؟ رات کے وقت جب وہ کہانیاں سننے کے لئے کہے تو اسے مسلمانی کہانیاں سناؤ گی یا ہندوانی؟''

اس کا جواب اس رات شریف نے دیا تھا۔ بملا کی باتوں سے شاردا پر اوس سی پڑ گئی تھی اس کا دل بیٹھ گیا تھا۔ آگے کی زندگی کی بھیانک تصویر نے اُسے بیحد اداس کر دیا تھا۔ شریف کے سامنے اس نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

شریف مجھے تم پر بھروسہ ہے، مگر اپنے آپ پر بھروسہ نہیں ہے، میں ایک کٹر بنگالی برہمن کے گھر میں پیدا ہوئی ہوں، مجھے اپنے رہنے سہنے کے ڈھنگ سے اپنے رسم ورواج سے، اپنے یہاں کے، گیتوں سے محبت ہے۔ میں اپنی بچی کا نام کویتا رکھنا چاہوں گی میرے ہندو سنسکار میرے ساتھ رہیں گے۔ میں ان سے ناطہ توڑ کر خوش نہیں رہ سکتی''

''تو یہ تم سے کس نے کہا شاردا کہ تم اپنا رہن سہن بدل دوگی۔ اپنے رسم ورواج چھوڑ دوگی، اپنے گیت نہ گاؤ گی۔ اپنے بچوں کے نام اپنی مرضی سے نہ رکھ سکو گی''۔

''تم نے نہیں کہا۔ تم کہو گے بھی نہیں۔ مگر میں تو کہہ رہی ہوں۔ میں تو تعصب سے بھری ہوں، یہ میرے خون میں ہے''۔

''ہم سب تعصب سے بھرے ہوئے ہیں شاردا! یہ مذہبی تعصب اور نفرت ہمارے خون میں گھل گئی ہے۔ ہم اپنے دماغ کو قابو میں رکھ سکتے ہیں، مگر دل سے مجبور ہیں۔ لیکن شاردا اگر تم اپنے آپ کو انقلابی کہتی ہو، تمہاری نگاہ کے آگے زندگی کی کوئی نئی تصویر گھومتی ہے، تو تمہیں اپنے اس قسم کے تعصبات کو کچلنا ہوگا۔ تمہیں اپنے دل پر جبر کر کے دماغ کا ساتھ دینا ہوگا۔ میں تمہارے ساتھ رہا۔ تم نے مجھے بہت سی اچھی عادتیں سکھائیں مجھے اپنی پرانی عادتیں چھوڑتے ہوئے الجھن سی محسوس ہوئی۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ تم مجھے ہندو، بنا رہی ہو۔ لیکن پھر میں نے سوچا، میں تو صفائی خوب صورتی اور صحت کو قبول کر رہا ہوں۔ تم کو بھی اسی طرح جدوجہد کرنا ہوگی۔ خون کے جراثیم، پالنے سے نہیں مرتے، انہیں مارنے کے لئے ان سے لڑنا پڑتا ہے''۔

تو تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ساتھ رہ کر مجھے کبھی محسوس نہ ہوگا میری اور تمہاری خوشیاں مختلف ہیں، میرے تمہارے سنسکار میل نہیں کھاتے؟ میرا دل کبھی بھی اداس اور دکھی نہیں ہوگا؟''

''شاردا تمہارا دل اُسی وقت اداس ہوگا جب تمہارا دماغ بیمار ہوگا...... دل اور دماغ دو چیزیں نہیں

ہیں۔ جب تم پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھو گی۔ جب تم کو تمہارے تعصبات کا بھوت ستائے گا، تبھی تم مجھے اپنے سے علیحدہ ملیچھ اور مسلمان سمجھو گی لیکن جب تک ہم آگے ایک نئے افق کی طرف تکتے رہیں گے تب تک ہمیں کبھی محسوس نہ ہوگا کہ ہم ہندو اور مسلمان ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تمہیں ایک ہی چیز چُننا ہوگی ہمیشہ کے لئے۔ کبھی نہ پچھتانے کے ارادے سے..... اور وہ یہ کہ پیدائش اور مذہب کی بنا پر آدمی سے نفرت نہیں کرو گی۔ بولو''۔

جواب میں شاردا نے جھکی ہوئی نظروں سے شریف کی طرف دیکھا اور اس کی گود میں منہ چھپاتے ہوئے بولی'' کیا بولوں؟ میرے پاس بولنے کو اب رہ کیا گیا ہے''۔

☆☆☆

میں کیا ہوں؟

محمد ایوب شبنم

زیر نظر افسانہ میں نے کرشن چندر کے اعزاز میں 28 مئی 1973ء کو منعقدہ تقریب میں پڑھا اور اسی افسانے کے حوالے سے کرشن چندر نے اپنے سفر نامہ "ورق ورق کھوئی زندگی میری" میں ذکر کیا ہے کہ "سرنکوٹ میں میری ملاقات افسانہ نگار شبنم سرنکوٹی سے ہوئی"، کرشن چندر سے یہ ملاقات اور ان کے یہ ریمارکس اپنے لئے اعزاز سمجھتا ہوں۔

محمد ایوب شبنم

قول فیصل ہے کہ جب کوئی قوم سرکش ہو کر ظلم و جبر کی طرف راغب ہو جائے۔ اور انصاف کا دامن چھوڑ دے تو اس پر خدائے لم یزل ظالم اور جابر حکمران مسلط کر دیتا ہے۔ جو اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک کے وہ سرکش قوم پلٹ کر اپنے اصل کی طرف نہ لوٹ آئے۔ مغل حکمران قوم بھی جب سہل پسند اور عیاش ہو گئی تو خدائی عتاب کا شکار بن گئی۔ تاریخ گواہ ہے کہ شہنشاہِ ہندوستان خدمت گاروں سے اس وقت بھی جوتیاں مانگ رہا تھا کہ محل سے بھاگ کر جان بچا سکے کیونکہ انگریز فوجیں محل میں

کچھ ان کے بارے میں:

نام: محمد ایوب شبنم

قلمی نام: شبنم

ولد: خواجہ قمر الدین لون

پیدائش: 5 جون 1948ء بمقام پوٹھہ، سرنکوٹ

تعلیم: بی اے

ادبی زندگی کا آغاز: دوران کالج۔

تصانیف: شاہین (افسانوی مجموعہ)

پیشہ: صحافت

ذریعۂ اظہار: اُردو، پہاڑی

پتہ: مدیر اعلی ہفت روزہ "ستاروں سے آگے"، سرنکوٹ، پونچھ 185121 (جموں و کشمیر)

فون: 01965-230044

موبائل: 9419675572

بزور شمشیر داخل ہو چکی تھیں۔

ظاہر ہے غفلت شعاری کی سزا ملنی ہی تھی، بدیں وجہ ہندوستانی قوم کو صدیوں انگریز کا غلام بننا پڑا یہاں تک کہ ہندوستان جو سونے کی چڑیا کہلاتا تھا، اس کے بال و پر نوچ لئے گئے بلکہ روح تک کو زخمی کر دیا گیا۔

اور پھر جب غیرت جاگ گئی، منتشر، پاش پاش قوم خواب سے بیدار ہوئی اور اتحاد کا دامن تھام لیا تو انگریز کو دُم دبا کر بھاگنا پڑا........ لیکن جاتے جاتے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہندوستان کو دو قومی نظریے کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے دو حصوں میں تقسیم کر لیا۔ پاکستان اور ہندوستان۔ ایسا بیج بویا گیا جس کا پھل برصغیر تب تک کاٹتا رہے گا جب تک ہندوستان اور پاکستان دونوں اپنے اصل کی طرف لوٹ کر نہ آجائیں۔

دونوں ممالک کے درمیان خونی لکیر کیا کھینچی کہ خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ صدیوں کا بھائی چارہ پیار اور محبت آن واحد میں ختم ہو گیا۔ دُنیا کی سب سے بڑی تاریخی ہجرت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسا زخم لگا کہ نہ ختم ہونے والا درد بڑھتا ہی چلا گیا اور جانے کب تک..........!!

ہجرت شروع ہوئی تو فسادات نے بھی جنم لیا۔ اس بے پناہ کربناک شور وغل میں زاہدہ چلا چلا کر کہہ رہی تھی ہندو آیا، کافر آیا اور سیتا کہہ رہی تھی مسلمان آیا مسلا آیا۔ اللہ ہو اکبر، اور ہر ہر مہادیو کے نعروں نے منفی اثرات مرتب کرنے شروع کر دیئے۔

آج شیطان اپنی پوری مستی میں انسانوں سے وہ کھیل کھلوا رہا تھا کہ خود انسانیت لرزہ براندام ہو گئی۔ اور شیطان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

انور نے سیتا کو نوچا، کرشن نے زاہدہ کو۔ بھائیوں نے بہنوں کو نوچا اور بیٹوں نے ماؤں کو اور ایسے میں دور پرے کھڑا کوئی مست الست زور زور سے چلا کر کہہ رہا تھا۔ ''ہندوستان آزاد ہو گیا........ ہندوستان آزاد ہو گیا........!!''

دلیپ ایک نیم تاریک ویران سے کمرے میں منہ کو ہاتھوں میں چھپائے رو رہا تھا اور اسکے رونے اور ہچکیوں سے کمرے کا ماحول مزید ویرانی پیدا کر رہا تھا۔

امیدوں کا دم توڑ جانا بھی موت ہوا کرتی ہے۔ وہ بھی مر جانا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کون اسے رہ رہ کر یقین دلا رہا تھا کہ اُس کی اُرملا ضرور آئے گی، اس کی سنہری یادیں کلیجہ کاٹ رہی تھیں، کل ہی کی تو بات ہے۔ وہ ایک آزاد پنچھی کی طرح تھا، اُسے کوئی دکھ تھا نہ غم۔ وہ تھا اُرملا سے ملاقاتیں تھیں۔ اُرملا اس کی زندگی، اُس کی روح، بے پناہ حسن کی دیوی، پیار کا بحر بیکراں، کسی جھیل میں کھلا اُجلا کنول........ کسی پرستان کی شہزادی اور حوروں کی

ملکہ........!!

پیار کی نئی کہانی نے جنم لیا بھی تو کہاں، لاہور ڈگری کالج کی ایک بیٹ منٹن فیلڈ میں۔ دلیپ ریاستی سطح کا ایک بہترین چمپیئن تھا، اچھے اچھے کھلاڑی اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے تھے، لیکن آج اُس کو ایک دوشیزہ نے چیلنج دے دیا تھا، وہ خود حیران تھا کہ ایک دوشیزہ اسے کیسے چیلنج کر سکتی ہے۔

لیکن جب اُن کا آمنا سامنا ہو گیا تو دوشیزہ کے حسن نے اُسے سحر زدہ کر دیا۔ وہ سُن ہو کر رہ گیا۔ نہ جانے کون سا جادو تھا جو اُسے دوشیزہ سے ہار جانے کو کہہ رہا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا۔

آخر وہ ہار ہی گیا۔ دوشیزہ خود حیران تھی کہ وہ کیسے ہار گیا اور وہ بھی اتنی آسانی سے۔ پھر وہ کسے نتیجے پر پہنچ گئی اور مسکراتے ہوئے دلیپ کو کہنے لگی ''تھینک یو مسٹر دلیپ، میں اُرملا ہوں، گڈ بائی'' اور وہ ریٹائرنگ روم کی طرف چل دی لیکن اس کا مُڑ مُڑ کے دلیپ کو دیکھنا کچھ پیغام دے گیا۔

دلیپ بُت بنا اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ اُس کے دوست نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔'' اوئیے جواب تو واپس چل تمہارا ہارنا اسے جیت گیا۔ یقیناً پیار کی ایک نئی داستان نے جنم لے لیا اور ایک بھابھی بھی مل گئی، دلیپ کے چہرے پر دل آویز مسکراہٹ پھیل گئی۔

اتفاق ہی سمجھئے کہ دوسری بار اُن کی ملاقات ریل گاڑی کی ایک بوگی میں ہوئی۔ دلیپ ریلوے پلیٹ فارم کے بک اسٹال سے پیپر خرید رہا تھا کہ ریل چل دی، اگر بک اسٹال والا اس کی توجہ مبذول نہ کرواتا تو ریل ہی چھوٹ گئی تھی۔ وہ دوڑ پڑا لیکن اپنی سیٹ والی بوگی تک نہ پہنچ سکا اور ایک دوسری بوگی میں گھس گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ خوشی سے ہڑ بڑا اٹھا، اس نے دیکھا، اُرملا سامنے برتھ پر بیٹھی اُسے گھور رہی ہے۔ پھر نہ جانے کس خوبصورت اور انجانے جذبے نے دونوں ایک دوسرے کی باہوں میں سما جانے کے لئے کہا اور........وہ سما گئے۔

اُن کا شدتِ جذبات سے بے قابو ہو کر ملنا ایسا تاثر پیدا کر رہا تھا کہ وہ صدیوں کے بچھڑے اب کے ملے ہیں اور پھر پیار کی بے پناہ رفتار منزلیں پھلانگتی چلی گئی۔

رسوا نہ ہو تو محبت کیسی، جگ ہنسائی نہ ہو تو عشق کیسا، رسوائی بھی ہوئی جگ ہنسائی بھی ہوئی، ذات برادری، امیری، غریبی کی فرسودہ کش مکش شروع ہو گئی، لیکن یہاں بھی ہار ماننے والا کون تھا۔ جب سماج برادری انتہا پر پہنچ گئی تو وہ بھی بغاوت پر اُتر آئے اور دونوں نے پنڈی کی ایک عدالت میں شادی کر لی اور سماج دیکھتا ہی رہ گیا۔

کتنا خوشیوں بھرا دن تھا، چاند تھا کہ دلیپ کی باہوں میں اُتر آیا تھا۔ حُسن تھا کہ سارے ماحول کو چکا چوند کر رہا تھا اور دلیپ مدہوشی کے عالم میں سہاگ رات کے تصور میں ڈوب چکا تھا۔ آج وہ روح تک اُتر جانے کی

سوچ رہے تھے۔

مگر کم بخت ہونی نہ جانے کیا ہونے کا سوچ رہی تھی۔ گورا لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی عیارانہ اور مکارانہ سوچ میں گم سم تھا۔ پھر اُس نے ہندوستان کے چند رہنماؤں خاص کر پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح کی خود پرستی اور خود غرضی کا استعمال کرتے ہوئے ہندوستان کے سینے میں آخری کیل گاڑ دیا۔

وطن عزیز کو تقسیم کر دیا۔ نفرت کی آندھیاں چل پڑیں۔ انسانیت کے دشمن جنونیوں نے خون کی ہولی کھیلنا شروع کر دی۔ خون ہندو کا ہوا، خون مسلم، سکھ، عیسائی اور بدھ یعنی انسانوں کے ہاتھوں انسانیت کا خون ہوا۔ ذلت کی انتہا یہاں تک پہنچی کے مسلمان جنونیوں نے غیر مسلم بے گناہ انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر بسوں اور ریلوں میں بھرا اور تحفہ کے طور پر ہندوستان کو بھیج دیا، ہندو سکھ جنونیوں نے بھی کسر نہیں چھوڑی مسلمانوں کو تہہِ تیغ کر کے تحفتاً پاکستان کو بھیجا۔ دونوں ممالک، نفرت، ظلم، جبر اور آگ میں جھلس گئے اور راجہ اشوک کی جنگ میں مرے بے گناہوں کا قتل عام کا نمبر Beat کر دیا۔

لنگوٹی پہن کر اور ہاتھ میں قد آدم ڈنڈا لے کر جس فقیر منش نے ہندوستان آزاد کراوایا تھا اس کے صبر کا پیانہ اُس وقت لبریز ہو گیا جب اُس نے دیکھا کہ جس کشمیر میں اُسے روشنی کی کرن نظر آ رہی تھی۔ اُس کشمیر میں جب مسلم ٹانگا بانوں نے اپنے ہندو بھائیوں کو حفاظت سے جموں پہنچایا تو وہ واپسی پر انہی مسلم ٹانگا بانوں کو ہندو جنونیوں نے کاٹ ڈالا۔ اور مست الست نفرت بھرے لہجے میں چلا اٹھا'' ہندو مسلم سکھ عیسائی، آپس میں ہیں بھائی بھائی، ہندو مسلم زندہ باد''۔

اسی خونی ماحول میں، ہندو بھاگا، مسلم اور سکھ بھاگا۔ اور اس بے پناہ تکلیف وہ بھاگ دوڑ میں ماں خونی لکیر کے اُس پار رہ گئی تو بیٹیاں اس پار، بھائی اس پار رہ گیا تو بہن اِس پار۔ بیوی ادھر رہ گئی تو خاوند اُدھر رہ گیا۔ سب کچھ بکھر گیا، مقدس قرآن تار تار ہوا تو رامائین اور گیتا بھی نہ بچ سکی۔ گرنتھ صاحب ورق ورق ہوا تو مقدس انجیل کی حرمت بھی نہ بچ سکی۔ اور ان مقدس کتابوں کے شہید اوراق اعلان کر رہے تھے کہ کوئی بھی انسانیت کا دشمن، ظالم اور سفاک زیادہ دیر تک اللہ کی لاٹھی سے بچ نہیں سکے گا۔

ہر جانب عورتوں کی چیخ و پکار، ان کی تار تار آبرو، بریدہ چھاتیاں اور خون اگلتی شرمگاہیں شیطان صفت انسانوں سے چلا چلا کر پوچھ رہی تھیں، کیا تم نے ان چھاتیوں سے دودھ نہیں پیا، کیا تم نے انہی شرمگاہوں سے جنم نہیں لیا، کیا تم وہی لوگ نہیں ہو جنہوں نے کندھے سے کندھا ملا کر غاصبوں کو ملک سے اس لئے نکالا تھا کہ آپ کی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں اور بیویوں کی عزت و ناموس محفوظ نہ رہ سکے۔ غلامی جیسی لعنت سے خلاصی ہو۔ کیا تم واقعی ہی

وہی ہو جنہوں نے ایک ساتھ مل کر آزادی کے گیت گائے تھے۔

آج ہر شئے سراپا سوال بنی ہوئی تھی اور مست الست .... کہہ رہا تھا ہندوستان زندہ باد۔

پھر شاید شیطان کو بھی انسانوں کا کردار دیکھ کر شرم آنے لگی تھی، اُسے بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ حضرت انسان اتنی شرمناک پستیوں تک گر سکتا ہے۔ لہذا وہ بھی کچھ دیر کے لئے خلوت میں چلا گیا۔

فسادات تھم گئے۔ لوگ زخم سہلانے لگے، خون کے دھبے دھونے لگے، روٹی کپڑا اور مکان کی اولین ضروریات نے عوام کو مشغول کر لیا، حکومتیں ناک شرم بچانے کی تگ ودو میں مصروف ہوگئیں۔ دونوں جوانب کے رہنماؤں نے عوام پر بڑا ہی احسان کیا، کرم کیا کہ انسانوں کے تبادلے شروع کروادیئے۔ اُس پار سے لاکھوں لوگ اس طرف آگئے اور اس طرف سے بھی لاکھوں لوگ اُس پار چلے گئے۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ ملک نہ ہوں بلکہ انسانوں کی خرید وفروخت کی آزاد منڈیاں ہوں۔

دلیپ اور اُرملا سہاگ رات کی آرزو دل میں دبائے بچھڑ گئے، دلیپ جان بچا کر ہندوستان پہنچ گیا۔ اُرملا جنونیوں کے ہتھے چڑھ گئی، وہ قتل ہونے سے اس لئے بچ گئی کیونکہ وہ خوبصورت تھی! جوان تھی اور جنونیوں کے آئین میں خوبصورت اشیاء کو استعمال کرنا لکھا تھا ختم کرنا نہیں، ضائع کرنا نہیں......!!

دلیپ نے امید کا دامن تھامے روز بارڈر پر جا کر اُرملا کو تلاش کرنا اپنا حصول بنا لیا تھا وہ ہر وقت ہر اجنبی پر آنکھیں گاڑ لیتا........ آخر اس کے انتظار اور تلاش کی گھڑیاں ختم ہوئیں، اُس نے اُرملا کو پہچان لیا، کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی اُرملا جو اب صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ، بجھا بجھا سا چہرہ، ویران آنکھیں، کسمپرسی کی زندہ علامت، اُس نے بھی دلیپ کو دیکھ لیا وہ دوڑ کر دلیپ سے لپٹ گئی اور پھر سسکیاں لیتے لیتے بے ہوش ہوگئی۔

جب اُسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک بوسیدہ نیم تاریک کمرے میں خستہ سی چارپائی پر لیٹے ہوئے پایا، اُس نے اردگرد دیکھا دلیپ غائب تھا، اس نے سوچ لیا وہ کہیں انتظام میں لگا ہوگا تاکہ اُسے ساتھ لے جا سکے وہ تصورات کی دنیا میں چلی گئی، اُس نے دیکھا کہ وہ پھر دلہن بن گئی ہے، سرخ جوڑا، طلائی زیورات، رنگا رنگ چوڑیاں اُسے بہت جچ رہی ہیں، دلیپ نے اُسے اپنی مضبوط باہوں میں جکڑ لیا ہے اور سرور وکیف کی دنیا میں ہیجان برپا ہو گیا ہے اور باہر نیلگوں آسمان اُن کے وصل پر خندہ زن ہو رہا ہے۔

پھر ایسا ہوا وہ تصورات کی دنیا سے باہر نکل آئی، باہر اندھیرے بانہیں پسارے آگے بڑھ رہے تھے، دلیپ مسلسل غائب تھا، اُس نے متلاشی نظروں سے دائیں بائیں دیکھا، اس کے سر کے قریب ہی ایک بوسیدہ کاغذ پر لکھی کوئی تحریر تھی، اُس نے اُسے دیکھا اٹھا کر پڑھا، وہ دلیپ ہی کا خط تھا، اُسنے بے قراری اور اضطراب سے

خط پڑھنا شروع کیا۔

''اُرملا مجھے افسوس ہے کہ تمہاری حالت ایسی ہے کہ نہ تو میرا سماج اور نہ ہی میں تمہیں قبول کر سکتے ہیں، تم اپوتر ہو چکی ہو، مسلمانوں کی جھوٹھن ہو، تم خود بھی اپنے جسم کو اگر غور سے دیکھو تو تمہیں اپنے آپ سے نفرت ہو جائے گی۔ تم تو پاکستان کی کسی اشتہاری کمپنی کی تخلیق لگتی ہو''۔

اُرملا نے جھٹ سے اپنے جسم کی طرف دیکھا، اُس کے سینے، چھاتیوں، پیٹ اور رانوں پر یعنی انگ انگ پر لکھا تھا ہندوستان مُردہ باد، پاکستان زندہ باد.......... اُسے جھرجھری سی آگئی۔ وہ چلا اٹھی ''میں اپوتر ہوں میں جھوٹھن ہوں، پاکستانی اشتہاری کمپنی کی تخلیق ہوں.........'' پھر اسنے مسلسل قہقہوں کی بارش شروع کر دی وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی اور پاگلوں کی طرح دیوانہ وار چلاتے ہوئے باہر کو دوڑ پڑی۔

اب وہ رات دن امرتسر کے گلی کوچوں میں دیوانہ وار قہقہے مارتے ہوئے بچوں کی دلبستگی کا سامان بن گئی تھی، آخر در در کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے خون اگلنے لگی اور پھر ٹھنڈی ہوگئی۔ پوتر، اپوتر، پیار، عشق، محبت، دُکھ، اور سُکھ، خوبصورتی، بدصورتی، ہندو، مسلمان کے جھنجھٹ سے آزاد ہوگئی۔ آسمان کے کونوں پر سرخی مائل شفق خون خون لگ رہا تھا، جیسے کہ آسمان خون کے آنسو رو رہا ہے، وہ مرمریں جسم جو کبھی کسی عاشق کی آنکھوں کا نور تھا، دل کا سرور تھا، آج لاوارث تھا کوئی اُسے جلانے کے لئے تیار نہ تھا، کوئی اسے دفنانے کے لئے تیار نہ تھا، وہ بے گور و کفن جسم پوچھ رہا تھا، میں کیا ہوں، میں کیا ہوں، ہندو یا مسلمان، ہندوستانی یا پاکستانی، لیکن کسی انسانیت یا تہذیب کے علمبردار نے اُس کے سوال کا جواب نیں دیا۔

پھر اچانک کہیں سے مست الست نمودار ہوا، وہ مایوس تھا، آنکھوں سے ویرانی ٹپک رہی تھی۔ اُس نے لکڑیاں جمع کیں اور سڑک کے کنارے اُرملا کے جسم کو آگ دے دی، ہندوستان اپوتر ہونے سے بچ گیا، پاکستانی اشتہار بازی کے لئے کوئی اور جسم ڈھونڈنے لگا کیونکہ پہلا تاریخی کتبہ جل کر راکھ ہو چکا ہے۔

مست الست نے آج ہندوستان آزاد ہونے یا زندہ باد ہونے کا نعرہ نہیں مارا، وہ چپ چاپ، مایوس، ایک جانب کو چل دیا اور پھر غائب ہوگیا..........!!

☆☆☆

بلدیوراج رہبر

لفظ تیرے، تیرے ہونے کی گواہی دیں گے

محمد ایوب شبنم

مُدتوں بعد کوئی شخصیت پیدا ہوتی ہے جو اپنے زمانے، وقت اور اپنے ماحول میں رنگ بکھیرتی ہے اور چل دیتی ہے۔ اس کے ساتھ دنیا نے اچھا کیا یا بُرا، جو اسے کہنا تھا کہا اور چل دیا۔

یہی سب مرحوم بلدیوراج رہبر کے ساتھ ہوا۔ ماحول کی بے اعتنائیوں نے اُنہیں ایس لتاڑا کہ وہ بہت کچھ کہہ کر بھی کچھ نہ کہہ سکے اُن کے ہونٹوں سے موتی بکھرتے رہے جن کے پاس ظرف تھا انہوں نے وہ موتی چُن لئے۔

بلدیوراج رہبر کا جنم ۲۵ ستمبر ۱۹۲۴ء میں بمقام موضع درآبہ، سرنکوٹ۔ بخشی کرپارام وید کے گھر میں ہوا۔ پرائمری تعلیم ماسٹر موتی لال بخشی، ماسٹر کیدارناتھ دتہ، کے زیرِ سایہ حاصل کی۔ مڈل کلاس پونچھ شہر اور میٹرک کی سند لاہور یونیورسٹی سے حاصل کی۔

شادی بخشی ٹیک چند کوٹلی کے ہاں شکنتلا دیوی کے ساتھ ہوئی جو کامیاب نہ رہی۔

درآبہ جیسی مردم خیز دھرتی جس میں بخشی گنگارام دتہ، بخشی بشمبر داس دتہ، شیورتن لعل برقؔ پونچھی، مہتہ سنت رام سُودن، چوہدری میرؔا جیسی ادبی شخصیات نے جنم لیا۔ اُسی مٹی سے بلدیوراج رہبر نے بھی جنم لیا۔ گویا کہ ان کو ادب ورثہ میں ملا تھا۔

دورانِ تعلیم اُمن پر مرحوم چراغ حسن حسرتؔ، مرحوم سرفراز حسین تحسین جعفریؔ، دیانند کپور، میاں فقر

دین، دینا ناتھ آفتاؔب، وغیرہ جیسی شخصیات کا اثر پڑتا رہا۔ جس کی وجہ سے وہ ایسے نکھرے ایسے نکھرے کہ اُستادِ فن ہو گئے۔ وہ اپنی ہی غزل کو جب ترنم میں پڑھتے تو سامعین جھوم جھوم اٹھتے اور تب تک محفل کو نہ چھوڑتے جب تک رہبؔر خود ہی نہ چل دیتے۔

رہبؔر بحیثیت جوڈیشل کلرک ڈپٹی کمشنر پونچھ کے دفتر میں ملازم رہے اور بعد ازاں ڈسٹرکٹ کورٹ پونچھ میں بھی کام کیا۔ لیکن فطری اور پیدائشی شاعر زیادہ دیر تک، نوکری کی بندشوں کو برداشت نہ کر سکا اور نوکری سے منہ موڑ لیا۔

ازدواجی زندگی منتشر ہوگئی۔ والدین کب کے چل دیئے تھے۔ کل ملا کر مایوسیوں نے ایسا گھیرا کہ بکھر کر رہ گئے۔

اُن کی اس نظم میں ان کا حال زندگی جھلکتا ہے

سایہ احباب کا سر سے اٹھتا گیا
اور میں رہ گیا اُس شجر کی طرح
موسم گل میں ہی جس کے سب برگ وگل
گر گئے ہوں مگر زینتِ باغ ہوں
زیست کی راہ میں مجھ کو ایسا لگا
پھنس گیا ہو کوئی غم کی بارات میں
اپنی منزل سے رہبؔر بہت دور ہوں
شاید اس حال میں اس کو پا نہ سکوں
کیونکہ منزل ابھی تو بہت دور ہے
کیونکہ منزل ابھی تو بہت دور ہے

رہبر کی زندگی شاید مرزا غالب جیسے حالات سے دوچار تھی یا پھر وہ مرزا صاحب کے پرستاروں میں سے تھے اس لئے ان کے کلام میں مرزا کا رنگ پایا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ رہبر اپنی نجی زندگی کی تلخیوں کی وجہ سے شراب میں اتنا ڈوب چکے تھے کہ اُن کی شریکِ

حیات بھی اُن کو نہ روک سکیں اور تنگ آکر چپکے سے اپنے بھائیوں کے پاس چلی گئیں اور پھر لوٹ کر نہ آئیں۔ اُدھر رہبؔر اپنی منتشر زندگی سے متاثر ہو کر بول اٹھے۔

آج حالت دیکھ کر اپنے مکاں کی دوستوں! / سوچتا ہوں گھر بھی ہوتے ہیں بیابانوں کے بیچ

رہبؔر اپنی رفیقۂ حیات کو بے پناہ چاہتے تھے لیکن پتہ نہیں ان کی اُنا کو کہاں ٹھیس پہنچی تھی کہ وہ نزدیک ہو کر بھی دُور ہو جاتے تھے .... وہ اپنی اہلیہ کے فراق میں اس قدر ڈوبے کہ معرفت کی وادیوں میں جا پہنچے...... ویسے بھی فقیرانہ طبیعت کے مالک تھے، کام کرودھ، موہ، لابھ اور اہنکار سے فطری طور پر نفرت کرتے تھے۔ لباس سادہ، غذا سادی اور سادگی پسند تھے۔ بچوں کو اُن سے بڑا لگاؤ تھا اور خود وہ بھی بچوں سے عشق کی حد تک پیار کرتے تھے۔ اپنی جیب میں جو کچھ ہوتا دوسروں کی دلبستگی پر خرچ کر دیتے اور خود پینے کی تمنا ہوتی تو کسی دوسرے سے فرمائش کر بیٹھتے۔ جب پی لیتے تو مدہوشی کے عالم میں جو کچھ کہہ دیتے وہ ادب میں گوہر نایاب بن جاتا۔

اُن کی آنکھوں سے جام پیتے ہیں
پینے والے تمام پیتے ہیں
ظاہراً لوگ جو نہیں پیتے
پردہ ہو تو تمام پیتے ہیں
توڑی توبہ کہہ کے رہبؔر نے
زاہدوں کے امام پیتے ہیں

ایسا بھی نہیں تھا کہ رہبؔر کو یہ خیال نہ ہو کہ شراب نوشی اچھی چیز نہیں اُن کی اسی عادت کی وجہ سے لوگ اُن سے نالاں ہیں، وہ اس سے بچنا بھی چاہتے تھے لیکن نہ جانے کون سا جنون تھا جو اُن کو لپیٹ میں لے لیتا، پھر اُن کے ہونٹوں سے شعر پھوٹنے لگتے تھے۔

مجھے واعظ ثنا خوانی پہ کیوں مجبور کرتا ہے / میں پہلے گھونٹ دو پی لوں تو میری بندگی ہوگی
پریشاں جس نے کر رکھا ہے سبھی زمانے کو / ہو کہتے موت تم جس کو میں کہہ دوں زندگی ہوگی

رہبؔر کہتے تھے کہ بے شک لوگ انہیں شرابی، عیبی سمجھیں لیکن وہ خدا کی رحمتوں سے مایوس و نااُمید نہیں۔ وہ جب کوئی شعر کہتے تو اسے لکھنے کے بعد پھاڑ کر پھینک دیتے اور کہتے کہ جب ہر چیز فانی ہے تو اشعار بھی فنا

ہو جانے چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ رہبؔر کا کلام ضائع ہو گیا۔ اور جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ محض ابناشی لعل دتہ (جو رہبؔر کے خاص دوستوں میں سے تھے) کے ساتھ ایک انٹرویو کی روشنی میں لکھ رہا ہوں۔ خود ابناشی لعل دتہ صاحب کہتے ہیں کہ ان کے پاس لکھا ہوا کچھ نہیں، صرف جب رہبؔر کہتے تھے تو وہ یاد کر لیتے تھے یا دیگر دوستوں سے اشعار اکٹھے کر لیتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کے شعروں میں ایسی آمیزش ہوئی ہے، الفاظ چھوٹ گئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اشعار رہبر صاحب کے ہیں ہی نہیں۔

پھر ایسا ہوا کہ رہبؔر جب زندگی کی کشمکش سے بہت زیادہ تھک گئے تو چیخ اٹھے

راہ کٹتی نہیں منزل آتی نہیں
پاؤں الجھے ہوئے ہیں مرے کسقدر
سوچتے سوچتے پھر بھی ہوں گامزن
کھویا کھویا سا ہوں کچھ خیالات میں
ایک وہ وقت تھا مرے ساتھ تھے
کاٹ لیتا تھا میں سب کٹھن راستے
ایک یہ بھی وقت ہے آج تنہائی میں
راہ بھولے کہاں سے کہاں آ گیا
دوستوں نے کنارا کیا اس طرح
جیسے مجھ سے کبھی آشنائی نہ تھی

رہبؔر نے بھی اوروں کی طرح آخر یہ راز پا ہی لیا کہ دنیا میں ماسوائے اللہ کے سچا کوئی دوست نہیں، یار نہیں، لہٰذا اسی کی ذات مقصدِ حیات ہونی چاہیے۔ شاید انہی جذبات کے پیش نظر وہ پکار اٹھے

کیا کہوں ہر آرزو کا کیا ہوا
خون ہر ہر گام پر دل کا ہوا
آپ آئے ہیں خیالوں میں مرے
یا میرے احساس کو دھوکا ہوا

ہم تو پابندِ وفا ہیں آج بھی

ہاں نظامِ حسن ہے بدلا ہوا

عشق میں رہبؔر کسی کے فیض سے

دل کبھی شبنم کبھی شعلہ ہوا

رہبؔر، ایک صاف گو، بیباک، سچائی پسند انسان تھے۔ اُن کے ہمعصر اُن کی ادیبانہ ذہانت کے زبردست قائل تھے۔ اُن کو اُردو زبان سے بہت لگاؤ تھا بلکہ عشق تھا۔ فارسی زبان پر بھی عبور تھا لیکن اس زبان میں کبھی طبع آزمائی نہیں کی۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ رام ناتھ بڑگوترا جیسے نامور وکیل اور سابق ایم ایل اے کے مشیرِ خاص بن گئے۔

رہبؔر کی تحریریں، قانونی ہوں یا ادبی بڑا دم تھا۔ وکیل، جج اُن کا لوہا مانتے تھے۔ وہ ایک بار بیمار پڑ گئے اور اسی بیماری کی حالت میں ابناشی لعل دتہ کو آخری خط لکھا۔

''عزیزم ابناشی لعل دتہ

بوجہ شدید علالت بہت ناتواں ہوں، فقط ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ، چراغِ سحری ہوں بُجھا چاہتا ہوں۔ بخش دینا.................. آپ کا بلدیوراج رہبر''۔

پھر ایسا ہو 19 جون 1987ء بروز شکروار رہبؔر زندگی کا چونسٹھ واں برس پورا نہ کر سکے۔ ریڈیو کشمیر کے ایک نشریے میں اعلان ہوا کہ ریاست کے ایک نامور شاعر بلدیدراج رہبر دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ احباب میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ رہبؔر ابھی تک میری میڈیکل شاپ پر بیٹھے ایک آزاد نظم لکھ رہے ہیں جس کا عنوان تھا ''آوارہ بادل'' اور اس کے نیچے جلی حروف میں لکھا تھا ''عزیزم شبنم کے نام''۔

☆☆☆

صحافت کیا ہے

شاہنواز

سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ صحافت ایک ایسا فن ہے جس کے لئے مسلسل محنت کی ضرورت ہے اس بات کو بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ صحافت صرف ایک پیشہ ہی نہیں ریاست یا حکومت کا ایک اہم ستون بھی ہے اکثر لوگ اسے ریاست کا سب سے زیادہ طاقت ورستون قرار دیتے ہیں۔

اخبار نویسی کو صحیفۂ کالم نگاری یا جرنلزم کے ناموں سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔صحافت کا کام کرنے والا صحافی یا اخبار نویس یا جرنلسٹ کہلاتا ہے،صحافت ایک وسیع میدان عمل ہے، کچھ صحافی اس مقدس پیشے کو روزگار کی طرح اپناتے ہیں۔ کچھ شوقیہ طور پر اپنا کر شہرت کا وسیلہ بناتے ہیں یا فرصت کے اوقات میں تھوڑا بہت کمالینے کا آسان ذریعہ بنالیتے ہیں۔

صحافت ایک نہات ذمہ دار پیشہ ہے۔جس

کچھ ان کے بارے میں:

نام: شہنواز

قلمی نام: شہنواز

ولد: چوھدری صغیر حسین

پیدائش: 2مئی 1977، بمقام نکہ منجھاڑی، مہنڈر

تعلیم: ایم اے اُردو۔ریسرچ اسکالر (ماحولیات)

ادبی زندگی کا آغاز: دوران کالج

تصانیف: اقبال اور عصر حاضر۔اُردو اوبجیکٹو۔عالمی صحافت۔مادہ پرستی اور انسانی قدروں کی تذلیل۔روح شمس الدین۔زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

ذریعۂ اظہار: اُردو، گوجری

موجودہ پتہ: کلچرل اکادمی جموں وکشمیر، کنال روڈ جموں/لال منڈی سرینگر

میں دماغی صلاحیتوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسا پیشہ ہے جو اخلاقی جرائت کا تقاضہ کرتا ہے۔ جو لوگ اس فن کو آسان سمجھتے ہیں وہ غلط فہمیوں کا شکار ہیں قلم چلانے کا کام دیکھنے میں آسان نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس سے مشکل کوئی اور کام نہیں، ہنسی مذاق یا تفریح کے لئے صحافت سے ناطہ جوڑنے کا خیال نادانی ہے۔

صحافت ایک ایسا فن ہے جس میں تخلیقی قوتوں کے استعمال سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ صحافت کی تعریف کئی لوگوں نے کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی تعریف مختصر طور پر کرنا مشکل ہے۔ آج سے کئی سال پہلے میتھیو آرنلڈ نے اس کی تعریف یوں کی تھی ''صحافت عجلت میں لکھا گیا ادب ہے'' (اے اری)، جدید صحافی اس تعریف سے متفق نہیں ہوسکیں گے کیونکہ اس میں ایک طرح سے صحافتی پیشے کی تذلیل ہے، غور سے اگر دیکھا جائے ادب ایک علیحدہ شئے ہے اور صحافت ایک بالکل جدا میدان عمل، دونوں کے درمیان خط کھینچنا مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ ادبی تحریروں میں ایک ادیب اپنے ہی نظریات وخیالات واحساسات کا عکس پیش کرتا ہے جبکہ ایک صحافی اپنی ہم عصر دنیا کی ترجمانی کرتا ہے۔ اپنے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ تازہ رائے عامہ کی نباضی کرتا ہے، جدا جدا جذبات کا نچوڑ قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ادب کے لئے اس وقت کوئی خاص قید نہیں جبکہ صحافت کو ہمیشہ وقت کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا ہوتا ہے۔ ایک افسانہ نگار چاہے تو ایک افسانہ لکھنے میں پانچ ماہ گزار دے۔ ایک شاعر چاہے تو ایک غزل کو سات ماہ میں لکھے لیکن صحافت میں وقت کی بڑی اہمیت ہے، ایک منٹ بلکہ ایک سکینڈ کی تاخیر سے کام بگڑ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں صحافی کو پھونک پھونک کر چلنا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود صحافی ادب سے استفادہ کر کے اپنے قلم میں جان پیدا کرتا ہے اور اس طرح اپنی تحریروں کو روکھی پھیکی رہنے کے بجائے دلچسپ اور موثر بناتا ہے۔

صحافت کی تعریف

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہمارے صحافت نگاروں نے یا صحافت کے تنقید نگاروں نے صحافت کی طرح طرح کی تعریفیں کی ہیں لیکن اس کی جامع اور صحیح تعریف ہمیں یوروپین (امریکن) مصنفین سے حاصل ہوتی ہے۔ جن کے رولینڈا ہی اولڈ کر اور لارینس آر کمپ بل وغیرہ سے ملتی ہے۔ جو اس سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

صحافت جدید وسائل وابلاغ کے ذریعے عوامی معلومات رائے عامہ اور عوامی تفریحات کی باضابطہ مستند اشاعت کا فریضہ ادا کرتی ہے۔

The journalism is the systematic & reliable dissemination of public information,public openion and public entertainment modren media of commounication"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اخبارات ہمیں صرف اطلاع فراہم کرتے ہیں بلکہ کسی اہم متنازعہ مسئلے پر رائے عامہ کی تشریح یا تفسیر بھی کرتے ہیں، اخبارات کی یہ خدمات فن طباعت کی مقبولیت کے زمانے سے بھی پہلے نمایاں اور یکساں طور پر مروج تھیں۔

یوروپ کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہاں ایک حویلی سے دوسری حویلی، ایک محل سے دوسرے محل اور ایک بادشاہ سے دوسرے بادشاہ تک خبریں لے جانے والے گشتی درویش ہوا کرتے تھے۔ جو خبروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ بعض ایسے مخبر تھے جو ناچ ناچ کر نغمات کی شکل میں تازہ ترین اطلاعات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچانے کا کام انجام دیتے تھے۔

عام خیال یہ ہے کہ صحافت کسی بھی مستقل طور پر قائم شدہ اخبار کے لئے صحیفہ نگاری میں مصروف رہنے کا اجتماعی نام ہے۔ رسائل کے لئے باقاعدہ ملازمت کرنے والے بھی اپنے آپ کو صحافی کہتے ہیں، رفتہ رفتہ صحافت کا میدان جامع اور نام طباعتی میدان سے آگے نکل کر برقیاتی (Electronic) میدان میں کافی مقبول ہو گیا ہے۔ مثلاً ریڈیو کے مراکز میں کام کرنے والے خصوصاً خبروں کی تدوین اور نشر و اشاعت سے متعلق افراد ریڈیو جرنلسٹ کہلاتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کی خبروں سے متعلق افراد T.V جرنلسٹ کہلاتے ہیں اور فلم سے وابستہ افراد فلم جرنلسٹ کہلاتے ہیں۔

صحافت کی ابتدا چھوٹی چھوٹی کتابوں کی اشاعت سے ہوئی جنہیں عرفِ عام میں کتابچہ یا پمفلٹ (Pamphlet) جرنلسٹ سے پہلے اس پیشہ کا نام مغربی ممالک میں (Pamphateer) یعنی پمفلٹ باز تھا۔ مختصر کتابوں کے ذریعے نئی باتیں عوام تک پہنچائی جاتی تھیں۔ آگے چل کر بڑی بڑی کتابوں سے یہی کام لیا جانے لگا۔ اس طرح کتابچے زیادہ تر تنازعات کے لئے استعمال کئے گئے بعد میں اس کے دائرے سے نکل کر سماجی اور ثقافتی کام کے لئے لگے اس طرح خبروں کی اشاعت ہونے لگی چنانچہ ضروری ہو گیا کہ جو کچھ چھاپہ جائے بلکہ ہر طرح کی جانب داری اور تعصب سے بھی پاک ہو اور جب کبھی کسی بحث طلب معاملے پر روشنی ڈالنے کی ضرورت

پڑے تو معاملے کے دونوں رُخ پیش کئے جائیں۔اس طرح اب اخبارات سامنے آنے لگے۔ جو زیادہ بامقصد اور غیر متاثرہ تھے۔

صحافت کی خدمت ضروری خبروں کو جمع کر کے شائع کر دینا نہیں ہوتی۔صحافت کی کئی ذمہ داریاں بھی ہیں، صحافت کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ عوام شائع شدہ خبروں کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھیں۔صحافت کا فرض ہے کہ وہ صرف حق پر مبنی خبروں کی اشاعت کرے۔خبروں کا سو فیصدی صحیح ہونا بہت ضروری ہے۔یہ دیکھ لینا اہم ہے کہ جو خبر شائع کی جارہی ہے وہ عوام کے مفاد کے لئے شائع ہو رہی ہے۔دلچسپی بڑھانے کی غلط نیت سے خبروں کی صداقت کُر دبُر دنا قابل معنی اور غیر اخلاقی ہے۔صحافت کی اہم ذمہ داری یہ ہے کہ ہر چیز ہر حال میں درست اور مستند ہو۔

سماج میں تغیر و تبدل کی ذمہ داری بھی صحافت کی ہے۔صحافی نہ صرف سماج کا نمائندہ ہوتا ہے بلکہ وہ اس کا نقاد بھی ہوتا ہے۔اپنے دور کے واقعات پر بڑی گہری نظر رکھتا ہے۔جب تک کہ صحافی اپنے دور کے معاملات کو تاکتے رہنے کا عادی نہیں ہوتا۔اس کی کامیابی مشکوک رہتی ہے۔ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باوجود اخبارات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر وہ تفصیلات نہیں پیش کی جاتیں جو اخبارات پیش کرتے ہیں۔اس لئے اخبارات کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوسکتی، اخبارات کی تجارت سے صنعت وحرفت اور دیگر فائدہ مند صنعتوں کو بھی فروغ ملتا ہے،اشتہارات کے ذریعے اخبارات نئے موضوعات کو متعارف کرواتے ہیں۔دنیا میں کہیں بھی کوئی ایجاد ہوتی ہے تو عام آدمی کو اس کا علم اخبارات کے ذریعے ہوتا ہے۔اخبارات کے مختلف موضوعات مختلف مقاصد کے لئے وقف کئے جاتے ہیں۔جو سرمایہ اور اضافہ کمانے کے معاملات میں صلاح ومشورہ دیتے ہیں۔تجارتی معاملات میں جتنی مدد اخبارات سے حاصل ہوتی ہے۔وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے حاصل نہیں ہوتی،اخبارات معلومات اور تفریح دونوں فراہم کرتے ہیں۔سائنس،طب،حفظان صحت،امور خانہ داری،کشیدہ کاری،نجوم اور دیگر کئی موضوعات پر معلوماتی فیچر لکھوا کر عوام کے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں اخبارات کی ایک مخصوص طاقت ہوتی ہے۔جو اپنا جداگانہ اثر رکھتی ہے۔ اخبارات کی تاریخ گواہ ہے کہ اخبارات نے حکومتیں قائم کیں۔کئی حکومتوں کو استحکام بخشا ہے۔اور کئی حکومتوں کو جڑ

سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ مشہور مورخ H.G Wep نے لکھا ہے کہ روم کی طاقت ور حکومت اس وجہ سے دیر پا نہ رہی کہ اس زمانے میں اخبارات عام نہ تھے۔ مشہور فاتح نپولین کو اخبارات کی طاقت کا صحیح علم تھا، ان کا مشہور قول ہے کہ تین مخالف اخباروں کا ایک ہزار بندوقوں سے بھی زیادہ خوف کھانا چاہیے۔ ایک مشرقی محاورہ ہے کہ چھوٹے حکمران شہنشاہ اکبری کی تلوار سے زیادہ ابوالفضل کے قلم سے زیادہ خوفزدہ تھے۔ ہندوستان کی حالیہ تاریخ میں گوپال کرشن گھوکھلے کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ جنہوں نے اپنے اخبارات کی آواز کو کافی مضبوط بنالیا تھا۔

بال گنگا دھر تلک کے اخبارات کیسری اور مراٹھا سے انگریزی حاکم ہمیشہ لرزاں رہا کرتے تھے۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال کی تحریروں کا اثر دیکھ کر فرنگیوں کے کلیجے کانپ جاتے تھے۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہیں ہے۔ کہ اخبارات کی اہمیت قانون ساز اسمبلیوں اور حکومتوں اور عدالتوں سے کم نہیں ہے۔ جمہوریت کے اہم ترین ارکان پارلیمانی ادارے اور اخبارات ان دونوں کے بغیر کسی بھی حکومت کا نظام درہم برہم ہوسکتا ہے۔

اخبارات کی سیاسی قوت ایسی اٹل حقیقت ہے کہ عوامی محاذ کو اخبارات کی موافقت اور مماسلت سے کامیابی حاصل ہوسکتی ہے ہندوستان کی آزادی کے حصول میں اخبارات کا تاریخی کردار رہا ہے، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اخبارات کی وجہ سے ہمارے ملک کو آزادی نصیب ہوئی۔ کیونکہ تمام قومی تحریکوں کو اخبارات کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ انگریزوں کی ملکیت میں شائع ہونے والے اخبارات کی طرح ہندوستانی اخبارات بھی انگریزوں کے فرمانبردار رہتے تو شاید آزادی کا سورج ہندوستان میں کبھی طلوع نہ ہوتا۔

آج دنیا بھر میں ہزاروں روزنامہ اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ جن کی مجموعی اشاعت کروڑوں میں بتائی جاتی ہے آج دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں اخبارات شائع نہ ہوتے ہوں۔

صحافت ایک انتہائی دلکش پیشہ ہے۔ اور ذریعۂ روزگار بھی ہے۔ صحافی اپنے دور کے تاریخ نویس بھی ہیں۔ اخبار نویس یا صحافی عوام کی آنکھیں، کان اور ضمیر ہیں سماج میں صحافی کا ایک باوقار مقام ہے۔ جو قدیم علوم سے واقف اور جدید فلسفوں کا ماہر بھی ہے۔ جس کا دماغ سائنسی ہے اور ایک انجینئر کی طرح تحقیقی قوتوں کا مالک بھی ہے۔ جس کے پاس یہ صلاحیت ہے کہ وہ سینکڑوں سطور میں دی جانے والی تفصیلات کو مختصر ترین الفاظ میں سہولت اور روانی کے ساتھ پیش کرسکتا ہے۔ صحافت کی ترقی کی نقیب اور مستقبل کی تصویر ہے۔ کسی بھی معاشرے کے لئے اخبار آبِ حیات سے کم نہیں ہے۔

مختصر یہ ہے کہ صحافت ایک ایسا فن ہے جو قوموں کو زندگی عطا کرتا ہے اور انہیں ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔ شرط یہ ہے صحافت کا اگر صحیح استعمال کیا جائے۔ ورنہ غلط ہاتھوں میں آنے سے صحافت قوموں کے لئے سم قاتل ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے غلط استعمال سے سماج میں طرح طرح کی بدعتیں پھیلتی ہیں۔ جن سے قوموں کے کردار مجروح ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ صحافت کو صرف تعمیری مقاصد کے لئے سماج کو بیدار کرنے کے لئے استعمال کیا جائے اسی صورت میں صحافت کا درجہ آب حیات سے بڑھ جاتا ہے۔

زرد صحافت کا تصور

زرد صحافت سے مراد ایسی صحافت ہے جس کا مقصد سنسنی پھیلا کر قارئین کی زیادہ توجہ حاصل کرنا ہے۔ اسی منزل کو پانے کے لئے جان بوجھ کر ایسی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ جن میں صداقت تو بہت کم ہوتی ہے۔ پر وہ قاری کے لئے بے پناہ کشش کا باعث ہوتی ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے ایسا مواد استعمال میں لایا جاتا ہے جو قاری کے دل و دماغ پر سوار ہو کر اسے اپنے شکنجے میں اس طرح جکڑ لیتا ہے کہ اس کی گرفت کے ساتھ ہی ساتھ اسلوب بھی ایسا برتا جاتا ہے۔ جس میں حیرانی اور استعجاب کا عنصر بھر پور ہی نہیں جادوئی بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات مثالوں اور تصویروں سے جادوں جگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سنسنی پھیلانے والے عناصر کی مثالیں اِکا دُکا صحافت کی ابتداء ہی ہمارے سامنے آنے لگتی ہیں۔ لیکن اس کا باقاعدہ آغاز 1890ء کے آس پاس ہوا۔ دو اخباروں New York World اور New York Journal سے ہوا اور نیویارک ورلڈ نے 1889ء سے ہی مزاحیہ خاکوں اور تصویروں کو برتنا شروع کر دیا تھا۔ 1893ء میں نیویارک ورلڈ نے پہلی بار رنگین صحافت کا آغاز کیا۔ 1896ء میں اس نے پوری طرح ایک بدشکل لباس کا ہلکا زرد رنگ دینے کے لئے اپنے رنگین پریس کو استعمال کیا۔ جسے ٹوٹے ہوئے دانتوں والے ایک شخص نے پہن رکھا تھا۔ Richard-F-out Calt جو کہا ایک مصور تھا کی متعدد تصویروں کا مرکزی کردار تھا۔ یہ تصویریں سستے فلیٹوں والے شہر میں ہوئے خیالی واقعات کو پیش کرتی تھیں۔ اور اخبار میں اس طرح کی کوشش ایک نئی چیز تھی۔ اور اس سے اخبار کی اشاعت میں خاصا اضافہ ہوا۔ 1895ء میں Willium Randolph hearst نے فرانسیسی Examination کو چلانے کے لئے نیویارک جرنل کو بھی خرید لیا اور اس طرح نیویارک ورلڈ کا مدِ مقابل بن گیا۔

☆☆☆

مشتِ خاک

موتی لعل کپور

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب

موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

3 اگست 1981ء کی صبح گیارہ بجے ایک روپہلی دوپہر میں اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ ایک عظیم ہستی کی مشتِ خاک کو دامن میں سمیٹے آبِ رودِ گنگا کے کنارے بسے شہر ہردوار میں ہر کی سیڑھی پر کھڑا تھا۔ ہمارا پشیتنی پانڈا آنکھیں موندے زور و شور سے رٹے رٹائے اشلوک پڑھنے میں مشغول تھا اور میں تھیلی میں سے بند ڈبہ کھول کر استھیوں کو جب ہر کی سیڑھی پر نذرِ آب کر چکا تو وہاں موجود کچھ پیشہ ور کھوجی اپنے ہاتھوں سے چاندی کے روپے ٹٹول کر اپنی جیبیں بھر رہے تھے، جو استھیوں کے ساتھ نذرِ آب کئے جاتے ہیں۔ ایک ایسے انسان کی استھیوں کو جس نے کسی انسان کو عذاب دینے کی بات سوچی بھی نہ ہو۔ چاندی کے سکے اس طرح ہاتھوں سے ٹٹولتے رہے جس نے ہمیں ذہنی عذاب میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ میں اس حرکت کو برداشت نہ کر سکا۔ میں نے مٹھی بھر سکے اپنی جیب سے نکال کر اُن کی

کچھ ان کے بارے میں:

نام: موتی لعل کپور

ولد: چوھدری دیانند کپور

قلمی نام: موتی لال

پیدائش: 17 مئی 1929ء۔ بمقام محلہ پنڈتاں، پونچھ

تعلیم: بی اے، ادیب فاضل

ادبی زندگی کا آغاز: زمانۂ طالب علمی سے۔

تصانیف: روشن چراغ (تذکرہ)

پیشہ: ریٹائرڈ اسسٹنٹ ڈائریکٹر انفارمیشن (1984)۔

ذریعۂ اظہار: اُردو

موجودہ پتہ: اپنا وھار، مکان نمبر 86 کنجوانی، جموں (جموں وکشمیر)

طرف اچھالے جن میں سے کچھ پانی میں بھی گر گئے اور وہ غوطہ لگا کر ان سکوں کو بھی برآمد کر کے ہر کی سیڑھی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ اب میرے والدِ گرامی کی پوری زندگی میرے ذہن کے صفحۂ قرطاس پر سنیما کی متحرک تصویروں کی طرح گزرنے لگی۔ سرو قد، کہرا بدن، دھوبی دھلے پاجامہ قمیض میں ملبوس، اور سر پر ہلکے گلابی رنگ کی خوبصورت بندھی دستار، چھوٹے سائز کے فلیکس جوتے، دکان پر سجے چھ فٹ تخت پوش پر بچھے سفید غلاف کے گدے پر نہایت سہل پسندی سے بیٹھ کر حقہ کے کش لے کر دھواں خارج کرتے۔ کتابوں کے شلف کے ایک کونے پر لگی، کیل پر منشی پریم چند کا فوٹو آویزاں تھا۔ جس کے پاس ہی ایک اور کیل پر ان کا کوٹ یا اچکن ٹنگی رہتی تھی۔ ان کی بندھی بندھائی پگڑی گدے کے کونے پر براجمان رہتی۔ آخری وقت تک ان کے سراپے میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی اس لئے ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے محاورے کا ان پر اطلاق ہوتا تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا اور شعور نے مجھے آگاہی بخشی تو یہ احساس شدت سے میری زندگی کا اثاثہ بن گیا کہ میرے والد ایک عظیم شخصیت ہیں۔ جن کے اردگرد ہمیشہ صاحبِ ادراک اصحاب کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ اور سوائے مولانا چراغ الحسن حسرتؔ کے وہ ہر محفل میں میرِ مجلس کا درجہ حاصل کر لیتے تھے۔ جب بزرگوں نے مجھے بتایا کہ وہ کسی بھی اسکول میں متعلم نہیں رہے بلکہ پہلی دوسری جماعت کی اُردو کتابیں خضری مولوی صاحب سے پڑھ کر علم حاصل کرتے رہے تو میرے دل میں ان کا احترام دوچند ہو گیا۔ بط مشترکہ کنبہ کچھ فارغ البال ہوا تو خود اپنی پڑھائی کے بل بوتے پر لاہور جا کر ادیب فاضل کے امتحان میں شامل ہوئے اور پھر درس و تدریس میں جانے پہچانے اساتذہ سے بھی سبقت لے گئے۔ اس امتحان میں اس وقت فلسفہ، معیشت، تواریخ، اُردو ادب، تنقید اور دیگر مضامین شامل تھے۔ جب وہ اس امتحان میں امتیازی نمبر لے کر کامیاب ہوئے تو ریاست پونچھ میں وہ پہلے طالب علم تھے۔ جن کو یہ امتحان پاس کرنے پر چیف ایجوکیشن آفیسر پونچھ کی طرف سے اُردو مدرس کی تقرری کا پروانہ موصول ہوا جو انہوں نے کافی سوچ وچار کے بعد مسترد کر دیا۔ اپنی ہی تجارت کے لئے انہوں نے اسٹیشنری، درسی کتابیں اور بجلی کے سامان کی اچھی خاصی دکان کھول لی۔ لیکن اس دوران ان کی اس خواہش میں کہ اپنا اخبار نکالا جائے، بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ بالآخر اس سلسلہ میں پہلا قدم جو انہوں نے اٹھایا وہ لیتھو پریس کی خریداری کا تھا۔ کیونکہ اس وقت پوری ریاست پونچھ میں کوئی پریس نہ تھا۔ چنانچہ اس پریس کے قیام کے بعد انہوں نے 1936ء میں پہلا ہفت روزہ اخبار ''پربھات'' جاری کیا جو 1947ء تک برابر جاری رہا۔ 1947ء کے پُرآشوب دور میں جب ریاست پونچھ کا پورا ڈھانچہ بکھر گیا تو اخبار کا بند ہونا ایک لازمی عمل تھا۔ اخبار کی ہردلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ اس کی وجہ سے کئی بار ریاستی انتظامیہ کی طرف سے بھی موردِ عتاب ہونا پڑا۔ کئی بار ضمانتیں ضبط ہوئیں اور کئی بار قید و بند کی نوبت آئی لیکن میرے والد محترم چودھری دیانند کپور جو اس

اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے۔ کی قلم نے اپنی روش نہ بدلی اور نہ ہی بے زبان رعایا کی بے خوف ترجمانی سے روگردانی کی بلکہ جواں مردی سے اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

1947ء میں جہاں اخبار پر قیامت ٹوٹی وہاں اسٹیشنری کتابوں اور بجلی کے سامان سے بھری دوکان دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکی۔ گویا زندگی کا سارا اثاثہ 1947ء کی نذر ہوگیا۔ لیکن چودھری دیانند کپور کی فقیرانہ بے نیاز اور ادب نواز ذہن نے یہ مصیبتیں ہنسی خوشی قبول کرلیں۔ اسی دوران جب شیخ محمد عبداللہ بطور وزیر اعظم جموں وکشمیر، پونچھ کے دورے پر تشریف لائے تو انہوں نے چودھری صاحب سے اصرار کیا کہ جموں ریڈیو اسٹیشن کا قیام عمل میں لایا جاچکا ہے اور اس میں لکھنے پڑھنے والوں کی اشد ضرورت ہے۔ چودھری صاحب کو جموں آنے کی تاکید کی۔ وہاں پر جموں ریڈیو اسٹیشن کے ابتدائی دور میں اُردو کے اسکرپٹ رائٹر مقرر ہوئے، یہ خدمت انہوں نے بیس برس تک انجام دی۔ بے شمار ڈرامے اور ریڈیائی مضامین لکھے۔ چونکہ گھر کا اثاثہ پورا ختم ہوچکا تھا۔ زرعی زمین غیر آباد پڑی تھی اور عیالداری کا بوجھ سر پر تھا اس لئے بیس برس تک حقیر مشاہرہ پر ریڈیو اسٹیشن جموں کے ساتھ منسلک رہے۔ لیکن اس دوران بھی پربھات نکالنے کا سودا ان کے سر میں سمائے رہا۔ مجھے سرکاری نوکری سے استعفیٰ دینے کا حکم دیا اور اس طرح دوبارہ اخبار پربھات کی اشاعت کی تجدید ہوئی۔ اس دوران اخبار کی صاف گوئی اور بے باکی کے لئے انہیں پھر عدالتوں اور بیکاری کا سامنا کرنا پڑا اور آخر تین برس کے بعد اس خبار کو یک مشت بند کرنا پڑا۔ ریڈیو اسٹیشن سے سبکدوش ہوکر چودھری صاحب واپس پونچھ پہنچے۔ ۳ سال ہی ہوئے تھے کہ 22 اپریل 1971ء کو ان کی اہلیہ (اور میری ماں) نے وفات پائی۔ جس کی وجہ سے ان کو ایک عظیم صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ہم سب بھائی اپنی ذمہ داری سنبھالنے کے قابل ہوچکے تھے۔ بالآخر 19 جولائی 1981ء کو وہ اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے۔

1932ء میں جب چودھری صاحب نے اخبار ''پربھات'' نکالا تو بچپن سے ہی مولانا چراغ حسن حسرتؔ نے جوان کے ہمعصر اور رفیق تھے۔ اخبار نکالنے کی بہت مخالفت کی لیکن چودھری صاحب نہ مانے۔ حسرتؔ صاحب کے ساتھ انکی رفاقت اور ادبی اشتراک کی بدولت وہ ان کو چار بھائیوں میں شمار کرتے تھے۔ جب وہ پونچھ آتے تو میرے والد کے ساتھ ہی دن گزارتے اور جب کبھی والد لاہور جاتے تو انہی کے ہاں ٹھہرتے۔ چالیس برس تک ان کی رفاقت قائم رہی۔ 1947ء تک حسرتؔ صاحب نے ہمارے گھر کے پڑوس میں اپنا گھر تعمیر کرلیا تھا اور دونوں دوست اور ہم جلیس اور زیادہ نزدیک ہوئے۔ 1947ء کے بعد حسرتؔ صاحب لاہور بس گئے اور میرے والد پرانی یادوں کے کھنڈرات کو سمیٹے ان کے امین بنے رہے۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے والد کے حسب ونسب کا کچھ ذکر کروں۔ وہ تین بھائی تھے اور چار بہنیں۔ اپنے والد چودھری رادھا کرشن منصرم بندوست کی وفات پر بڑے بھائی بابو لال ہیڈ کلرک چیف جج پونچھ جو ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے کے کندھوں پر خاندان کی کفالت کی تمام ذمہ داریاں آگئیں۔ اور انہوں نے بہنوں کے بیاہ اور بھائیوں کی تعلیم وتربیت کا بوجھ بڑے تحمل سے اٹھایا۔ سب سے چھوٹے بھائی سروانند کو میٹرک پاس کروا کے لاہور بھیج دیا جو ایک نامور ڈاکٹر بنے۔ میرے والد دوکانداری کا فریضہ انجام دینے لگے اور بابو لال چند نے جو مڈل پاس تھے محکمہ میڈیکل میں کلرک تعینات ہوئے۔ خاندان میں ذہانت اور فطانت کی کمی نہ تھی اس لئے بیس سال کے عرصہ میں ہی سبھی بھائی نہ صرف روزی روٹی میں خود کفیل ہوئے بلکہ زورِ قلم اور دانشوری سے پونچھ کی تاریخ ساز شخصیات میں شمار ہونے لگے اور بیرون ریاست سے آئے نامور شعراء، صحافی ان سے ملنا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔

پونچھ میں دوائیوں کی ایک بہترین دوکان کھولی جسکی شیشے کی چمکتی الماریوں میں ہزاروں روپے کی دوائیوں کا اسٹاک بھرا گیا۔ ڈاکٹر گوری شنکر کو جو سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے تھے دوکان پر معالج کے طور پر بٹھا دیا گیا تاکہ میرے چچا ڈاکٹر سروانند اپنی تعلیم مکمل کر کے اس کو سنبھال لیں۔ یہی ڈاکٹر گوری شنکر کرشن چندر مرحوم کے والد تھے۔ اس دوکان سے متصل میرے والد کا دوکان نما دفتر تھا جہاں تخت پوش کے گدے کے علاوہ ایک کونے میں لگی سگریٹ کی پیٹی اور سامنے ایک چوڑی بینچ تھی۔ اس چوڑی بینچ کے ایک کونے پر مولانا چراغ حسن حسرتؔ صاحب بیٹھا کرتے تھے۔ سگریٹ 555 کا گول ڈبہ اور ماچس ہاتھ میں ہوتی اور ایک کے بعد دوسرا سگریٹ سلگاتے اور چند کش لگا کر اسے راکھ کی پنسل میں تبدیل کر دیتے۔ یہ تینوں بھائی چراغ حسن حسرتؔ کو اپنا چوتھائی بھائی سمجھتے تھے۔ بلکہ تایا جی بابو لال چند کا بے حد احترام کرتے۔ بابو لعل چند خود بھی شاعر تھے اور وفاؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کی خوش نویسی اور ادبی تحریریں آج بھی کئی لوگوں کے پاس محفوظ ہیں۔ یہ تینوں بھائی دارِ فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ صرف جانے والوں کی یاد آتی ہے۔

ریاست پونچھ کی مردم خیز دھرتی میں اُردو مشاعرے کا سہرا چودھری صاحب کے سر ہے۔ وہ بزم ادب پُونچھ کے 1947ء تک سیکریٹری رہے اور کئی تنظیموں کے صدر بھی لیکن بچپن سے لے کر آخری عمر تک بے نیازی، لا ابالی، نمود ونمائش سے اجتناب، انسانی ہمدردی اور بے پناہ خلوص ان کا طرۂ امتیاز رہا اور بقول غالبؔ ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ'' کے مقولے پر عمل پیرا رہے۔ علمی اور ادبی خدمات کی شناسائی کے لئے نہ کسی کی جبہ سائی کی اور نہ ہی کسی انعام کے متمنی رہے۔

محمد دین فوقؔ کی تاریخ اقوام پونچھ میں چودھری دیانند کے متعلق درج ہے ''پونچھ جیسے سنگلاخ خطے میں

دیانند کپور ہی وہ پہلے پونچھی ہیں جنہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل پاس کیا۔ عرصہ تک لاہور کے اخبار ''کشمیری'' کے قلمی معاون رہے جو اخباری دنیا میں نہ صرف جموں وکشمیر بلکہ پونچھ کی پبلک کا اولین ترجمان تھا۔ شورش زدہ ریاست جموں وکشمیر کے بعد وہاں کی رعایا کو پریس واخبار کے اجراء کی اجازت ملی تو سب سے پہلے آپ ہی نے اس پہاڑی ملک میں ایک پریس قائم کر کے پربھات کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ آپ ہندو مہا سبھا اور بزم ادب کے سیکریٹری ہیں۔ پونچھ پبلک لیگ کہ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جماعت ہے اور حال ہی میں وجود میں آئی ہے۔ کے صدر ہیں۔ اور حکام میں آپ کی عزت ووقعت ہے''۔

چودھری دیانند پونچھ میونسپلٹی کے میونسپل کمشنر اور ساتھ ہی چیف جج کی کورٹ میں اسیسر (Assessor) رہے۔ ان کی وفات پر بے شمار تعزیتی پیغامات وصول ہوئے۔ ریاست پونچھ کی چار تحصیلوں میں شاذ ونادر ہی کوئی فرد ہوگا جو ان کے نام اور کام سے واقف نہ رہا ہو۔ (ماخوز ''روشن چراغ'' مرتبہ: موتی لعل کپور)۔

☆☆☆

سُر کا سفر

راوی: کرتار چند............تحریر: انور خان

کسی قوم یا خطے کی شناخت اس قوم یا خطے کے تمدن یا ثقافت سے ہوتی ہے۔ ہمارا علاقہ پونچھ بھی اپنی منفرد تہذیبی میراث رکھتا ہے اور اس تہذیبی اور ثقافتی ورثے کی حفاظت کے لئے پونچھ کے لوگوں نے بہت منصوبہ بند کوششیں کی ہیں۔ ادب اور ثقافت کی ترویج و اشاعت کے لئے بہت سے اداروں نے اپنی خدمات انجام دیں۔ ان اداروں میں جناب کے ڈی مینی کا کرشن چندر کلب، بزمِ یادگارِ حسرتؔ، کوہسار کلچرل آرگنائزیشن۔ کہکشاں کلب Attempt Socio Cultural Organisation وغیرہ کی خدمات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ بے شک یہ سبھی ادارے ادبی اور تمدنی سرگرمیوں کے ساتھ منسلک رہے۔ مگر ان میں کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں تھا جس نے خاص طور پر موسیقی کی طرف دھیان دیا ہو۔ اس بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے میں نے 1974ء میں ''سُر سنگھم پربھات'' نام کے ادارے کو قائم کرنے کا خیال پیش کیا۔ یہ بات جب

کچھ ان کے بارے میں:

نام: کرتار چند

ولدیت: جگت رام

پیدائش: 22 نومبر 1956ء۔ بمقام پونچھ۔

پیشہ: اسکول ٹیچر۔

مشغلہ: گلوکاری۔

موجودہ پتہ: وارڈ نمبر 4، مکان نمبر 13 نئی بستی پونچھ (جموں و کشمیر)

موبائل: 9419877282

اس وقت کے کالج کے لیکچرار جناب ایل پی بخشی اور پروفیسر ایچ کے کپور کے ساتھ زیر بحث آئی تو انہوں نے بھی مجھے بھرپور تعاون کا یقین دلایا اور تبھی ان کی حوصلہ افزائی سے تحریک پاکر ''سُر سنگم پربھات'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔

ابتدا میں تو بقول مجروحؔ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اس کارواں میں میرے ساتھ شریک لوگوں میں زیادہ تر طالب علم تھے۔ جن میں ونے مشری (جو آجکل لیکچرار ہیں) منظور بٹ (جو فی الوقت ماسٹر ہیں) اور خصوصاً نیاز احمد شیخ جو کہ اس وقت کنزرویٹر فارسٹ ہیں، شامل تھے۔ یہ ادارہ 1974 سے 1976ء تک نوجوانوں میں خاص طور سے موسیقی کے شوق کو عام کرتا رہا اور مختلف موقعوں پر مختلف پروگراموں کا انعقاد عمل میں لاتا رہا۔

ہمارے اس ادارے میں زیادہ تر نوجوان شامل تھے اور بعد میں وہ اپنی اعلیٰ تعلیمات کے لئے پونچھ سے باہر چلے گئے تو ہمیں بچارو ناچار اس کلب کو بند کرنا پڑا۔ لیکن موسیقی کی ترویج کا شوق میرے اندر اس قدر تھا کہ میں جلد ہی کچھ اور کرنا چاہتا تھا اس کے بارے میں میں نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مشورہ کیا اور جس کے نتیجے میں 31 اکتوبر 1976ء کو ''سرسوتی سنگیت کلا کیندر'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سرسوتی سنگیت کلا کیندر تب سے لے کر اب تک پونچھ میں موسیقی اور فنون لطیفہ کی خدمات انجام دے رہا ہے۔ سرسوتی سنگیت کلا کیندر کے قیام میں میرے چھوٹے بھائی اوم پرکاش کے علاوہ جن ساتھیوں نے تعاون دیا اور پیش پیش رہے ان میں ودھو بھوشن شرما، راجیش دتہ، ٹھاکر راجندر پورن، ریٹائرڈ ایس پی جناب محمد رفیق شال، گرشرن سنگھ گلشن، کی خدمات نہ صرف قابل ستائش ہیں بلکہ یہ لوگ اگر ساتھ نہ دیتے تو شاید سرسوتی سنگیت کلا کیندر کا قیام ممکن ہی نہ ہوتا۔ کیندر کے قیام کے فوراً بعد دو ہونہار اور باصلاحیت فنکار اس میں شریک ہوئے اور آج یہ دونوں لوگ پونچھ کی ادبی اور ثقافتی دنیا کے جانے مانے نام ہیں۔ یہ دو نوجوان تھے پردیپ کھنہ اور کُلدیپ سنگھ انجانا۔ پردیپ کھنہ کالج کے اسٹیج پر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکے تھے اور کُلبیر سنگھ انجانا شبد گربانی کے گائین کی وجہ سے موسیقی سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ میں نے اوم پرکاش اور ان دونوں نے مل کر کچھ اور لوگوں کو ساتھ لیا اور نئے سرے سے پونچھ میں ثقافتی اور تمدنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ اور تب سے لے کر آج تک پونچھ کے طول و عرض میں سینکڑوں پروگرام منعقد کئے جس سے موسیقی کے ساتھ ساتھ پہاڑی، گوجری اور کشمیری لوک گیتوں اور گائیکی کو بھی فروغ ملتا رہا۔ اس اثناء میں ہمارا یہ کلب حکومتِ ہند کے ادارہ Song & Drama Division کے ساتھ 1986ء میں رجسٹرڈ ہو گیا اور ہم لوگ پونچھ کے لوک گیتوں اور فنکاروں کو لے کر پونچھ سے باہر ملک کے دیگر حصوں میں بھی جانے لگے۔ سانگ اینڈ ڈرامہ

ڈیویژن کے ساتھ ہم لوگ جے پور، اجمیر، چندی گڑھ، اور جودھ پور تک گئے۔ ان علاقوں کا دورہ ہم نے 8 ستمبر 1993ء سے 22 ستمبر 1993ء تک کیا۔ اس کے علاوہ میں ذاتی طور پر کلکتہ، الہ آباد، نینی تال میں اپنے فن کا مظاہرہ کر کے آیا۔ ہمیں اور ہمارے کلب کو پہاڑی اور گوجری لوک گیتوں کو فروغ دینے میں دو اداروں نے بھرپور تعاون دیا۔ یہ ادارے ہیں، ریڈیو کشمیر اور کلچرل اکادمی جموں وکشمیر۔ ریڈیو کشمیر جموں اور سرینگر سے ہمارے گائے ہوئے گیت اور لوک گیت نشر ہوئے تو بہت سے نئے فنکار ہمارے ساتھ جڑے اور وہ بھی ریڈیو اور ٹی وی تک پہنچے۔ ان میں سب سے اہم نام خورشید راتھر کا ہے۔ اسکے علاوہ شیاما سودھن، ترپتا کماری، اور پریم پرکاش کھجوریہ بھی ان فنکاروں میں سے ہیں جنہوں نے سرسوتی کلا کیندر کے ساتھ وابستہ ہو کر اپنے فنی سفر کا آغاز کیا۔

1989ء میں جموں وکشمیر کلچرل اکادمی نے ریاستی لوک گیتوں کے کیسٹ نکالنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے ریاست اور ملک کے نامور گلوکاروں نے اپنی آواز بخشی اور ان میں سورج سنگھ، جیتندر کور، ولوول وار جیسے نامی گلوکار شامل تھے ان کیسٹوں کو ''شنگراں'' ''ٹھوکاں'' ''اور لئی گئیں دل'' کے نام سے منظر عام پر لایا گیا۔ ان سبھی کیسٹوں کو کمپوز کرنے یعنی موسیقی دینے کا کام میں نے کیا۔ میری موسیقی اور دُھنوں پر مبنی ایک اور کیسٹ اکادمی نے 2000ء میں ''چنگیر'' کے نام سے منظر عام پر لائی، جس کو اقبال ملنگامی، سورج سنگھ اور بشیر مستانہ، جیسے گلوکاروں نے گایا۔ اس سے پہلے 1998ء میں میں نے اور میری اہلیہ ترپتا کماری نے ''پہاڑاں نی خوشبو'' نام کا ایک کیسٹ نکالا جس میں پہاڑی گیتوں اور لوک گیتوں کی ایک دھنک سجائی گئی تھی۔

سرسوتی سنگیت کلا کیندر اور دیگر تنظیموں نے گلوکاروں کو نئے مواقع تو فراہم کئے لیکن پونچھ میں اب بھی کوئی ایسا ادارہ نہیں تھا جہاں موسیقی کی باقاعدہ تربیت دی جا سکتی۔ جہاں سات سُروں کی سرگم کا گیان دیا جا سکتا۔ جہاں ''کومل'' اور ''تیور'' کا فرق بتایا اور سکھایا جا سکتا، سُر اور تال کا علم گانے والے کی سمجھ میں آسکتا۔ جہاں گلوکار کا یہ جان سکتا کہ کس مزاج کے گیت کو کس طرح کے سُروں کی ضرورت ہے اور محض سنے سنائے گیتوں کو دہرانا گائیکی نہیں۔ اسی بات کے پیش نظر ''سرسوتی سنگیت ودیالیہ'' نامی ادارے کو معرض وجود میں لایا گیا۔ اس ادارے کے سرپرستِ اعلیٰ کی حیثیت سے شیخ سجاد حسین سابق وارڈن گجر بکروال ہوسٹل پونچھ کی سربراہی میں ایک مجلس عاملہ (Executive Body) کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ جس کے جنرل سیکریٹری کا کام سردار جگجیت سنگھ دل دیکھ رہے ہیں اور مجلس عاملہ میں جناب بشیر حسین بٹ، سینئر لیکچرر، جناب جگبیر سودھن، لیکچرار، جناب ایم ایس بالی، جناب طارق اشرف سرنکوٹی، جناب راجندر سنگھ طوفان، سنجے کمار چمکیلا، ترپا کماری اور پرتپال سنگھ بالی شامل ہیں۔

اس ودیالیہ کے مقاصد میں کلاسیکی موسیقی اور گائیکی کو فروغ دینا اور اس کی تعلیم دینا شامل ہے۔ کیونکہ پونچھ سے لے کر اکھنور تک ایک بھی ایسا ادارہ نہیں جہاں موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہو۔ یہ ودیالیہ اس علاقے میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے۔

ادارے کے مقاصد میں اس کے علاوہ نوجوانوں کی توانائیوں کو مثبت راہ پر لگانا اور ان کے اندر فنونِ لطیفہ اور خصوصاً موسیقی کا شوق پیدا کرنا، آپسی بھائی چارہ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینا۔ خصوصاً مقامی لوک گیتوں اور لوک گائیکی کے مختلف اندازوں جیسے بیت وار، درشنی اور چن وغیرہ عام اور محفوظ کرنا نئے اور باصلاحیت فنکاروں کی صلاحیتوں کے مطابق ان کی تربیت کر کے ان کے فن کی دنیا میں مواقع تلاش کرنا۔ نئے شعراء کی تخلیقات گا کر یا اسٹیج پر پیش کر کے ان کے لئے فن کی دنیا میں مواقع فراہم کرنا ہے۔ اس سب کی Co-ordination اور طلباء کو موسیقی کی تعلیم دینے کا کام میرے ذمے ہے۔ پونچھ کی عوام اور انتظامیہ کا تعاون ہمیں ہمیشہ حاصل رہا ہے اور اگر آئندہ بھی یہ سلسلہ اسی طور سے جاری رہا تو پونچھ کی ادبی اور ثقافتی میراث کی حفاظت اور اُس کو نئی منازل کی جانب لے جانے میں یہ ودیالیہ یقیناً ایک اہم کردار نبھائے گا کیونکہ

بہت دیر رہتی ہے نغمے کی لے　　　　بہت عمر ہوتی ہے آواز کی

حرفِ آخر کے طور پر ہم سب سرنکوٹ میں متحرک کرشن چندر میموریل بزم ادب کے وجود کے لئے دعا گو ہیں کہ یہ ادارہ شعر و ادب اور موسیقی کی بقاء کے لئے دن دگنی رات چگنی ترقی کرے۔ ساتھ ہی جناب محمد ایوب شبنم جو اس بزم کے صدر ہیں اور ادبیاتِ پونچھ کے عنوان سے ایک تاریخی دستاویز کی اشاعت کر کے ہم سب کو اندھیروں سے روشنی کی طرف لا رہے ہیں کے شکر گزار ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ان یہ کی پیش کش ادبی دُنیا میں سنگِ میل ثابت ہوگی۔

☆☆☆

میرا تمدنی سفر

جب سے میں نے ہوش سنبھالا تب سے ہی یہ خواہش میرے اندر کروٹیں لینے لگی تھی کہ میں زندگی مین ایک ایکٹر بنوں گا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ خواہش بھی جوان ہوتی گئی، مگر اپنے اندر کے ایکٹر کو باہر نکالنے کا موقعہ اس دوران میرے ہاتھ نہ لگا۔ آخر کار ۱۹۷۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب میں نے ڈگری کالج پونچھ میں داخلہ لیا تو وہاں ہر سال کالج کا فاؤنڈیشن ڈے منایا جاتا تھا۔ ایک تمدنی پروگرام کا انعقاد بھی ہوتا تھا۔ نومبر ۱۹۷۲ء میں کالج کے اسٹیج پر مجھے پہلی بار ایکٹنگ کرنے کا موقعہ ملا اور میری ایکٹنگ کو کافی سراہا گیا۔ اور یہاں سے ہوا آغاز میری اداکاری کا۔

اگلے ہی سال جموں گلاب بھون میں یوتھ فیسٹول کا انعقاد ہوا جہاں صوبہ جموں کے تمام کالجوں نے ڈرامہ کمپٹیشن میں حصہ لیا میں نے پونچھ کالج کی نمائندگی کرتے ہوئے کرشن چندر کا ڈرامہ ''دروازے کھول دو'' کھیلا جو کہ بٹوارے کے بعد رہائشی مسائل اور چھوت چھات پر مبنی تھا۔ اس ڈرامے نے فیسٹول میں تیسرا انعام

کچھ ان کے بارے میں:

نام: پردیپ کھنہ

ولدیت: ست پال کھنہ

پیدائش: 13 اکتوبر 1956۔ بمقام پونچھ۔

تعلیم: ایم اے۔ فلاسفی۔

پیشہ: ماسٹر (ایجوکیشن)

موجودہ پتہ: 156 محلہ شنکر نگر پونچھ۔

موبائل: 9419312303

جیتا جب کہ مجھے اس ڈرامے میں بہترین اداکاری کے لئے دوسرے انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔

۱۹۷۶ء میں اس فیسٹول میں صحافیوں کی زندگی اور ان کو درپیش مسائل پر مبنی خواجہ احمد عباس کا ڈرامہ ''بارہ بج کر پانچ منٹ'' کھیلا۔ جس کے لئے مجھے دوسرے سال بھی بہترین اداکار قرار دیا گیا۔ ڈگری کالج پونچھ نے ۱۹۷۷ء کے سالانہ جشن میں مجھے کالج کے بسٹ ایکٹر کے خطاب سے نوازا اور ۱۹۷۸ء میں پونہ آل انڈیا ایکٹنگ کمپیٹیشن کے لئے ریاست جموں وکشمیر کے ۲۰ طلباء کو منتخب کیا گیا۔ میں نے پونچھ کالج کی نمائندگی کی وہاں پر جموں وکشمیر کی طرف سے کمیٹی نے مجھے تمام ایکٹرز کی سکریننگ کے بعد فائنل مقابلے کے لئے اسٹیج پر اتارا۔ جون ۱۹۷۸ء میں میں نے ریاست جموں وکشمیر کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک مونو لاگ پلے کر کے آل انڈیا کمپیٹیشن جیتا۔ اسی دوران ۱۹۷۶ء میں میرا رابطہ ماسٹر کرتار چند سے ہوا اور میں نے سرسوتی سنگیت کلا کیندر میں بطور ایکٹر شمولیت کی، اس کلا کیندر میں ایکٹنگ کے ساتھ ساتھ میں نے بطور کمپیئر یر بھی کام کرنا شروع کر دیا یہ کلا کیندر اُس وقت صرف فوج کے لئے تفریحی پروگراموں کا انعقاد کرتا تھا۔ جس میں مجھے ایک عام فوجی سے لیکر چیف آف دی آرمی اسٹاف کی شریکِ حیات کو محظوظ کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ ۱۹۷۸ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے میں اُتر پردیش کے شہر میرٹھ چلا گیا۔ جہاں پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ تھیٹر بھی کرتا رہا۔ ۱۹۸۱ء میں میں وارڈن گوجر بکروال ہوسٹل پونچھ شیخ سجاد حسین کے رابطے میں آیا۔ اور گوجر ہوسٹل کے طلباء کو لے کر شیخ سجاد صاحب کے اصرار پر تھیٹر کے لئے سرگرمیاں شروع کر دیں۔ مسلسل پندرہ سال تک وہاں پر میں نے جناب نور محمد نور اور دیگر ڈرامہ نگاروں کے درجنوں ڈرامے اسٹیج کئے۔ گوجر ہوسٹل میں سینکڑوں تمدنی پروگراموں میں مجھے اداکاری کی ایک عام آدمی سے لیکر وزیرِ اعلیٰ ریاست جموں وکشمیر ڈاکٹر فاروق عبداللہ، مادرِ مہربان، راجیش پائلٹ اور ان گنت سیاسی وسماجی شخصیات کو محظوظ کرنے شرف حاصل ہوا۔ مگر میرے اندر کا ایکٹر اس سب کے باوجود مطمئن نہ تھا۔ کیونکہ ڈرامے سے اس دوران میں بالکل کٹ کر رہ گیا اور پونچھ میں ایکٹروں کی کمی کے باعث ڈرامہ کھیلنا ناممکن تھا۔ چنانچہ میں نے ۱۹۸۸ء دوردرشن سرینگر اور ریڈیو کشمیر جموں سے بطور ڈرامہ ایکٹر اُردو اڈیشن پاس کیا اور ریڈیو وٹیلی ویژن کے ڈراموں میں مصروف ہوگیا۔ اسی سال مڈل اسکول سرنکوٹ میں منعقدہ ایک پہاڑی پروگرام میں میری ملاقات جناب ظفر اقبال منہاس سے ہوئی۔ پہاڑی کے تئیں اس نوجوان کا جنون دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ یہ میری بھی مادری زبان ہے۔ وہاں پر جناب ایوب شبنم اور کے ڈی مینی کے خیالات بھی سنے۔ ان حضرات کی زبان کے تئیں سنجیدگی اور اس کے ساتھ ہو رہے سوتیلے سلوک بارے بھی جانکاری حاصل ہوئی اور میں نے کلبیر سنگھ انجانا، خورشید راتھر اور پریم پرکاش کے تعاون سے بارڈر ہلز کلچرل کلب کو تشکیل دے کر پہاڑی زبان کے لئے کام کرنا شروع کر

دیا۔ پہاڑی فوک، اور پہاڑی ڈرامہ پر میں نے خاص توجہ دی۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو اس وقت انٹرنل سیکورٹی منسٹر مرحوم راجیش پائلٹ نے آل انڈیا ریڈیو پونچھ کا افتتاح کیا اور ضلع پونچھ میں الیکٹرانک میڈیا کا جنم ہوا۔ اور میں نے ۶، اکتوبر ۱۹۹۴ء سے بطور پہلے ریڈیو اناؤنسر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس بیچ مسلسل دس سال تک خبروں کے شعبہ کے ساتھ بھی جڑا رہا۔ مگر پہاڑی موسیقی اور ڈرامہ بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے اسی سال دوردرشن جموں کی بھی ابتدا ہوئی، میں نے اپنی تمام تر توجہ الیکٹرانک میڈیا کی طرف مبذول کرتے ہوئے پہاڑی اور گوجری لوک ادب کو محفوظ کرنے کی کوششیں تیز کر دیں اس دوران جناب پرویز مانوس، کے ڈی مینی اور اصغر علی کے کئی ایک پہاڑی اور گوجری ٹیلی ویژن سیریل دوردرشن کے لئے کئے۔ اسکے علاوہ پونچھ شہر میں ریاستی، قومی اور بین الاقوامی شہرت یافتہ گلوکاروں کے پروگراموں کی کمپیئرنگ کا شرف بھی ناچیز کو حاصل ہوا۔ جن میں کیلاش مہرہ، کلپنا کیسر، دیپالی واطل، سورج سنگھ، شام ساجن، وجے ملا، برکت علی صدو، سروجیت کور، اقبال افزال قوال، سید فرید صابری اور پورن چند پیارے لال گورو کی وڈہالی جیسے نامور گلوکاروں کے نام شامل ہیں۔

چونکہ گزشتہ بیس سال سے میں پونچھ میں قومی تقریبات کی کمپیئرنگ بھی کرتا چلا آرہا تھا جس کے پیش نظر ضلع انتظامیہ نے میری ادبی خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے ۲۶ جنوری ۲۰۰۰ء میں تب کے وزیرِ صحت نے مجھے ایک شال اور ایک توصیفی سرٹیفکیٹ دے کر اعزاز بخشا، ۱۹۹۸ء میں پونچھ میں گزشتہ پچاس سالوں کے دوران فوج کی خدمات پر مبنی گولڈن جوبلی لنک اپ ڈے کے موقعہ پر میں نے ایک لائٹ اینڈ ساؤنڈ پروڈکشن کی، فوج کے تئیں پچیس سالہ خدمات اور اس پروگرام کی تیاری کے لئے مجھے جی او سی ۲۵ انفنٹری ڈیویژن جناب وائی سی یادو نے اعزاز بخشا اور جی او سی جناب اے ایس سیکوں نے بھی گزشتہ ۳۰ سالوں کے دوران فوج کی تفریح مہیا کرنے کے عوض مجھے آرمی لیٹر آف ایپریسیشن عطا کیا۔

آج جبکہ سیٹلائٹ ٹیلی ویژن کا زمانہ ہے اور خلاء سے ہم پر کلچرل حملہ ہو رہا ہے اور ہماری نئی نسل خاص کر بچے اپنے تہذیب و تمدن اور مادری زبان سے بے خبر ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے میں آج کل میں ریڈیو کے ذریعے بچوں کو اپنی مادری زبان پہاڑی کے تئیں بیدار کرنے کے لئے آل انڈیا ریڈیو پونچھ سے ۴۵ منٹ کا ہفتہ وار پروگرام ''نونہال'' پروڈیوس کر رہا ہوں۔ جو ہر منگل کے روز ریڈیو سے نشر ہوتا ہے۔ اس پروگرام کے ذریعے بچوں کو پہاڑی ادب اور پہاڑی لوک رنگ و پہاڑی ثقافتی ورثہ سے واقف کرانے اور ساتھ ہی میاں محمد بخش صاحب کے لافانی کلام'' سیف الملوک'' کو زبان زد عام کرنے میں مصروف کار ہوں۔ انشاء اللہ زندگی نے وفا کی تو اس

زبان کے فن، موسیقی، ڈرامے اور لوک ورثہ کو سیٹلائٹ ٹیلی ویژن کے ذریعے برصغیر کے ناظرین تک پہنچانا میرے مستقبل کے منصوبوں میں شامل ہے۔ آخر پر میں خراج عقیدت کے طور پر کہوں گا کہ ۱۹۵۴ء میں سردار درشن سنگھ اکالی نے پنجابی ساہتیہ سبھا پونچھ، ۱۹۷۲ء میں جناب محمد ایوب شبنم اور ان کے رفقا نے بزم ادب سرنکوٹ جو بعد میں کرشن چندر میموریل بزم ادب کے نام سے مشہور ہوئی۔ ادبی تنظیموں کی تشکیل دے کر ادب کو زندہ رکھا۔ ماسٹر کرتار چند نے سرسنگھم اور پھر سرسوتی سنگیت کلا کیندر کے نام سے کلب بنا کر سنگیت کی خدمت کی۔ تاریخی پیش کش ''ادبیاتِ پونچھ'' کے لئے کی کاوشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں جناب محمد ایوب شبنم کو مبارک باد دیتا ہوں انہوں نے ماضی میں بھی ہر ادبی تنظیم اور ادباء وشعرا کی حوصلہ افزائی کر کے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس کے لئے ادب نواز طبقہ ہمیشہ انہیں یاد رکھے گا۔

کچھ ان کے
بارے میں:

نام: نذیر حسین قریشی

قلمی نام: نذیر قریشی

ولدیت: قاضی محمد بدر دین قریشی

پیدائش: 19 مارچ 1940ء بمقام موضع گورسائی، تحصیل مہنڈر۔

تعلیم: بی اے۔ بی ایڈ

پیشہ: ریٹائرڈ ضلع ایجوکیشن پروجیکٹ آفیسر۔

ادبی زندگی کا آغاز: زمانہ طالب علمی سے۔

ذریعۂ اظہار: اُردو، انگریزی، پہاڑی

موجودہ پتہ: موضع گورسائی تحصیل مہنڈر ضلع پونچھ

جشن عید

نذیر قریشی

غُرہ شوال اے نورِ نگاہِ روزہ دار
آ کہ تھے تیرے لئے مسلم سراپا انتظار
تیری پیشانی پہ تحریر پیام عید ہے
شام تیری کیا ہے صبح عیش کی تمہید ہے

عید پیام مسرت وشادمانی ہے۔ عید تحفۂ ربانی ہے۔ سرود و انبساط کے لمحے، کیف آگیں ساعتیں، عرش سے فرش تک نُور و نکہت، نفس نفس اُمید و رجائیت۔ وصل دلبراں۔ فصل صد بہاراں۔ ہجر وفراق کے سمٹتے سائے۔ باہم ملاقاتوں کے پھیلتے سائے۔ مصافحے۔ معانقے۔ مبارکبادیاں۔ طرب انگیزیاں۔ زرق برق لبادے۔ لذیز کھانے۔ شیریں مشروبات، قہقے۔ قہقہے۔ لمس لمس بُو دوباس۔ اُمیدیں۔ آرزوئیں اور تمنائیں، مچلتے ارمان۔ دہکتے دل وجان۔ ایک عالم بقعۂ نور اور اک جہان کیف وسرور لیکن اب کی بار۔
عید آئی ہے سلگتی ہوئی یادیں لے کر

آج پھر اپنی اُداسی پہ ترس آیا ہے

کچھ وہ بھی ہیں جو حرماں نصیب ہیں، سوختہ ساماں ہیں، اُن کی ذات بلکہ ان کی ساری کائنات بھی لٹی ہوئی ہے۔ جن کے پیاروں نے نہ آنے کی قسم کھائی ہے۔ یادِ رفتگاں سے بھی جن کی بات نہیں بنتی۔ جن کی حسرت نہیں مٹتی، جنکی دنیا نہیں بستی۔ بھری دنیا میں بھی تنہائی جنہیں ڈستی ہے۔ نگاہیں کسی کو ڈھونڈتی ہیں۔ کھوئی کھوئی سی آنکھیں ڈوبتی نبضیں، اکھڑتی سانسیں، سلگتی آہیں، چھلکتی آنکھیں، سراپا یاس، اُداس، زبانِ بے زبانی سے کہہ رہے ہیں۔

پیامِ عیش ومسرت ہمیں سناتا ہے ہلال عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

نظامِ قدرت کی کارستانیاں دیکھئے کہ سال گزشتہ کی عید سے آج تک اولادِ آدم ہی کیا کیا گزری ہے، سمندر کا مزاج برہم تو بپھری ہوئی لہروں نے سونامی نام پایا۔ قہر آلود سونامی نے آن واحد میں لاکھوں جانوں کو نگل لیا۔ شہر محو، فلک بوس عمارات زیر آب۔ نہ جانے ساحلی علاقوں کی قیامتِ صغریٰ کیونکر برپا ہوئی۔ ایک دنیا اشکبار۔ اک جہاں سوگوار۔

ابھی اس جانکاہ صدمے سے سنبھلے بھی نہ تھے کہ کشمیر کے زلزلہ نے زمین ہی نہیں دل بھی ہلا دیئے۔ پلک جھپکتے ہی شہر اور دیہات ملبے کا ڈھیر، انسان حیوان لقمۂ اجل۔ بستیاں ویران۔ آبادیاں قبرستان۔ باپ سے بیٹا جدا۔ بھائی سے بھائی جدا۔ بچے بے سہارا۔ ہاہا کار۔ چیخ و پکار۔ نہ مکان نہ مکین۔ نہ سر پر سائباں نہ کوئی احوال پرساں۔ فرد سے سماج تک اور پھر ملک وملت تک ایک عجیب صورتِ حال ہے کہ جس میں دیوالی اور عید آئی ہے۔ اور دلی کا دل دہلا دینے والے دھماکوں کا تحفہ ساتھ لائی ہے۔

آج پھر چرخ کہن کی سبز چادر عید کا چاند ہم کو رلانے آیا

لیکن کارگہہِ حیات میں ایسا سو بار ہوا ہے اور بار بار ہوگا۔ حیات بے ثبات سہی لیکن اس کا قافلہ رواں دواں رہے گا۔ اسے پیمانۂ امروز وفردا سے نہیں ناپا جاسکتا۔ یہ قدرت کا عمل مسلسل ہے۔

تو اسے پیمانۂ امروز وفردا سے ناپ جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی۔

حادثات تو رخسارِ حیات کا غازہ ہیں۔ ہر فنا بقاء کا پہلو لئے ہوئے ہے بقول کسے۔

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی ہزاروں اٹھ گئے پھر بھی وہی رونق ہے محفل کی

اس لئے عید کا اصلی جوہر مٹ نہ جائے۔ اسکا سپرٹ مر نہ جائے۔ یہ سب بجا سہی لیکن عید تو سجدۂ شکر کا موقعہ فراہم کرتی ہے کہ بایں ہمہ ہمیں خدائے بزرگ وبرتر نے رمضان جیسی نعمت سے نوازا۔ حمد وثنا قیام وقعود، رکوع

وجود، ذکر واذکار۔صلاۃ وسلام، تسبیح وتحلیل اور تلاوتِ قرآن اور مطالعۂ فرقان کے ساتھ توبہ کا در کھلا رہا۔اور پھر فطرہ کی ادائیگی سے یتیموں، بیواؤں، معذوروں اور بے سہاروں کی عید کو یقینی بنا کر عید گاہ پہنچے کی بارگاہِ آخر پناہ میں شکر ادا کر سکیں کہ اب ذوالجلال ملتِ اسلامیہ کو عیدین کے اجتماعات سے اتحادِ ملی میں پختہ کر دے۔تاکہ امتِ مسلمہ میں قرن اول کا جذبۂ اُخوت بیدار ہو جائے۔اتحاد بین المسلمین بلکہ عامتہ الناس ہی ہر زہر کا تریاق ہے، ہر درد کی دوا ہے۔ہر زخم کا مرہم ہے۔اللہ ہمیں ان اوصاف کا حامل بنا دے۔آمین۔رہا معاملہ عید کے تحفوں کا تو

میں نے چاہا کہ تجھے عید پہ کچھ پیش کروں — جس میں تابندہ ستاروں کی چمک شامل ہو
جس میں گزرے ہوئے لمحات کی تصویریں ہوں — جس میں انجام جزیروں کی مہک شامل ہو

لیکن یہ نہ ہو سکا۔سکھ کے سانسوں کا موسم نہیں۔دل کی شادابی کی رُت نہیں۔روح کو چین نہیں۔جی کو قرار نہیں۔اس لئے۔

کتنی پلکوں سے فضاؤں میں ستارے ٹوٹے
کتنے افسانوں کا عنوان بنا عید کا چاند
اور جانے والے کبھی نہیں آتے جانے والوں کی یاد آتی ہے۔
پھر بھی وجہ ہے انتظار کی کہ کوئی آئے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو بھی
ہم گلے ملنے کی رسموں کا بھرم رکھ لیں گے
وہ نہ آئے تو لپٹ لیں گے دیواروں سے
مجبوریٔ حالات، افسردگی جذبات کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے لیکن عید تو بہر حال عید ہے، ہاں۔
عید آزاداں شکوہِ ملک ودین
عید مجبوراں ہجوم مومنین

☆☆☆

کچھ ان کے
بارے میں:

نام: دوشنت چودھری۔

ولدیت: کانشی ناتھ پوری

قلمی نام: چودھری۔

پیدائش: 9ستمبر اکتوبر 1944ء

بمقام پونچھ۔

تعلیم: بی اے۔بی ایڈ

ادبی زندگی کا آغاز: دوران کالج

پیشہ: ریٹائرڈ ماسٹر محکمۂ تعلیم

ذریعۂ اظہار: اُردو، انگریزی

موجودہ پتہ: محلہ کمال خان وارڈ نمبر 3پونچھ (جموں وکشمیر)

مندر کے دیوتا

دوشنت چودھری

دھنو گندگی کے ڈھیر پر ایک نکھرتا ہوا کنول تھی، اُس نے سماج کے ایک ایسے ادنیٰ اور نیچ طبقے میں آنکھ کھولی جسے آج بھی ہندو سماج کے ٹھیکیدار نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی جس کے ذرا سے چھو جانے سے کھوکھلے سماج کی ساری بنیادیں ہل جاتی ہیں اور ہندو دھرم کے سورج کو شکوک کے بادل گھیر لیتے ہیں۔ قدرت نے جہاں نفرت اور حقارت کی بھیک اس کی جھولی میں بھر دی وہاں اس کے سر سے باپ کی شفقت کا سایہ بھی اٹھالیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی زندگی گھر کی چہار دیواری کے اندر نہیں بلکہ شہر کے گلی کوچوں اور فٹ پاتھوں پر پروان چڑھی۔ مگر ان کڑی آزمائشوں کے بعد بھی اُس نے کردار کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ زندگی کے سولہویں زینے پر قدم رکھتے ہی دھنو کا دامن کرپارام کے پلّو سے باندھ دیا گیا۔ کرپارام بھی اسی طبقے کا ایک خوبرو نوجوان تھا جس نے ذات پات کی زنجیروں کو توڑ کر کسی نہ کسی طرح دسویں پاس کر لی تھی اور پھر ذریعۂ معاش کی

تلاش میں حکومت کے دفاتر پر دستک دی۔ مگر اُس کی نیچی ذات اس کے لئے سنگِ راہ ثابت ہوئی، وہ دردر بھٹکا مفلسی اور بد نصیبی نے اس کے چاروں طرف کانٹے بکھیر دیئے اور جب اسکی آشائیں نامرادی کے طوفان میں بہہ گئیں۔ تو کرپارام نے مجبوراً اپنے باپ دادا کا پیشہ اختیار کیا۔ شادی کے بعد دھنو کی گود میں تین چار پھول کھلے مگر غربت اور افلاس کے بھیانک اژدھوں نے ایک ایک کر کے سب کو نگل لیا۔ ان کی اجڑی ہوئی گود میں اب صرف ایک ننھی سی کلی رہ گئی تھی۔ جسے دیکھ کر دھنو تلخ یادوں کو کچھ دیر کے لئے بھول جاتی۔ منّا جو اسکی امیدوں کا واحد سہارا تھا۔ جسے دیکھ کر دھنو کے دل میں مامتا کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔ طوفان کی زد میں آیا ہوا انسان تنکے میں زندگی کے آثار دیکھ لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح دھنو کی ممتا اور مشقت کا واحد مرکز منّا رہ گیا تھا۔ اسی منّے کی ہنسی میں اسکی کائنات رقص کرتی نظر آتی اور اس کی نم آلود آنکھوں میں اسے ساری قدرت آنسو بہاتی نظر آتی۔

لیکن ایک رات ٹھیک گیارہ بجے موت نے ایک بار پھر دھنو کے دروازے پر دستک دی۔ چاروں طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ اچانک کمرے میں ایک ننھی سی چیخ فضا کو مرتعش کر گئی۔ دھنو دوڑتی ہوئی اپنے خاوند کے پاس آئی مگر خوف و ہراس کی وجہ سے اسکی گھگی بندھ گئی تھی۔ کرپارام نے منّے کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ارے اس کا جسم تو تنور کی مانند تپ رہا ہے۔ ذرا جلدی سے قہوا بنا کر لانا۔'' خوف و دہشت کی ماری دھنو نے آن کی آن میں آگ جلائی، چولھے پر پانی چڑھایا اور پھر کھانڈ نکالنے کے لئے لپک کر الماری کھولی۔ مگر کھانڈ تو کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اور خالی ڈبہ منہ کھولے اُس کی بےبسی کا مذاق اُڑا رہا تھا۔

''دھنو......!'' کرپارام کی آواز آئی۔

''آئی.....!'' دھنو نے گرم پانی گلاس میں انڈیل دیا۔ اور گلاس خاوند کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''لیجئے!''

کرپارام نے گرم پانی کی دو چار بوندیں بچے کے منہ میں ڈال دیں بچہ دودھ سمجھ کر خاموش ہو گیا۔ دھنو نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ مگر صبح کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی اس نے غم واندوہ کا لبادہ اتار پھینکا۔ رات کی مایوسی کی جگہ اب سحر کی شگفتگی نے لے لی۔ دھنو نے نہا دھو کر کپڑے بدلے اور منّے کو گود میں اٹھائے ہوئے اپنے خاوند سے بولی'' میں مندر جا رہی ہوں منّے کو ساتھ لے کر!''

''مندر......؟'' کرپارام کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ''ہندوؤں کے پوتر استھان پر۔ نہیں......''

''نہیں'' دھنو اپنے خاوند کو ٹوکتے ہوئے بولی ''میں جا رہی ہوں بھگوان کے استھان پر''۔

''دھنو......'' کرپارام احتجاجاً چیخا'' آسمان پر مت تھوکو۔ تمہارا منّا ایک گندا پھول ہے جسے مندر کے بارے میں

پرویانہیں جاسکتا؟''

''مگر بھگوان کی نظر میں تو سب برابر ہوتے ہیں۔ وہ بھگوان کیسا جو اونچ نیچ میں یقین رکھے!''

''نہیں دھنو! مندر میں رکھے گئے بھگوان اونچی ذات کے ہوتے ہیں۔ وہ ہمارا ہاتھ لگنے سے اپنی ذات کھو جاتے ہیں۔ وہ بھی ہم غریبوں پر ترس نہیں کھاتے اس لئے میری سنو مت جاؤ، پانی میں آگ لگانے سے کچھ نہیں بنے گا لوٹ آؤ''۔ ''مگر دل کی تسلی کے لئے مندر جانا کون سا پاپ ہے، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ بھگوان کی آشیرواد سے منا ٹھیک ہو جائے گا''۔ یہ کہہ کر دھنو دروازے سے باہر نکل گئی۔ چند ہی منٹ بعد دھنو مندر کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ مندر کا پجاری مردوں کی طرح سو رہا تھا، دروازے کی ٹھک ٹھک سن کر وہ اچانک چونک پڑا۔ ''کون ہے بھئی! اتنی سویرے''۔

''بھگوان کے مندر میں سویرے نہیں تو پھر کب جاتے ہیں؟'' دھنو ہمت باندھتے ہوئے بولی۔

''لیکن پھر بھی اتنی جلدی کیوں''۔

''منا بیمار ہے اس کو ساتھ لائی ہوں آشیرواد لینے''۔

''اری دھنو! یہ تیرے باپ کا اسپتال تو نہیں یہ بھگوان کا گھر ہے جا میں دروازہ نہیں کھولوں گا اور سن تجھ جیسی ملیچھ عورت کے لئے تو مندر کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہیں'' پجاری دھنو کی آواز پہچانتے ہوئے بولا۔

''تو گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلے گا'' دھنو جذبات میں آ کر دروازے پر جھپٹ پڑی۔ دروازہ ٹوٹ کر اندر جا گرا۔ دھنو سیدھے بھگوان کے چرنوں میں اپنے بیمار بچے کو رکھتی ہوئی بولی ''منے کی زندگی کا چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ دیا کرو بھگوان میری اجڑی ہوئی گود اب خزاں میں مت بدلو''۔ وہ ابھی پوری طرح پرارتھنا بھی نہ کر پائی تھی۔ کہ ایک مضبوط لاٹھی اس کے سر پر آن پڑی۔ سر پھٹ گیا اور خون کی دھار زخم سے فوارے کی شکل میں نکل کر سیدھی مورتی کے چہرے پر گری۔ پجاری چند آدمیوں کو ساتھ ملا کر مندر میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ''میں نے ایک بار نہیں ہزار بار اس نیچ عورت کو روکا کہ وہ مندر میں داخل نہ ہو۔ مگر اس کمبخت نے مندر کا دروازہ توڑ کر بھگوان کو بھرشٹ کر دیا''۔

''پجاری صاحب'' دھنو اپنے زخم پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی ''تمہارا یہ بھگوان کیسا ہے جو ایک معصوم بچے کے ہاتھ لگنے سے اپنی ذات کھو دیتا ہے جو اونچ نیچ میں فرق رکھتا ہے، جو غریبوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو جیون کی جیوتی کو بجھا دیتا ہے مگر اسے روشن نہیں کر سکتا۔ مجھے معاف کرنا پجاری جی! میں نہیں جانتی تھی کہ دھرم کے ٹھیکیداروں نے بھگوان کو بھی خرید لیا ہے، میں اپنے منے کو واپس لے جا رہی ہوں اُس بھگوان کے پاس جو مندروں کی قید سے آزاد ہے'' یہ کہہ کر وہ اپنے منے کی طرف جھکی تو وہ سُن ہو گئی وہاں تو منا سرد ہو چکا تھا، منے کی آتما بھگوان سے جا کر مل گئی تھی! اونچ نیچ کی تمام دیواریں توڑ کر ......

☆☆☆

کچھ ان کے
بارے میں:

نام: عبد السلام

قلمی نام: بہار

ولد: خواجہ غلام احمد راتھر

پیدائش: پوشانہ، تحصیل سرنکوٹ۔

تعلیم: ایم اے اُردو۔سیاسیات۔بی ایڈ۔فاضل دینیات۔

تصانیف: متعدد دینی کتابچے۔افسانوی مجموعہ زیر ترتیب۔

پیشہ: ریٹائرڈ زونل ایجوکیشن آفیسر۔

ذریعۂ اظہار: اُردو

موجودہ پتہ: بھروٹ، تھنہ منڈی، راجوری

بُوٹ پالش

عبدالسلام بہار

ایک چھوٹی عمر کا لڑکا پھٹے پُرانے کپڑے پہنے لمبے لمبے بال مگر پریشاں چہرے پر زمانے کی داستانِ غم لئے ہوئے ٹرین میں داخل ہوا۔اس کے خشک ہونٹ بھوک اور پیاس کی علامت تھے، اسکے چہرے سے حسرت ویاس کے نہ مٹتے ہوئے نشان دکھائی دے رہے تھے۔اس کی اندرونی کشمکش اس کے چہرے سے عیاں تھی۔اور اُس کی زبان طوطے کی طرح چل رہی تھی ''بوٹ پالش۔شیشے کی طرح چمکائے گا۔کریم پالش کرے گا'' اُس نے سب باتیں ایک ہی سانس میں کہہ ڈالیں۔اسکی آنکھوں سے بیکسی اور مفلسی و ناداری کے آثار ٹپک رہے تھے۔

یہ بھگوان داس تھا جسے باپ چند سال پہلے بے سہارا چھوڑ گیا تھا۔اب اس کی ماں اور ایک بہن کا ذریعۂ معاش صرف یہی دس پیسے میں بوٹ پالش تھی وہ کونے میں مایوس صورت بنائے کھڑا تھا پھراس نے بائیں جانب گھومتے ہوئے وہی آواز دی۔'' بابو جی! بوٹ پالش کرے گا۔بوٹ

پالش''۔اس کی آواز سے ایک خاص درد معلوم ہوتا تھا میں نے اپنے بوٹ کی طرف اشارہ کیا۔بھگوان داس نے جلدی میں ایک پھٹا پرانہ بیگ کھولا اور ایک پرانہ برش نکال کر جلدی جلدی بوٹ کی گرد جھاڑنے لگا۔ادھر ٹرین کا انجن دھک دھک کرنے لگا اور دھواں تیزی سے اٹھ کر فضا کی بلندیوں میں اُڑنے لگا۔میری نظر اُس کے پھرتیلے ہاتھوں پر لگی ہوئی تھی جو بوٹ پر فنکارانہ اعتماد کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔اتنے میں وہ بولا'' بابو جی دیکھو بوٹ چمک گیا'' میں نے دس پیسے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔میرے ساتھیوں نے بھی اپنے اپنے بوٹ پالش کروائے۔اس کے دونوں ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ٹرین نے پہلی سیٹی بجائی۔۔سواریاں ٹرین میں داخل ہونے لگیں۔اس کے چہرے سے ابھی بھی پسینہ بہہ رہا تھا، اسکے ساتھ ہی بھگوان داس کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہونے لگی، میں پوری توجہ سے اس چھوٹے لڑکے کے اس فن کو دیکھ رہا تھا اور حیران تھا۔اس کے دونوں ہاتھ مشغول اور زبان سے پکارتا تھا۔''بوٹ پالش۔کریم لگائے گا'' میں نے پوچھا'' میاں کتنے پیسے کمائے آج ؟''یکا یک اُس کی مایوس نگاہیں اُوپر اٹھیں اور وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا'' آج کچھ نہ کمایا جا سکا،صرف یہ تیس پیسے ہیں۔مجھے آج صبح سے ہی پولیس سپاہی نے پکڑ کر بند کر رکھا تھا۔بہت مارا پیٹا،سارا وجود درد کر رہا ہے۔میں غلطی سے ایک یارڈ میں داخل ہو گیا تھا، بابو جی ابھی بھی بھوکا ہوں''۔

ٹرین تیزی سے سیٹیاں بجانے لگی سواریاں اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکی تھیں،ٹرین آہستہ آہستہ سرکنے لگی مگر بھگوان داس ابھی بوٹ پالش پالش پکار رہا تھا،اس نے یہ تیس پیسے ایک ہاتھ میں دبانے اور دوسرے ہاتھ میں سامان۔اور وہ قدم اٹھاتے ہوئے بھی مسلسل آوازیں دے رہا تھا۔اس کی مجبور نگاہیں تیزی سے سواریوں کے بوٹ اور ان کے اشاروں کی منتظر تھیں۔

چار بج چکے تھے۔ٹرین اسٹیشن سے چل پڑی۔بھگوان داس جلدی میں دروازے سے نیچے اترنے لگا۔اس نے جوں ہی چھلانگ لگائی وہ تیس پیسے اس کی مٹھی سے اس ڈبے میں گر گئے اور وہ دھچکے سے آگے جا گرا۔ٹرین اپنی پوری رفتار پکڑ چکی تھی۔میری نظر بھگوان داس پر پڑی وہ گرد جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔اور مایوسانہ نگاہوں سے ریل کے ڈبے دیکھنے لگا۔اور میری نظر ان تین سکوں پر جا پڑی جو اس کے الھڑ ہاتھوں نے محنت سے کمائے تھے جن پر بھگوان داس اس کی ماں اور بہن کا فاقہ کھلتا۔ریل اب دور اپنی رفتار سے ہوا سینہ چیرتی جا رہی تھی اور میرے کانوں میں اب بھی بھگوان داس کی معصوم زبان سے نکلنے والے الفاظ''بوٹ پالش'' کی آواز گونج رہی تھی۔

☆☆☆

چراغ حسن حسرتؔ

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں
زُلف کی، رُخسار کی باتیں کریں
اُن کے کوچے میں جو گزری ہے کبھی
سایۂ دیوار کی باتیں کریں
پھول برسائیں بساطِ عیش پر
روزِ وصلِ یار کی باتیں کریں
نقدِ جاں لے کر چلیں اُس بزم میں
مصر کے بازار کی باتیں کریں
آخری ساعت شبِ رخصت کی ہے
آؤ اب تو پیار کی باتیں کریں

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے
یہ کس کے آستاں پہ مجھ کو ذوقِ سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے
محبت تیرے جلوے کتنے رنگا رنگ جلوے ہیں
کہیں محسوس ہوتی ہے کہیں معلوم ہوتی ہے
جوانی مٹ گئی لیکن خلش دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے
امیدِ وصل نے دھوکے دیئے ہیں اس قدر حسرتؔ
کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

اُن سے پہلی سی ملاقات گئی
وہ جو اک بات تھی وہ بات گئی
رات کی بات کا مذکور ہی کیا
چھوڑیئے رات گئی بات گئی
اب کے برسات میں بھی پی نہ سکے
ہم پہ روتی ہوئی برسات گئی

اے عشقِ جنوں پرور اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دعا ہوتا
اُمید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا
غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سُنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سُنا ہوتا

شاعر کے بارے میں

نام: چراغ الحسن۔ **قلمی نام:** حسرتؔ۔ **پیدائش:** بمیار، اڑی، بارہمولہ۔ **ولدیت:** شیخ بدر الدین۔ **تاریخ وفات:** 26 جون 1955۔ لاہور۔ **تعلیم:** ایف۔ اے۔ **ذریعۂ اظہار:** اُردو۔ **پیشہ:** پہلے اسلامیہ اسکول میں مدرس رہے بعد ازاں فوج میں میجر اور قیام لاہور کے دوران صحافت کے ساتھ وابستہ رہے۔ متعدد تصانیف نثر و نظم۔

تحسینؔ جعفری

عارضِ سیمیں پہ خم زُلف رسا ہونے تو دے
جس پہ سب مرتے ہیں پیدا وہ ادا ہونے تو دے
دل کے آئینے میں آئے گی نظر سب کائنات
پاکبازی کی ذرا اس پر جلا ہونے تو دے
رازِ ہستی تجھ پہ ہو جائے گا خود ہی آشکار
نورِ حق سے خانۂ دل کی ضیاء ہونے تو دے
کلفتیں مٹ جائیں گی سب دور ہوگا رنج و غم
اپنے قلبِ زار کو درد آشنا ہونے تو دے
ضوفشاں شمعِ امامت ہوگا تحسینؔ صبحدم
ظلمتِ شب کو ذرا سیماب پا ہونے تو دے

اٹھایا پردۂ شرم و حیا فیشن پرستی نے
مٹایا نقشۂ صدق و صفا فیشن پرستی نے
نہ پاس قوم ہے باقی نہ عزت باپ داد کی
عجب مدہوش ہم کو کر دیا فیشن پرستی نے
لگے تہذیب کہنے ہر طرح کی بے حیائی کو
ذلیل اب کے ہمیں تحسینؔ کیا فیشن پرستی نے

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: سرفراز حسین خان۔ پیدائش: 2 جون 1908ء، بمقام منگناڑ، پونچھ۔ ولدیت: محمد خان۔ قلمی نام: تحسین جعفری۔ تعلیم: میٹرک۔ پیشہ: ریٹائرڈ ایڈیٹر ہفت روزہ "کشمیر" (پاکستانی کشمیر) وزارت اطلاعات و نشریات حکومت پاکستان۔ تصانیف: سرمایۂ نجات۔ بہتّر پیاسے۔ مسک۔ شبیرؓ و اقبالؒ، سچی کہانیاں، معلون۔ ریاضی۔ ذریعۂ اظہار: اُردو، پنجابی، سرائیکی، کشمیری، گوجری وغیرہ۔

پرتپال سنگھ بیتاب

راستے تو کئی کھلے ہیں میاں
ہم ہی کچھ بند ہو چلے ہیں میاں

تم جہاں ہم کو ڈھونڈتے ہو ابھی
ہم وہاں سے گزر چکے ہیں میاں

سمت کیسی یہاں سفر کیسا
بھیڑ میں ہم بھی چل رہے ہیں میاں

تم کسی نام سے پکارو ہمیں
ہم تو پہچان کھو چکے ہیں میاں

دوسروں سے خود اپنے کوچے میں
ہم پتہ اپنا پوچھتے ہیں میاں

اپنی تاریکیوں میں لوٹ آؤ
قمقمے سارے بجھ چکے ہیں میاں

دشت ویران پھر سے ہے بیتابؔ
قافلے شب کے اٹھ گئے ہیں میاں

دُنیائے رنگ و بُو سے کنارا نہیں کیا
اچھا کیا جو ہم نے دکھاوا نہیں کیا

ہم جسم کو بچا نہ سکے گرد سے مگر
یہ تو ہوا کہ روح کو میلا نہیں کیا

بس ڈوبتے ابھرتے رہے ہیں تمام عمر
ہم نے عبور کرب کا دریا نہیں کیا

اوروں پہ اپنی ذات کی ترجیح تو بجا
ہم نے خود اپنے ساتھ بھی اچھا نہیں کیا

چپ چاپ باہر آگئے رسّہ کشی سے ہم
ظاہر کسی پہ اپنا ارادہ نہیں کیا

کچھ دھوپ اس کو چیر کے ہم تک پہنچ گئی
کچھ ہم پہ اُس درخت نے سایہ نہیں کیا

بیتابؔ ہوشیار سبھی کرتبوں میں تھے
کچھ بات تھی کہ ہم نے تماشا نہیں کیا

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: سردار پرتپال سنگھ۔ قلمی نام: بیتابؔ۔ تعلیم: ایم اے سیاسیات۔ ایل ایل بی۔ تصانیف: پیش خیمہ (شعری مجموعہ 1981ء)۔ سراب در سراب (شعری مجموعہ 1984) خود رنگ (شعری مجموعہ 1995ء) موج ریگ (غزلیات) 2004ء۔ پیشہ: ملازمت، کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروسز۔ ذریعۂ اظہار: اُردو۔ موجودہ پتہ: نشیمن، مکان نمبر 188 چھنی ہمت، جموں (جموں و کشمیر)۔

ڈاکٹر لیاقت جعفری

مقتل کی قسمت میں لاشے
خاموشی الفاظ تراشے
ہنسنا رونا جینا مرنا!
ایک مداری لاکھ تماشے
ہم سادے اور دنیا والے
سوداگر عیار مہاشے
مجھ سے خوشبو پوچھ رہی ہے
میں نے کتنے پیڑ تراشے
دریا کا مطلوب سمندر
تشنہ لب دریا کو تلاشے
''جذبے'' چاند ستارے سورج
''سونا چاندی'' تولے ماشے
لب شیریں جیوں شہد کٹورا
چینی، گڑ اور کھیر بتاشے

میں خود تک لوٹ آؤں راستہ کوئی نہیں دے گا
مجھے اس شہر میں میرا پتہ کوئی نہیں دے گا
مری ویرانیو؟ کس نے تمہیں آباد کرنا ہے
مری خاموشیو؟ تم کو صدا کوئی نہیں دے گا
سبھی تقسیم کر لیں گے خداؤں کے قبیلے کو
مگر مجھ کو کبھی میرا خدا کوئی نہیں دے گا
ہماری کشتیاں لہروں کی زد پہ چھوڑ دیں گے سب
ہمارے بادبانوں کو ہوا کوئی نہیں دے گا
میں اس امید پر اٹھا تھا اس بستر کے پہلو سے
کہ اب بیمار کو اتنی دعا کوئی نہیں دے گا
مسیحائی کے سب اعزاز میرے نام کردیں گے
مرے ہاتھوں کو لیکن معجزہ کوئی نہیں دے گا
میں گرتا ہوں اگرچہ تھامنے والا نہیں کوئی
میں چلتا ہوں اگرچہ راستہ کوئی نہیں دے گا
اُسے بھی بخش دے گا اُس کے ہونے کے تقدس میں
مجھے بھی میرے ہونے کی سزا کوئی نہیں دے گا
یہ بچپن استعارہ ہے تیری بے احتیاطی کا
تمہارے ہاتھ میں اب آئینہ کوئی نہیں دے گا
بقول حضرت غالب یہ نمرودی خدائی ہے
مجھے بدلہ مری نیت کا کیا کوئی نہیں دے گا

شاعر کے بارے میں

نام: لیاقت علی جعفری۔ قلمی نام: لیاقت جعفری۔ پیدائش: 18 فروری 1971ء۔ بمقام وارڈ نمبر 2 پونچھ۔ تعلیم: ایم اے اُردو۔ پی ایچ ڈی۔ ادبی زندگی کا آغاز: 1990ء۔ پیشہ: لیکچرر اُردو۔ ذریعۂ اظہار: اُردو۔ موجودہ پتہ: 243/A نزد پوسٹ آفس، پوسٹ آفس لین، نیو پلاٹ جموں (جموں و کشمیر)

فاروق مغل پرواز

رات کے پچھلے پہر مجھ میں کوئی ڈر جاگے
جاگتا ہے تو مری جان مکرر جاگے
آنکھ کھل جائے تو بدلی ہوئی دنیا دیکھوں
بند آنکھوں میں وہی روز کا منظر جاگے
دیکھ کر لفظ پسِ لفظ صداؤں کا سکوت
زرد ہونٹوں پہ کسی بول کا منتر جاگے
آج کی رات کوئی ہار نہ مانے خود سے
آج کی رات کوئی اپنے برابر جاگے
یا کوئی بات مرے سایۂ در اصل میں ہو
یا بھنور سیپ میں اُمید کا گوہر جاگے
اب کے ہاتھوں سے مرے کاش لکیریں پھسلیں
اور مجھ سا کوئی دن رات سے بڑھ کر جاگے

نہیں تھا کچھ بھی مری جان تشنگی کے بغیر
مرے وجود میں لیکن کبھی کبھی کے بغیر
مرا سخن، مرا لہجہ ہزار معنی ہے
مرے کہے پہ نہ جا میری ان کہی کے بغیر
ذرا سی بات پہ دنیا سے روٹھ جاؤں گا
پھر اُس کے بعد میں جی لوں گا زندگی کے بغیر
کوئی بھی مجھ میں ابھی لوٹ کر نہیں آیا
الجھ رہا ہوں اندھیروں سے روشنی کے بغیر
میں ایک ذات کو محسوس کرتا رہتا ہوں
کبھی کسی کے علاوہ کبھی کسی کے بغیر
میں جانتا ہوں کہ اب اس کے بعد کیا ہوگا
کہ ایک عمر گزاری ہے آگہی کے بغیر

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: فاروق خان مغل۔
قلمی نام: پرواز۔ پیدائش: 2 مئی 1971ء۔ ولدیت: جہانگیر خان۔ تعلیم: ایم ایس سی، پی ایچ ڈی۔ پیشہ: ملازمت (AIIMS)
ذریعۂ اظہار: اُردو۔ پہاڑی۔
موجودہ پتہ: غفار منزل، اسٹریٹ3، اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دھلی

آتے ہی تیرے جان مری جان میں آئے
وحشت ہے تو اب جامۂ انسان میں آئے
اب کون بتائے میرے خوابوں کی حقیقت
یوسفؑ سے کہو لوٹ کے کنعان میں آئے
ہر روز تعاقب میں چلی آئیں صلیبیں
ہر روز کلیسا میرے ایمان میں آئے
ٹوٹی ہوئی چھاگل میں مری پیاس پڑی تھی
سمجھے کہ خزانے میرے سامان میں آئے
ہم ایسے صحیفوں کی طرح ہیں جو ہمیشہ
جُزدان سے نکلے ہیں تو جزدان میں آئے
نہ تھے تو کہیں اور بھی موجود تھے ہم لوگ
ہم خواب کے پروردہ تھے امکان میں آئے

پھیلتی جسم کی زنجیر شرارے کی طرح
میں کہ تارا ہوں مگر ٹوٹتے تارے کی طرح
درمیاں ایک سمندر ہے ازل سے موجود
وہ کنارے کی طرح میں بھی کنارے کی طرح
مونا لیزا کی طرح وہ بھی حوالوں کے لئے
میں بھی اخبار کے بوسیدہ شمارے کی طرح
سُود در سُود ہوں کھاتے میں رقم کی صورت
اور انجامِ جواری کے خسارے کی طرح
میں کہ آغوشِ سمندر میں پڑا ہوں لیکن
نہ میں دریا کی طرح اور نہ دھارے کی طرح

شیخ خالد کرّار

ایک متحرک تجریدی پینٹنگ

اس کی آنکھیں
اُداس جھیلیں تھیں
اُس کا چہرہ جوان چنبیلی
سر پہ آنچل کٹا پھٹا سا تھا
پاؤں بھی سینڈلوں سے خالی تھے
اس کے ہاتھوں میں
برتنوں کی میل
اس کی زلفوں میں دھول اور مٹی
اس نے سینے پہ ہاتھ رکھا تھا
پھر بھی دوشیزگی بلاتی تھی
جسم کے زاویے دکھاتی تھی
اس کی غربت تماش بینوں کو
مفت کے ذائقے چکھاتی تھی
اس کے ہاتھوں میں
ایک کاسہ تھا
اور کاسے میں
چند سِکے تھے
اور سِکوں پہ چمچماتا ہوا
اک ''عظیم آدمی'' کا چہرا تھا
اور وہ آدمی بھی ہنستا تھا

ڈاکٹر جاوید راہیؔ

زمین و آسماں کی حد سے اُونچا
کوئی تو ہے ہمارے قد سے اُونچا
پرندے آشیانہ ڈھونڈتے ہیں
نئے طوفانِ نوحؑ کی زد سے اُونچا
تمہارا نام سب ناموں سے افضل
ہمارا عشق ہر سرحد سے اُونچا
میرے دل کا پرندہ اُڑ نہ پایا
تمہاری یاد کے برگد سے اونچا

اب کے مل جائیں کہیں ایسا بہانہ بھی نہیں
ویسے حالات نہیں ویسا زمانہ بھی نہیں
جانے کیوں سانپ حفاظت کے لئے بیٹھے ہیں
میری دیوار کے نیچے تو خزانہ بھی نہیں
چاند سُورج میرے پہلو میں کھڑے رہتے ہیں
اُن کی منزل بھی نہیں میرا ٹھکانہ بھی نہیں
وہ جو کہتے ہیں کہ رشتوں کی حدیں ہوتی ہیں
میں بھی کہتا ہوں کہ میں اتنا دیوانہ بھی نہیں

تیرا لہجہ تیری گفتار کھینچ لیتی ہے
ہم فقیروں کو سرِ دار کھینچ لیتی ہے
شہر کی ایک گلی راہ تکتی رہتی ہے
سو دفعہ گزروں تو سو بار کھینچ لیتی ہے

دشمنوں کے حال کا تھوڑا سا اندازہ رکھو
لاکھ دیواریں بنا دو ایک دروازہ رکھو
اس طرح بھی آزماؤ تم طبیبوں کی دوا
ہر مسیحا کو دکھاؤ زخم کو تازہ رکھو

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: جاوید احمد۔ قلمی نام: جاوید راہیؔ۔ ولد: نُور محمد۔ پیدائش: یکم ستمبر 1970ء بمقام چنڈک پونچھ۔ تعلیم: ایم اے اُردو (پی ایچ ڈی)۔ ادبی زندگی کا آغاز: 1987ء میں ستاروں سے آگے میں غزل کی اشاعت کے ساتھ۔ تصنیفات: گوجری لوک ادب۔ لوک ورثہ وغیرہ۔ ذریعۂ اظہار: اُردو، گوجری۔ پیشہ: کلچرل آفیسر۔ موجودہ پتہ: 81/9 ترکوٹہ نگر، جموں (جموں و کشمیر)

جب اُڑانوں کے موسم گزر جائیں گے
پھر یہ غافل پرندے کدھر جائیں گے
ریت ہی ریت رہ جائے گی دور تک
تیز دریا تو چڑھ کر اُتر جائیں گے
کوئی بھی تو نہیں جانتا شہر میں
چل پڑے ہیں مگر کس کے گھر جائیں گے
ٹوٹ جائے گا جب سائبانِ فلک
سارے موسم ہوا میں بکھر جائیں گے
کُو بہ کُو ہم کو ڈھونڈیں گے اہلِ جہاں
ہم ہوا کی طرح جب گزر جائیں گے

دل مسافر کا لگائے رکھنا
رات بھر آگ جلائے رکھنا
دھوپ کے شہر میں چلنا ہوگا
خود کو چہروں میں چھپائے رکھنا
میں بھی ظاہر نہیں ہونے دوں گا
یہ بھرم تُم بھی بنائے رکھنا
رات آؤں گا اندھیرا وڑھے
چاند آنکھوں میں سجائے رکھنا
پھاند جائے گا کنارے ورنہ
دل سمندر ہے دبائے رکھنا

کے۔ڈی۔مینی

الہام

اُس نے کہا تھا
کہ جس روز بھی
پاپ کلش بھر جائے گا
میں ضرور آؤں گا
مُدتیں ہو گئیں
ہم نے چاہا بہت
اور پکارا بہت
مندروں مسجدوں
گوردواروں
میں ڈھونڈا بہت
وہ نہ آیا مگر
اب تو بس
ایک ہی راستہ ہے یہاں
آؤ مل کے سبھی
پاپ کے کلش کو
جلد بھرنے کی کوشش کریں
اور پھر جس گھڑی
پاپ کا کلش بھر جائے گا
اُس کا وعدہ ہے کہ
وہ ضرور آئے گا

خورشید کرمانی

ایک دن تو آؤ مر کے دیکھ لیں
اپنا نوحہ خود ہی کر کے دیکھ لیں
سانپ جیسی چیز اک گھر میں رکھیں
رات ساری اس سے ڈر کے دیکھ لیں
سارے مفلس شہر کے بس ایک بار
برتنوں میں بھوک بھر کے دیکھ لیں
ٹھہرنے دو آگ کو کچھ روز اور
ہم بھی شعلے اپنے گھر کے دیکھ لیں
کھڑکیاں کھلتی ہیں کیسے چاپ پر
اس گلی سے ہم گزر کے دیکھ لیں

میکدہ تھا تشنگی تھی اور میں
اک خلا تھا تیرگی تھی اور میں
مجھ پہ نازل تھے اجالوں کے عذاب
ہر طرف بس روشنی تھی اور میں
جونہی جاگا نیند سے میرا شعور
کرب تھا اور آگہی تھی اور میں
کون رکھتا میرے قدموں کے حساب
زندگی تھی، وہ گلی تھی اور میں
میں نے پھینکے یاد کے کنکر بہت
ایک ساحل تھا، ندی تھی اور میں

گھر میں لگتی ہے بیابانی مجھے
چاٹ لے نہ دشتِ امکانی مجھے
پیاس بجھنے کا کوئی امکاں نہیں
آگ کر دیتا ہے اب پانی مجھے
میرے حق میں اب دعا کرتے رہو
مار دے گی میری سلطانی مجھے
کیا پتہ ہے اب کہاں لے جائے گی
اس "بدن دریا" کی طغیانی مجھے

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: خورشید احمد کرمانی۔ ولد: مرحوم حفیظ اللہ شاہ۔ پیدائش: جون 1954۔ قلمی نام: خورشید کرمانی۔ تعلیم: بی اے آنرز۔ ادبی زندگی کا آغاز: 1980ء میں۔ تصنیفات: دُکھ کے موسم...(شعری مجموعہ) پہاڑی شعری مجموعہ زیرِ ترتیب۔ ذریعۂ اظہار: اُردو، پہاڑی، کشمیری۔ پیشہ: مدرس۔ موجودہ پتہ: محلہ شنکر نگر، پونچھ (جموں و کشمیر)

بلراج کمار بخشی

ہر کسی کو نہ آزمایا کرو
میں جو کہتا ہوں مان جایا کرو

دل میں کافی جگہ بچی ہے ابھی
تم نئے زخم ڈھونڈ لایا کرو

پھول آہٹ سے سہم جاتے ہیں
تتلیو، ننگے پاؤں آیا کرو

آؤ دل کے چراغ سے کھیلیں
میں جلاؤں گا تم بجھایا کرو

بے وفائی کی داستاں اے دوست
تم نے لکھی ہے تم سنایا کرو

تم مناؤ تو روٹھ جاؤں میں
میں جو روٹھوں تو تم منایا کرو

لوگ گستاخ ہو چلے بلراج
تم نہ اپنی ہنسی اڑایا کرو

وہ سب کو دھوپ دھوپ سناتا ہوا ملے
کوئی درخت چھاؤں لٹاتا ہوا ملے

موسم خزاں کا اور دریدہ نظر مری
کوئی تو سبز باغ دکھاتا ہوا ملے

لازم ہبی پہ دوستی کے دو قدم ہوئے
کوئی ادھر بھی اک قدم آتا ہوا ملے

اُسکو کسی کا خوف نہیں ہے تو کم سے کم
اپنی نظر سے چھپتا چھپاتا ہوا ملے

جیسے میری شکست میں اُس کا بھی ہاتھ ہو
جب بھی ملے وہ آنکھ چُراتا ہوا ملے

دریا اگر سخی ہے سمندر عظیم ہے
ساحل کو آبشار بناتا ہوا ملے

رونے رُلانے والے ہی ملتے رہے ہمیں
بلراج کوئی ہنستا ہنساتا ہوا ملے

کچھ شاعر کے بارے

نام: بلراج کمار بخشی۔ پیدائش: 10 دسمبر 1949، بمقام پھگواڑی۔ تحصیل حویلی (پونچھ) تعلیم: بی ایس سی ادبی زندگی کا آغاز: ماہنامہ شاعر بمبئی میں پہلے افسانے "چاندنی کا دھواں" کی اشاعت کے ساتھ۔ تصنیفات: شعری مجموعہ زیر ترتیب۔ پیشہ: تجارت: ذریعۂ اظہار: اُردو۔ موجودہ پتہ: آدرش نگر، وارڈ نمبر 2 عیدگاہ، اودھم پور 182101 (جموں و کشمیر)

مالک رام آنند

کشتی غرقاب ہوئی جب تو صدا دی تو نے
ناخدا دیکھ بہت دیر لگا دی تو نے
تُو نے منجدھار سجائے تھے بھنور میرے لئے
رسم ساحل پہ لگانے کی اٹھادی تو نے
چار تنکے بھی میرے تجھ سے نہیں دیکھے گئے
مہرباں بن کے میری جان ہوا دی تو نے
سونگھ کلیوں میں میرا رنگ تُو خوشبو کی طرح
یہ کلی زرد نہیں ہے جو گرادی تو نے
خشک پتوں کو کیا سبز میرے اشکوں نے
یہیں گلشن تھا مگر آگ لگا دی تو نے

اس کے سجدوں کی زمیں کے بحروبر سے کیا گلہ
ہے نہیں قد میں مقابل اپنے سر سے کیا گلہ
دعوتیں دیتے ہیں منظر منفرد ہیں خوشبوئیں
پھونک بیٹھے آشیاں تو پھر شرر سے کیا گلہ
وہ میرے اندر دہکتا ہے گلابوں کی طرح
سرخرو ہوتا نہیں ہے چشمِ تر سے کیا گلہ
آندھیوں کی شام ہے اور دھول سی پر چھائیاں
میں ہی اڑنے سے رہا اب بال و پر سے کیا گلہ
وہ زمیں پر آفتابوں کی اگاتا کھیتیاں
میں اندھیرے میں کھڑا ہوں اس کے در سے کیا گلہ

لفظ

لفظ پھانسی کے بھی تختے پر کھڑا ہو
اپنی بُو باس نہیں کھوسکتا
لفظ ہیروں کے دفینے میں پڑا ہو
اپنی اساس نہیں کھوسکتا
لفظ چڑھتا ہے چڑھے جیسے ہو دریا کوئی
لفظ کو کون اُتارے گا تنزل کی طرف
لفظ بڑھتا ہی چلا جائے گا منزل کی طرف
لفظ کا اپنا ہی فسانہ ہے
لفظ کی زد میں یہ زمانہ ہے

رہبر پونچھی

جو سینے میں چھپا کر اپنی غیرت مٹتے جاتے ہیں
بجا ہے آپ وہ اپنی بدولت مٹتے جاتے ہیں
وفا سے آشنا ملتا نہیں کوئی جہاں بھر میں
جہاں بھر سے اب آثار محبت مٹتے جاتے ہیں
بلابل جو نگاہ ناز کا الفت میں پیتے ہیں
چمن میں گلبدن خاروں کی نسبت مٹتے جاتے ہیں
یہاں اب ہر طرف ہے دور دورہ بد نہاروں کا
کہ اب اس شہر سے آثار شرافت مٹتے جاتے ہیں

کچھ شوق کے مارے پیتے ہیں کچھ درد کے مارے پیتے ہیں
بدنام تو میں ہوں لوگوں میں لیکن یہ سارے پیتے ہیں
جنکو تو میسر ہوتی ہے، وہ آنکھ بچا کر پیتے ہیں
ہم لوگ جو ستی پیتے ہیں دریا کے کنارے پیتے ہیں
کچھ پیتے ہیں مئے خانوں میں اور کچھ جا کر بتخانوں میں
جو باقی لوگ نہیں پیتے وہ غم کے دھارے پیتے ہیں
ناصح کی نصیحت مان بھی لیں، انکار کفر سے کر ڈالیں
ہم اہل زمیں کی بات ہی کیا جب چاند ستارے پیتے ہیں

آواگون

(عزیز شبنم کے نام)

میں کہ اک آوارہ بادل
محوِ سفر تھا چلتے چلتے
رکا، تو برسا گہرائی میں
سمٹ سمٹ کر ٹھہر گیا ہوں
اور کناروں نے جھیلوں میں
اپنی مجھ کو قید کیا ہے
قید میں رشتوں اور ناطوں کی
بندھا ہوا میں ٹوٹ رہا ہوں
اک دن ایسا بھی آئے گا
تپتے روی کی آنچ سی کرنیں
مجھ کو ساتھ ملا کر اپنے
نیل گگن میں اُڑ جائیں گی
اور ہوا کے تیز تھپیڑے
پھر مجھ کو آوارہ کریں گے
بستی بستی صحرا صحرا
وادی وادی جنگل جنگل
پھرتا رہوں گا میں آوارہ
کیونکہ میں آوارہ بادل
تھک کر جب آرام کی خاطر
کسی بھی ٹھنڈی جگہ رکوں گا
پھر برسوں گا، پھر برسوں گا
کئی یگوں سے لگاتار یہ
میرا چکر چلتا آیا
آواگون کا چکر رہبر
جانے کب تک اور چلے گا

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: بلدیو راج دتہ۔ قلمی نام: رہبرؔ۔ ولد: بخشی کرپا رام وید۔ پیدائش: 25 ستمبر 1924ء۔ بمقام موضع درآبہ، سرنکوٹ۔ تعلیم: میٹرک۔ ادبی زندگی کا آغاز: دوران ملازمت۔ پیشہ: جوڈیشل کلرک رہے۔ ذریعۂ اظہار: اردو۔ تاریخ وفات: 19 جون 1987ء۔ بمقام بجموں۔

آنند لہر

قلم

کوئی چہرا دیکھوں
کوئی ہونٹ چوموں
تیرے گالوں سے نازک
کوئی خیال سوچوں
اپنا احساس بیچوں
تھوڑی سی شہرت خریدوں
بھول جاؤں میں قصے
توڑ دوں میں آئینے
لیکن دیکھتا ہوں کچھ لوگ
آئینے خرید رہے ہیں
چہرے بیچ رہے ہیں
کفن خرید رہے ہیں
سہرے بیچ رہے ہیں
دیکھتا ہوں سب کچھ بدل گیا
سکوں کا چلن نہ بدلا
دھرتی کئی بار ناگا ساکی بنی
لیکن ظالم گگن نہ بدلا
ساقی بدلنے سے کیا ہوا
جو طورِ انجمن نہ بدلا
میں نے پیار کا نغمہ بھی چھیڑا نہیں
لیکن یہ عالمِ گھٹن نہ بدلا
میں نے کانٹوں کو جگر کا خون تک دیا
پر ان کا اندازِ چبھن نہ بدلا
پھر اٹھا دیتا ہوں قلم
لکھ دیتا ہوں
ساری دنیا گھوم رہی ہے
اور میں ہوں مجسمہ

تم جو مہرباں ہوئے

شیشہ گروں سے کہہ دو
چہروں کا بیوپار نہ کریں
خلا کی کوئی حد نہیں ہے
نگاہوں سے کہو تکرار نہ کریں
صحراؤں سے کہو
اپنے وجود میں نمی ڈھونڈیں
سمندروں نے جتنا بکھرنا تھا
بکھر چکے
پھول تھے کھلے
کھل کر مرجھا گئے
کانٹے ہیں
پی کے لہو نکھر گئے
چھو گئی ترے دامن سے جو بھی کلی
سارے گلشن کی اس پر نظر جم گئی
دل جلوں نے اُجالا کیا شامِ غم
لوگ کہنے لگے کہ سحر ہو گئی
ساری دنیا ہوئی ہم پہ پھر مہرباں
مہرباں جب تمہاری نظر ہو گئی

پانی کی ایک بُوند منگائی ہے دھوپ سے
ہم نے بھی کیسی آس لگائی ہے دھوپ سے
دریا سے کہو اب نہیں قطرے کی تمنا
ہم نے تو اپنی پیاس بجھائی ہے دھوپ سے
ہم کو شبِ فراق میں محسوس یہ ہوا
یہ چاندنی بھی آج نہائی ہے دھوپ سے
وہ اور تھے کہ جن کو جلایا ہے دھوپ نے
ہم نے تو اپنی بزم سجائی ہے دھوپ سے

دیکھ لے آکر ذرا پھر دیکھ لے
اپنی منزل اور مرا گھر دیکھ لے
کل تلک جس کے لئے سوچا نہ تھا
اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھ لے
میری آنکھوں میں اُتر آیا ہے خون
دیکھ سکتا ہے تو آکر دیکھ لے
کاٹتا جاتا ہے ہر اک شخص کو
وقت کے ہاتھوں میں خنجر دیکھ لے
کاٹ کے رکھے ہوئے ہاتھوں پہ سر
آرہے ہیں کیسے لشکر دیکھ لے

علمدار حسین عدمؔ

زمانے کا مقدر ہو گیا ہے
وہ صحرا تھا سمندر ہو گیا ہے
نگلتا جا رہا ہے آسماں بھی
جہاں والو وہ اجگر ہو گیا ہے
ہر اک اُس کی ہی جانب دیکھتا ہے
وہ جیسے کوئی منظر ہو گیا ہے
کسی آسیب کا سایہ ہے اُس پر
ہوا ہے چُپ کہ پتھر ہو گیا ہے
فقیروں کو امیری دے رہا ہے
خدا بھی اب قلندر ہو گیا ہے

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: علمدار حسین۔ **قلمی نام:** عدمؔ۔ **ولد:** سید لعل حسین شاہ کاظمی۔ **پیدائش:** 1976۔ **تعلیم:** ایم اے اردو۔ بی ایڈ (نیٹ) پی ایچ ڈی (جاری)۔ **ادبی زندگی کا آغاز:** دوران تعلیم۔۔ **ذریعۂ اظہار:** اردو۔ **موجودہ پتہ:** موضع قصبہ، تحصیل حویلی، پونچھ (جموں و کشمیر)

امتیاز نسیم ہاشمی

کوئی کہتا ہے رات بھاری ہے
چار جانب سکوت طاری ہے
اک سمندر ہے اور پیاسا ہے
ایک دریا ہے، بیقراری ہے
ہم نے دیکھا ہے آئینہ جتنا
ہم میں اتنی ہی خاکساری ہے
ایک تم ہی نہیں اکیلے تھے
رات ہم نے بھی تو گزاری ہے
سائے گھٹتے ہیں اور بڑھتے ہیں
ہم کو سورج سے شرمساری ہے
ایک تم ہو کہ بس نہیں چلتا
باقی دنیا تو سب ہماری ہے

جب بھی پیغام ترا لے کے صبا آتی ہے
اک اُڑتی ہوئی ہونٹوں پہ دعا آتی ہے
میں تو صحرا تھا مگر سبز ہوا چاہتا ہوں
جانے کس جسم کو چھو کر یہ ہوا آتی ہے
پہلے سب خال اُترتی ہے گھنی شاخوں کی
تب کہیں جا کے یہ پتوں کی قبا آتی ہے
جانے کیا سوچ کے یہ موجِ ہوا ہر لمحہ
ریت کے ڈھیر پہ اک شکل بنا جاتی ہے
آج بھی دور بہت دور سے چپکے چپکے
مجھ کو چلتے ہوئے آدم کی صدا آتی ہے
اُس گھنی زُلف کا شانوں پہ بکھرنا یارو!
جھوم کے جیسے کوئی کالی گھٹا آتی ہے

نام: امتیاز نسیم ہاشمی۔ قلمی نام: امتیاز نسیمؔ۔ پیدائش: 12 جولائی 1969ء۔ کھوریا، پاکستانی کشمیر، تعلیم: ایم اے اُردو۔ تصانیف: چٹکارا (پہاڑی شعری مجموعہ، انعام)۔ انعام یافتہ کلچرل اکادمی۔ پیشہ: لکیچرر اُردو۔ ذریعۂ اظہار: اُردو، پہاڑی، گوجری۔ موجودہ پتہ: موضع نڑول، چھترال، مہنڈر پونچھ۔

بھولی بسری وہ کہانی ہو گئے
ہم بھی اوراقِ خزانی ہو گئے
بلبلے کی ہم جوانی ہو گئے
پل دو پل میں آنجہانی ہو گئے
ہم قریب اُن کے رہے اب دور ہیں
ہم گلوں کی شادمانی ہو گئے
یاد تک آتے نہیں، نام اور
نین نقشے منہ زبانی ہو گئے

پرندہ آب و دانہ ڈھونڈتا ہے
اُڑانوں کا بہانہ ڈھونڈتا ہے
طوائف کا وہ دولت مند بیٹا
کوئی اونچا گھرانہ ڈھونڈتا ہے
ہوس کے شہر میں اک بوڑھا انساں
کوئی ساتھی پرانا ڈھونڈتا ہے
میسر ہو جہاں دولت سکوں کی
سکندر وہ ٹھکانہ ڈھونڈتا ہے

عبدالغنی جاگل

تری نظر مجھے دو نیم کر گئی
میں طفلِ مکتبی، یتیم کر گئی
کسی سے چھین لی ہے صوتِ حرف بھی
کسی کو طُور کا کلیم کر گئی
انار کی کلی ہے قسمت اپنی اور
کسی کو بادشاہ سلیم کر گئی
کسی کا رنگ زرد پیلا کر دیا
کسی کو خوش وضع، شمیم کر گئی

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: عبد الغنی جاگل ولد: الحاج وزیر محمد آسیؔ قلمی نام: غنیؔ پیدائش: 12 اپریل 1962ء بمقام گورسائی، مہنڈر۔ تعلیم: BE-Civil فاضل، دینیات، ادیب کامل۔ پیشہ: اسسٹنٹ ایگزیکٹو انجینئر۔ ذریعۂ اظہار: اُردو، پہاڑی، گوجری۔ موجودہ پتہ: 349 پیر کھوہ، ڈاکخانہ پیر مٹھا جموں (جموں و کشمیر)

رنج و آلام میں گو آج بسر ہوتی ہے
شب تاریک کی آخر تو سحر ہوتی ہے
لاکھ پردوں میں چھپائے پھرو تم عشق کی بات
ہے خبر ایسی کہ بے تار نشر ہوتی ہے
مال بھی تم پہ لٹا بیٹھے متاعِ دل بھی
پوچھتے کیا ہو کہ کس طرح گزر ہوتی ہے
ساتھ دیتی نہیں ہر دور میں اچھی قسمت
چھاؤں ہے، گاہے اِدھر گاہے اُدھر ہوتی ہے
سیج پھولوں کی نہیں عشق کسی سے کرنا
یہ ڈگر جان کی بازی پہ ہی سر ہوتی ہے
دل کی تخریب کا کیوں تم نے ارادہ باندھا
یہ وہ بستی ہے جو محبوب کا گھر ہوتی ہے
اب نہ آنکھوں میں مروت ہے نہ اُلفت دل میں
بات جو ہوتی ہے بے تیغ و تبر ہوتی ہے
اہلِ عصیاں کی سنور جاتی ہے جس سے دنیا
اے رفیقؔ وہ تو فقط اس کی نظر ہوتی ہے

دینا ناتھ رفیقؔ

نہ لب پہ آہ لاتا ہوں نہ میں فریاد کرتا ہوں
تری مشق جفا پر بھی میں تجھ کو یاد کرتا ہوں
اُجڑ جاتی ہے فرقت میں حریم دل کی محفل جب
ترے رنگیں تصور سے اسے آباد کرتا ہوں
تلطف سے نہیں کچھ کم ہے اندازِ غضب تیرا
اسی ابلہ فریبی سے میں دل کو شاد کرتا ہوں
کرم فرمائیاں ہیں یہ جنابِ عشق کی مجھ پر
خدا کو بھول بیٹھا ہوں تجھے ہی یاد کرتا ہوں
غمِ اُلفت نے جانِ ناتواں کو زندگی دی ہے
اسی خاطر دلِ ناشاد کو میں شاد کرتا ہوں
ترے عفو و عطا، جور و جفا سے دل کی بستی کو
کبھی آباد کرتا ہوں کبھی برباد کرتا ہوں
مری اور ان کی فطرت میں تفاوت ہے تو اتنی ہے
وہ مجھ کو بھول جاتے ہیں میں ان کو یاد کرتا ہوں

کچھ شاعر کے بارے

نام: چودھری دینا ناتھ پوری۔ قلمی نام: دینا ناتھ رفیقؔ۔ پیدائش: 1904 بمقام ہوتر۔ جھانجل، پاکستانی کشمیر۔ ادبی زندگی کا آغاز: دوران تعلیم۔ تعلیم: ایف۔ اے۔ تصنیفات: سنبل و ریحان (شعری مجموعہ) وغیرہ۔ ذریعۂ اظہار: اُردو۔ پیشہ: محکمہ تعلیم میں مدرس رہے۔

سرون ناتھ آفتاب

عصرِ جدید میں درِ جاناں بدل گیا
اب عشق و عاشقی کا فسانہ بدل گیا

اے انقلابِ دہر تیرے دم سے آجکل
گنگ و جمن کا دیکھ دہانہ بدل گیا

سب اختلاف، شیخ و برہمن کے مٹ گئے
انگریز چل دیئے تو زمانہ بدل گیا

بت خانہ میں بدل گئی ناقوس کی صدا
مسجد میں مولوی کا ترانہ بدل گیا

لاؤں کہاں سے اب میں وہ خُم خانۂ نشاط
اربابِ میکدہ کا ٹھکانہ بدل گیا

اتنے ہوئے ہیں مجھ پہ ستم ہائے روزگار
سب شعرو شاعری کا ترانہ بدل گیا

پہلی سی مجھ پہ تیری عنایات کیا ہوئیں
تم کیا گئے کہ ایک زمانہ بدل گیا

اپنا چلن نہ بدلا، نہ بدلے گا آفتاب
تھا غیر غیر ہم سے یگانہ بدل گیا

جہانِ رنگ و بُو میں حسن و اُلفت کے سوا کیا ہے
کرشمہ ہے محبت کا محبت کے سوا کیا ہے؟

تم اپنے حسن پہ اتنا نہ اتراؤ نہ اتراؤ
تمہارا حسن میرے دل کی چاہت کے سوا کیا ہے

مروّت ہے نہ الفت ہے نہ ہے پاسِ وفاداری
دلوں میں آجکل بغض و کدروت کے سوا کیا ہے؟

ہوئے اب خواب وہ لمحے جو گزرے تیرے پہلو میں
دلِ مضطر میں ان خوابوں کی جنت کے سوا کیا ہے

عبث بے چین یہ دل ہے، کسی کی بے وفائی پر
مآلِ عشق و اُلفت، یاس وحسرت کے سوا کیا ہے

نہ جانے کیا سمجھتے ہیں خدا کو یہ خدا والے
وجودِ کبریا حسنِ عقیدت کے سوا کیا ہے

وہ رنگیں محفلیں باقی نہ حسن و عشق کے چرچے
یہ دورِ زندگانی اک اذیت کے سوا کیا ہے

نہ ہو عابد اگر جذبِ محبت تیرے سجدوں میں
تو پھر تیری عبادت ایک عادت کے سوا کیا ہے

ضیائے آفتابِ عشق سے دنیا منور ہے
نہ ہو یہ نُور تو دنیا میں ظلمت کے سوا کیا ہے

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: ڈاکٹر سرون ناتھ۔ قلمی نام: آفتاب۔ پیدائش: 7 جنوری 1908ء بمقام نون میانی، بھیرا، ضلع شاہ پور، سرگودھا، پنجاب (پاکستان) تاریخ وفات: 17 دسمبر 1979ء، پونچھ۔ تعلیم: ایف اے۔ پیشہ: حکیم (یونانی میڈیسن) 1944ء کے بعد کچھ عرصہ ہفت روزہ آفتاب کے مدیر رہے۔ ذریعۂ اظہار: اردو۔

بیتاب سیفی

شبِ تاریک تھی واں اُس نے کیا کیا کر دیا ہوگا
کسی مجبور کی عصمت کا سودا کر دیا ہوگا

نہیں سودے سروں کے اب نہ ہے سودائے سر باقی
مریضِ غم کسی نے شاید اچھا کر دیا ہوگا

توجہ اہلِ بینش کی ہٹی جاتی ہے اب مجھ سے
شہر میں پھر کسی نے کچھ تماشہ کر دیا ہوگا

تجھے چھوٹا نظر آؤں یہی ہے تیری کج بینی
مرے قدموں کو بھی تو نے اپنے جیسا کر دیا ہوگا

اٹھا کر سر برابر اس کے میں بھی ایک دن چلتا
نہ جانے اس نے میرے سر کا سودا کر دیا ہوگا

مرا ہی آشیاں بجلی کی زد میں ہے یہ کیا کم ہے
سُلگ کر لمحہ بھر اس نے اُجالا کر دیا ہوگا

آ گیا گردش میں پھر پیمانہ پیمانے کے بعد
رنگ ہی بدلا ہے محفل کا ترے آنے کے بعد

آج بے شک میں ترے رستے کا پتھر ہی سہی
دوستو ڈھونڈو گے تم مجھ کو مرے جانے کے بعد

اہلِ دنیا کیا توقع ہوگی تم سے اس کے بعد
پھول کیا برساؤ گے تم آگ برسانے کے بعد

اپنی آنکھوں دیکھتی جائے گی شمع رات بھر
جان دیتا جائے گا پروانہ پروانے کے بعد

قتل کر کے خوش تو ہیں وہ ایک فاتح کی طرح
رو پڑیں گے میرے قاتل مجھ کو دفنانے کے بعد

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: حسام الدین ولد: مستری لعل دین قریشی قلمی نام: بیتاب پیدائش: 30 اکتوبر 1932ء بمقام سمھوٹ، سرنکوٹ۔ تعلیم انٹر میڈیٹ ادیب کامل۔ ادبی زندگی کا آغاز: 1953ء پیشہ: مدرس (ریٹائرڈ)۔ ذریعۂ اظہار: اُردو، پہاڑی، گوجری۔ موجودہ پتہ: نزد جامع مسجد، سرنکوٹ، پونچھ (جموں و کشمیر)

پرویز مانوس

کھلا صیاد نے رکھا ہے پنجرہ آج کے دن بھی
نہ جانے پھر بھی کیوں پنچھی رہا ہونے سے ڈرتا ہے

چناروں سے لپٹ بیٹھی ہیں پھر سے آگ کی بیلیں
اب ان کی چھاؤں میں خود چاند بھی سونے سے ڈرتا ہے

ہمارے آنگنوں میں پھر عذابوں کا سمندر ہے
کوئی بھی آستیں اپنی یہاں دھونے سے ڈرتا ہے

صلیبوں کو عطا کی لازوال اک زندگی جس نے
وہی اب جسم کو اپنے یہاں کھونے سے ڈرتا ہے

جو رہتا ہے مہاجر کے مکاں میں ایک مدت سے
وہی اس شہر میں اب بے مکاں ہونے سے ڈرتا ہے

سہم جاتے ہیں بس اک چاپ ہی سن کر مکیں اتنے
کوئی معصوم بچہ بھی یہاں رونے سے ڈرتا ہے

گلے میں ناگ ڈالے ہر گلی پھرتا ہے کیوں سادھو
اگر وہ نفس کا بوجھا یہاں ڈھونے سے ڈرتا ہے

گھڑی بھر کو مرے پہلو میں آؤ چاند کہتا ہے
کسک سوئے ہوئے دل میں جگاؤ چاند کہتا ہے

یہ عالم جگمگائے گا، سحر پھر سے جواں ہوگی
رخِ روشن سے زُلفیں تو ہٹاؤ چاند کہتا ہے

بڑی مدت سے حسرت تھی کہ دیکھوں ڈوبتا خود کو
نگاہوں سے نگاہیں تو ملاؤ چاند کہتا ہے

میرے دل کی زمیں پر وہ یقیناً آج اُترے گی
کہ پلکیں رہگزاروں پر بچھاؤ چاند کہتا ہے

پرانی ہی سہی یادوں کی چادر ہم کو ہے پیاری
ہواؤں سے نہ دامن کو چھڑاؤ چاند کہتا ہے

کناروں کو جو پانی چھو گیا جل جائے گا دریا!
نہ اُس کا نام پانی پر لکھاؤ چاند کہتا ہے

شاعر کے بارے

نام: پرویز احمد ولد: غلام رسول بٹ قلمی نام: مانوس پیدائش: 6مارچ 1966ء تعلیم: بی اے آنرز پیشہ: ملازمت (محکمۂ تعلیم) تصانیف: بیتے لمحوں کی سوغاتیں (شعری مجموعہ) شکریے کی موت (اردو افسانے) چرھیتھل (پہاڑی افسانوی مجموعہ) ذریعۂ اظہار: اردو، پہاڑی موجودہ پتہ: آزاد بستی ویسٹ، نٹی پورہ، سرینگر، کشمیر

غلام نبی شہبازؔ

"سُرن" کے معصوم مزدور کے نام!

دسمبر کی صبح چلتی تھی بادِ زمہریر!
آسماں پر کانپا ہو جس طرح ماہِ منیر!
کوہساروں پر مسلط برف کی خاموشیاں
نیند کی آغوش میں تھی سُرن کی وادی تمام
پاس دریا گنگناتا وِرد میں محوِ خرام!
شہر کے آدم ادھورے نقش پر تھی خامشی
دولتِ آرام سے فارغ فقط محنت کشی
یک بیک میری نگاہ میں آئی اک صورت اُداس
کمسن و معصوم انساں جسم محرومِ لباس
دوش پر تھا بوریا اور پیر ڈھانکے "پُول" سے
ہاتھ تھے ٹھٹھرے ہوئے کیا نرم و نازک بھول سے
اس کے چہرے میں ہویدا سینکڑوں ناداریاں!
بے کسی، فاقہ کشی، بد بختیاں، بیزاریاں!
دور مزدوری کی خاطر گھر سے نکلا وہ گلاب!
ڈھل گیا آنگن سے مجبوری کا مارا آفتاب
ماں کے اشکوں نے کیا رخصت اسے کس طور سے
اس کا بچپن کیوں نہ مچلا کیوں نہ رویا زور سے
کس طرح چلتا رہے گا رات خوابوں کا لہو
شہر صبحدم کرے گا جیسے اشکوں سے وضو
اس کی خواہش، اسکی حیرت، اس کی دنیائے خیال
کس جہاں میں کھو گیا ہے اس کی خوشبو کا جمال؟
کس طرح پردیس میں اُس سے چھٹے گی گھر کی یاد
ڈوبتی صبحوں کا درد اور پھیلتی شاموں کی یاد
روز و شب بکتا رہے گا کوچۂ نیلام سے
اُس کی دنیائے تمنا ڈوب جائے گی کہیں
کس طرح گزریں گے اُس کے کھوئے کھوئے صبح وشام
کیا دلِ نازک کرے گا خنجروں کا اہتمام
بجلیاں کتنی گریں شہبازؔ اس احساس پر
چشمِ نم ماحول تھا غربت کے اس بن باس پر

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: غلام نبی نائیک ولد: عبد السبحان نائیک۔ قلمی نام: شہبازؔ۔ پیدائش: 24 فروری 1940ء۔ تعلیم: ایم اے۔ ادبی زندگی کا آغاز: دوران ملازمت۔ تصانیف: ژھینہ گمنژ آواز۔ برائینتی۔ پوشہ پوشہ۔ طواف (کشمیری شعری مجموعے) پیشہ: لیکچرر (ریٹائرڈ)۔ ذریعۂ اظہار: اُردو۔ کشمیری۔ موجودہ پتہ: بھروٹ، تھنہ منڈی، راجوری۔

رشید فدؔا

سراب ِ زندگی ہے اور میں ہوں
وہی اک تشنگی ہے اور میں ہوں

اندھیرا چار جانب دور تک ہے
یہ کیسی روشنی ہے اور میں ہوں

ہوئی حرف ِ غلط ہر اُس کی تحریر
کتاب ِ زندگی ہے اور میں ہوں

یہی محرومیاں مایو یاں ہیں
یہ کیسی بے بسی ہے اور میں

میں شہر ِ دل میں اپنے ہوں مسافر
عجب بیگانگی ہے اور میں ہوں

ہوا کی زد میں ہے فصل ِ بہاراں
مری دیوانگی ہے اور میں ہوں

سر ِ بازار ہوں میں تنہا تنہا
یہ کیا وارفتگی ہے اور میں ہوں

ہوائیں، تاکتا ہوں ناپتا ہوں
یہی ہمسائیگی ہے اور میں ہوں

میرے دل کے نہاں خانے میں اکثر
فدؔا لاچارگی ہے اور میں ہوں

زخم ِ دل وہ کہ تازگی ہے ابھی
ان ہواؤں میں برہمی ہے ابھی

چاک ِ دامن رفو ہی کرنے دو
تھوڑی لمحوں میں آشتی ہے ابھی

اعتبارات سارے ختم ہوئے
طرح ِ نو ہے کہ دیدنی ہے ابھی

موت کی چُپ اُداسیوں کی زمیں
یعنی پہلو میں زندگی ہے ابھی

تم ہمیں نا مراد کہتے ہو
ہم سمجھتے ہیں دل لگی ہے ابھی

رس ہر اک سمت گھولتے نغمے
دل کی دنیا کہ گفتنی ہے ابھی

لو چراغوں کی ماند ہونے لگی
شہر ِ دل میں بھی کچھ کمی ہے ابھی

سبزہ وشاخ و برگ و بار فدؔا
سب کا موسم یہ اجنبی ہے ابھی

نام: عبد الرشید نائیک۔ قلمی نام: فدؔا ولد: عبد السبحان نائیک۔ پیدائش: 1941۔ بمقام پوشانہ، تحصیل سرنکوٹ تعلیم: ایم اے (اُردو۔ سیاسیات) بی ایڈ ادبی زندگی کا آغاز: دوران ملازمت ذریعۂ اظہار: اُردو۔ کشمیری۔ پہاڑی۔ گوجری۔ پیشہ: ریٹائرڈ پرنسپل ھائیر سکنڈری۔ موجودہ پتہ: بھروٹ، تھنہ منڈی، راجوری۔

رفیق انجم

جا بجا ہر موڑ پر یوں اشک برسایا نہ کر
راستوں میں بے محل یہ جام چھلکایا نہ کر
تجھ کو پاگل نہ بنا دے یہ ستاروں کا شمار
یاد کے موسم میں اتنی دیر تک جاگا نہ کر
اس طرح سے اپنی ہی پہچان کھو جائے گا تو
اس قدر ہر نقش پا کو غور سے دیکھا نہ کر
جاتے جاتے اے صنم کچھ خواب دیتا جا مجھے
یہ سہارے تو نہ چھین اے جان جاں ایسا نہ کر
کوئی ساگر بھی نہیں ہے اور انجم کا یہ دل
ڈوب کر ابھرے گا تو یہ بات بھی سوچا نہ کر

تشنگی میری گئی نہ میری تنہائی گئی
دامن ہستی میں اُلفت کی کمی پائی گئی
جب بھی دیکھا دھڑکنیں محسوس کیں تصویر میں
یوں لگا جان تغزل رُوبرو لائی گئی
اپنی غزلیں ہم نے کردیں اُس انا میکا کے نام
زندگی سے یوں جو گزری جیسے پروائی گئی
ہم نے پوچھا کیا ہوئی تھی جو جوانی آپ کی
بولے وہ رحمت خدا کی تھی جو آئی گئی
مصلحت کی نذر ہو جاتی ہیں انجم چاہتیں
پاک رشتوں کی جہاں سے اب شناسائی گئی

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: ڈاکٹر رفیق انجم۔ قلمی نام: انجمؔ۔ ولد: مرحوم عبد الکریم اعوان۔ پیدائش: یکم جنوری 1962ء۔ بمقام موضع کلائی، پونچھ۔ تعلیم: ایم بی بی ایس۔ ایم ڈی۔ تصانیف: خواب جزیرے (اُردو شاعری) اور متعدد گوجری تصانیف۔ پیشہ: ڈاکٹر (چائلڈ اسپیشلسٹ)۔ ذریعۂ اظہار: اُردو، گوجری۔
موجودہ پتہ: ڈسٹرکٹ ہاسپٹل، راجوری (جموں وکشمیر)

کہاں ہیں برف پہ خوشبو کی تتلیاں اب کے
سراپا آگ ہیں خوابوں کی بستیاں اب کے
ہیں کیسی تیز ہواؤں کی زد پہ گل سارے
سسک رہی ہیں گلابوں کی پتیاں اب کے
ترے خرد کا کہاں کھو گیا ہے آج لباس
جنوں کے ہاتھ سے اُڑتی ہیں دھجیاں اب کے
یہ کون خوش ہے فضاؤں سے توڑ کر رشتے
بھٹک رہی ہیں اداؤں کی تتلیاں اب کے
لہولہان ہے دھرتی، ہے آسماں خوں ریز
عجیب تر ہیں یہ آدم کی مستیاں اب کے
تمہارا کربؔ لکھوں میں مگر لکھوں کیسے
لرز رہی ہے اِن ہاتھوں کی اُنگلیاں اب کے
ڈبو کے خون میں تاریخ داں نے اپنا قلم
جبین وقت پر لکھ دی ہیں سرخیاں اب کے
کہ جس کے عکس میں، میں نے اُسے اُتارا تھا
وہ آئینہ تھا، ہوا گر کے کرچیاں اب کے
بجھا کے کون گیا ہے یہ منظروں کے چراغ
اُداس شادؔ ہیں ساری ہی بستیاں اب کے

مستورشادؔ

خالی کمرہ ڈر لگتا ہے
وحشت کا منظر لگتا ہے
اب کے کیسی فصل اُگی ہے
پھول بھی اب پتھر لگتا ہے
اُس کی بات میں زہر ہو جیسے
ایسا کیوں اکثر لگتا ہے
چاند کی لو میں اُس کو دیکھا
میلی سی چادر لگتا ہے
ناداں ہے خود ہی سنبھلے گا
آج اگر بے پر لگتا ہے

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: مستور احمد ملک. قلمی نام: شادؔ ولد: خواجہ رمضان جو. پیدائش: 28 جنوری 1960ء بمقام بفلیاز. تعلیم: انٹر میٹرک. پیشہ: سرکاری ملازمت (محکمہ شیپ ھسبنڈری) ذریعۂ اظہار: اُردو، پہاڑی، گوجری. موجودہ پتہ: ساکن سمھوٹ، معرفت شبنم میڈیکیٹ، سرنکوٹ 185121 پونچھ (جموں و کشمیر)

عنایت تنویرؔ

چراغوں کی سسکتی روشنی دم توڑ جائے گی
دلِ ناداں تیری دیوانگی دم توڑ جائے گی
ہزاروں بار بدلا ہے کسی نے اپنی فطرت کو
یقیں اب ہو گیا ہے دوستی دم توڑ جائے گی
ابھی خاموش رہنے دو رباب وچنگ کی محفل
مری ہر سانس اکھڑی کانپتی دم توڑ جائے گی
چلو کوئی تو خوش ہے درد وگریاں دیکھ کر میرا
کسی کا غم اٹھا کر ہر خوشی دم توڑ جائے گی
میں کیسے مان لوں سُورج نکل آئے گا مغرب سے
جو مجھ کو اب یقیں ہو تیرگی دم توڑ جائے گی
وہ بانٹے دردمیرا ب کہاں تنویرؔ یہ ممکن
کسی کی یاد لے کر زندگی دم توڑ جائے گی

سر پہ جو اک سائباں تھا کیا ہوا
جگمگاتا آسماں تھا کیا ہوا
ریزہ ریزہ ہو گیا ہوں ٹوٹ کر
حسنِ ظن جو درمیاں تھا کیا ہوا
آس کے رنگین پھولوں کے قریب
ایک اپنا آشیاں تھا کیا ہوا
وقت کے کاندھوں پہ جو تھا گامزن
وہ ہمارا کارواں تھا کیا ہوا
ہو گئے رسوا ادھر شرفا سبھی
آدمیت کا نشاں تھا کیا ہوا
کھا گئی تنویرؔ دیمک یہ مکاں
جو مکیں تھا، جانِ جاں تھا کیا ہوا

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: سید عنایت حسین شاہ ولد: سید جماعت علی شاہ قلمی نام: تنویرؔ۔ پیدائش: 24 مئی 1956ء بمقام دھندک۔ تعلیم: میٹرک۔ ادبی زندگی کا آغاز: دوران تعلیم۔ پیشہ: تجارت۔ ذریعۂ اظہار: اُردو، پہاڑی۔ تاریخ وفات: 22 دسمبر 2000ء

محمود الحسن محمودؔ

سینے میں حادثوں کو سپر کر لیا کرو
یہ کام ہے کٹھن سا مگر کر لیا کرو
جن پر ہوں مشکلات کے سائے پڑے ہوئے
اُن منزلوں میں عزمِ سفر کر لیا کرو
غیروں پہ نکتہ چینیاں کرنے سے پیشتر
اپنی قباحتوں پہ نظر کر لیا کرو
اے گلشنِ حیات کے پھولوں کے عاشقو!
کانٹوں میں بھی کچھ وقت بسر کر لیا کرو
فکرِ معاش اور غمِ زندگی کے ساتھ
ذکرِ خدا بھی شام و سحر کر لیا کرو

اوجِ پرِ فکر میں ہو تو، غزل ہوتی ہے
موجزن دل میں یقیں ہو تو، غزل ہوتی ہے
روبرو کوئی حسیں ہو تو، غزل ہوتی ہے
دل کو تسکین کہیں ہو تو، غزل ہوتی ہے
شعر ہوتا ہے رقم خونِ جگر سے لیکن
شعر کا ذوق حسیں ہو تو، غزل ہوتی ہے
محض الفاظ سے ہوتی نہیں تخلیقِ غزل
عشق بھی دل میں مکیں ہو، تو غزل ہوتی ہے
جو بھی دعوائے سخن کرتے ہیں وہ اتنا سُن لیں
میرؔ و غالبؔ کی زمیں ہو تو، غزل ہوتی ہے

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: محمود الحسن ولد: پیراں دتہ سلہریا پیدائش: 7 جولائی 1937ء بمقام پونچھ۔ تعلیم: بی اے بی ایڈ ادبی زندگی کا آغاز: 1952ء میں پہلی بار سورۂ فاتحہ کے منظوم ترجمہ کے ساتھ۔ پیشہ: ریٹائرڈ ماسٹر محکمہ تعلیم۔ ذریعۂ اظہار: اُردو۔ موجودہ پتہ: کھوڑی نالہ، پونچھ (جموں و کشمیر)

مسعود الحسن مسعود

دل کو سکون ہے نہ خوشی ہے ترے بغیر
محفل تمام سُونی پڑی ہے ترے بغیر
گلشن کے دلفریب مناظر پہ اِن دنوں
اک مُردنی سی چھائی ہوئی ہے ترے بغیر
مر جایئے کہ چار گھڑی اور دیکھئے
اب زندگی یہ سوچ رہی ہے ترے بغیر
تُو ہی نہیں جو جشنِ بہاراں کو کیا کروں
ہر اک خوشی میں طرفہ کمی ہے ترے بغیر
آ جایئے کہ جان سے جانے لگے ہیں ہم
نبضِ حیات آج کھڑی ہے ترے بغیر

ہماری ہر سعی ناکام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
کسی پر پے بہ پے انعام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
مقدر مطلعِ ''وتنام'' کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
پریشاں آج ''انکل سام'' کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
کسی کے روز و شب آہ و فغاں میں صرف ہوتے ہیں
کسی کے بخت میں آرام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
کسی کے سامنے آغاز ہی آغاز ہے لیکن
ہمارے سامنے انجام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
بغیر اُس کی رضا کے گر کوئی پتہ نہیں ہلتا
بشر پھر موردِ الزام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
ادھر جذبِ محبت کی فراوانی کا یہ عالم
اُدھر الفت برائے نام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
سراپا جرم ہیں پھر بھی خدا سے ڈرنے والوں میں
سرِ فہرست اپنا نام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

نام: مسعود الحسن (مرحوم) ولد: پیراں دتہ سلہریا قلمی نام: مسعودؔ پیدائش: 23 جنوری 1940ء بمقام کھوڑی نالڑ، پونچھ۔ تعلیم: میٹرک۔ ادبی زندگی کا آغاز: تیرہ سال کی عمر میں پیشہ: پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل رہے۔ ذریعۂ اظہار: اُردو، پہاڑی۔

یاد

تمھیں تو یاد نہیں مجھ کو یاد ہے لیکن
گلاب راستوں پہ چلنے کی چاہ تھی کس کو
کسے طلب تھی ہواؤں کا رخ بدلنے کی
بدن حصار میں خوشبو کے رنگ بھرنے کی
سیاہ رات کے دامن کو نور کرنے کی
یہ پھول جسم کا کس کی چھُون سے مہکا تھا
کسے یقین تھا ٹوٹیں گی ساری دیواریں

تمھیں تو یاد نہیں مجھ کو یاد ہے لیکن
مجھے تو یاد ہے یہ بھی کہ پھر ہوا کیا تھا

گلاب رستوں پہ کانٹے بچھائے تھے کس نے
کہ کس نے بدلا تھا رُخ سنگ سنگ موسم کا
بدن حصار سے خوشبو چرائی تھی کس نے
کہ کس نے مانگا اُجالا تھا دے کے تاریکی
بدن گلاب کی خوشبو کو کس نے بیچا تھا
بنائی بیچ تھی دیوار ایک چاندی کی
یہ مجھ کو یاد ہے لیکن تمھیں ہی یاد نہیں

انور خان

اُتری شام تو برسا پانی یا اللہ
ہم جیسوں کی یہی کہانی یا اللہ
سورج کی دہلیز پہ آکر ٹھہر گئے
اندھیروں نے کیا ہے ٹھانی یا اللہ
کیوں ہم پر الزام ہے مولا سازش کا
کب تھے ہم دریا طوفانی یا اللہ
اپنے لشکر میں جب صرف بہتر تھے
ہم نے تب بھی ہار نہ مانی یا اللہ
وہ خوشبو کا سودا کرنا چاہتا تھا
ہم نے اُس کی بات نہ مانی یا اللہ
من مندر میں پیار کی کوئی گونج نہیں
بھیج کوئی میرا دیوانی یا اللہ

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: انور خان قلمی نام: انور خان ولد: محمد اسماعیل خان پیدائش: 25 اپریل 1971ء بمقام محلہ ٹونگس، پونچھ تعلیم: ایم اے۔ اُردو۔ ادبی زندگی کا آغاز: دوران ملازمت آل انڈیا ریڈیو پیشہ: لیکچرر اُردو ذریعۂ اظہار: اُردو۔ موجودہ پتہ: مکان نمبر 23 محلہ ٹونگس، وارڈ نمبر 5 پونچھ

شب کے سینے میں کوئی خنجر اُترتا ہی نہیں
اب ہمارے شہر میں سُورج نکلتا ہی نہیں

دور تک پھیلے ہوئے ہیں بے حسی کے دائرے
منجمد احساس کا پتھر پگھلتا ہی نہیں

لفظ کی محفل پریشاں ،حرف کی دنیا خموش
نطق کا دریا مری بستی میں بہتا ہی نہیں

ہم بھی اپنا قد حدِ قد سے بڑھا لیتے مگر
یہ سلیقہ ہم نے جاذبؔ آج تک سیکھا نہیں

قطعہ

ہر کسی چہرے پہ لکھی ہے کوئی تحریرِ غم
جیسے قبروں کے یہ کتبے کوئی پڑھتا ہی نہیں
فصل کٹتی ہی نہیں جاذبؔ عذابِ کرب کی
مضطرب لمحات کا موسم گزرتا ہی نہیں

بشارت جاذب

لغزشوں سے ماورا تُو بھی نہیں میں بھی نہیں
دونوں انساں ہیں خدا تُو بھی نہیں میں بھی نہیں

تُو مجھے اور میں تجھے الزام دیتے ہیں مگر
اپنے من میں جھانکتا تُو بھی نہیں میں بھی نہیں

مصلحت نے کر دیا دونوں میں پیدا اختلاف
ورنہ فطرت کا بُرا تُو بھی نہیں میں بھی نہیں

مختلف سمتوں میں دونوں کا سفر جاری رہا
ایک لمحے کو رُکا تُو بھی نہیں میں بھی نہیں

جرم کی نوعیتوں میں کچھ تفاوت ہو تو ہو
در حقیقت پارسا تُو بھی نہیں میں بھی نہیں

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: بشارت حسین شاہ ولد: سید برکت شاہ ہمدانی قلمی نام: جاذبؔ پیدائش: 11 مئی 1947ء بمقام پوٹھہ ادبی زندگی کا آغاز: دوران ملازمت تعلیم: ایم اے، سماجیات، بی ایڈ ایم اے اُردو ذریعۂ اظہار: اُردو، پہاڑی پیشہ: لیکچرر تاریخ وفات: 16 فروری 2003ء

خوشی کیسی مسرت کیا ہنسی کیا؟
لگی ہو دل میں تو پھر زندگی کیا؟
خوشی انجام ہو تو غم بہت خوب
نتیجہ غم ہو جس کا وہ خوشی کیا؟
محبت تو ہے کارِ سرفروشاں
محبت میں خیالِ زندگی کیا؟
حسینوں کی عنایت پر نہ جانا
فریبِ دوستی ہے دوستی کیا؟
اگر بیزار ہے رِندوں سے ساقی
تو پھر یہ اہتمامِ میکشی کیا؟
جوانی خود ہے اک گہوارہ غم کا
جوانی میں تمنائے خوشی کیا؟
ہمیں کس آرزو سے تک رہا ہے
نہیں ہے یہ دلیلِ عاشقی کیا؟
رُکی جاتی ہیں نبضیں تھم چلا دم
کسراب میرے چلنے میں رہی کیا؟
نہ ڈرائے برقؔ! تُو بدنامیوں سے
نہ رُسوا جو کرے وہ عشق ہی کیا؟

شیو رتن لال برقؔ

تری قدرت کا کیا ہے؟ وہ چاہے ناگہاں کر دے
فلک زیرِ زمیں کر دے زمیں بر آسماں کر دے
بہاروں کو بدل ڈالے خزاں کے رنگ میں یک دم
جو وہ چاہے خزاؤں کو بہارِ بے خزاں کر دے
ہوا کے ایک جھونکے سے اُڑا دے کوہساروں کو
جو وہ چاہے تو تنکے کو بھی کوہِ گراں کر دے
گلستاں کو ویرانہ بنا ڈالے گھڑی بھر میں
جو وہ چاہے تو ہر دشت وجبل باغِ جناں کر دے
فنا کر دے گھڑی بھر میں ہر اک تعمیر آہن کو
جو وہ چاہے تو ہر اک فانی شئے کو جاوداں کر دے
بدل دے بزمِ شادی کو وہ پل بھر میں بزمِ ماتم میں
جو ہو اس کی رضا شامل غموں کو شادماں کر دے
جو وہ چاہے تو صیادوں کو کر دے قید پل بھر میں
نشیمن کو قفس کر دے قفس کو آشیاں کر دے

کچھ شاعر کے بارے میں

نام:شیو رتن لال ولد:بخشی گنشی رام قلمی نام:برقؔ پیدائش: 27مارچ 1935ء بمقام در آبہ سرنکوٹ تعلیم:بی ایس سی ایم بی بی ایس پیشہ:ڈاکٹر ماہنامہ برق کے ایڈیٹر رہے۔گولڈن سوسائٹی آف چلڈرن ڈیولپمنٹ کے صدر تصنیفات:برق و شرر(شعری مجموعہ)روح محبوب(شعری مجموعہ)برق گیتا(ترجمہ)برق رامائین(ترجمہ)موجودہ پتہ:12/13آرام پارک ،کرشنا نگر دھلی

لیاقت نیّرؔ

موسم نیا رنگدار اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
اور رقص میں تلوار اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

ٹوٹی ہیں کئی چوڑیاں تاریکیٔ شب میں
یہ رات گنہگار اُدھر بھی ہے اِدھر بھی

روکے بھی بھلا کون ترے دستِ ستم کو
وحشت کا یہ بازار اُدھر بھی ہے اِدھر بھی

مل کر بھی کئی بار مگر مل نہیں پائے
نمرود کی سرکار اُدھر بھی ہے اِدھر بھی

دیکھے گا یہاں کون یہ جگنو کے تماشے
مہتاب سوگوار اُدھر بھی ہے اِدھر بھی

کس دیس کو ہم چھوڑ کر کس دیس میں جائیں
اجداد کے آثار اُدھر بھی ہیں اِدھر بھی

ہر سمت سے آتی ہے مہک خون کی نیّرؔ
اس خون کی یہ دھار اُدھر بھی ہے اِدھر بھی

دل و جگر کو میرے آ کے طُور کرتا جا
اندھیری رات ہے اس کو تو نُور کرتا جا

گزر گئے ہیں زمانے جو تیری فرقت میں
کبھی تو آ شبِ ہجراں کو دور کرتا جا

رہے نہ شورشِ فردا نہ یاد ماضی کی
دلِ حزیں کا مداوا ضرور کرتا جا

بچا بچا کے ہے رکھا جسے زمانے سے
وہ شیشہ دل کا مرے آ کے چُور کرتا جا

ہمارے دم سے ہے رسمِ وفا زمانے میں
یہ اعترافِ حقیقت ضرور کرتا جا

کچھ شاعر کے بارے میں

لیاقت حسین شاہ ولد: عنایت حسین شاہ قلمی نام: لیاقت نیّرؔ پیدائش: 6 اگست 1973 تعلیم: ایم اے اُردو۔ ادبی زندگی کا آغاز: کرشن چندر میموریل بزمِ ادب کی رکنیت کے ساتھ پیشہ: مدرس ذریعۂ اظہار: اُردو پہاڑی موجودہ پتہ: ساکن دھندک، تحصیل سرنکوٹ، پونچھ (جموں وکشمیر)

مختار الدین ظہیر

زمانہ کس طرف کو چل پڑا ہے
کہ رستہ عافیت کا دوسرا ہے
بشر جب خود زمانے کا خدا ہے
خدا بھی اب تماشہ دیکھتا ہے
ابھی ہم راستوں کو کھوجتے ہیں
انہوں نے منزلوں کو پالیا ہے
قفس میں بلبلوں کو بند کر کے
وہ پوچھیں اب تمہارا حال کیا ہے
سُنوں باہر کی آوازوں کو کیسے
میرے اندر بھی کوئی چیختا ہے
حساب اب تک لگایا ہے کسی نے؟
سمندر کتنے دریا پی گیا ہے

میں تمہیں کافر لکھوں گا پارسا کے ساتھ ساتھ
اجنبی کہنا پڑا ہے آشنا کے ساتھ ساتھ
یہ حماقت ہے کوئی جو موت سے ڈرتا رہے
زندگی بھی جان لیوا ہے قضا کے ساتھ ساتھ
آرہے ہیں اب وہ یہ احساس ہی جیتا رہے
دل دھڑکتا جائے ہے آوازِ پا کے ساتھ ساتھ
آج کے اس دور میں کچھ بھی یہاں خالص نہیں
اُڑ رہی ہے گرد بھی موجِ ہوا کے ساتھ ساتھ
زُلف چہرے سے ہٹی احساس یہ پیدا ہوا
چاند ہے محوِ سفر کالی گھٹا کے ساتھ ساتھ
جو ادائیں نیک تھیں اُن کو بھلاؤں کس طرح
باوفا بھی تو رہے ہو، بے وفا کے ساتھ ساتھ

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: مختار الدین اعوان۔ قلمی نام: مختار الدین ظہیر۔ پیدائش: 10 اپریل 1972ء۔ بمقام سنئی۔ تعلیم: انٹر میڈیٹ: ادبی زندگی کا آغاز: دوران سروس۔ پیشہ: کانسٹیبل جموں و کشمیر آرمڈ پولیس۔ ذریعۂ اظہار: اُردو، گوجری، پہاڑی۔ موجودہ پتہ: موضع سنئی، تحصیل سرنکوٹ، ضلع پونچھ (جموں و کشمیر)

احتشام بٹ

وہ جو پلکوں کو کئے اشکوں سے تر رکھتے ہیں
کیا مری طرح کوئی دردِ جگر رکھتے ہیں

پہلے روتے تھے نہ تھا کوئی ٹھکانہ اپنا
اب تو اس بات کا رونا ہے کہ گھر رکھتے ہیں

ہم کو معلوم ہے معلوم ہمیں کچھ بھی نہیں
بے خبر ہو کے بھی ہم سب کی خبر رکھتے ہیں

ہم نے تقدیر ہی کچھ ایسی ہے پائی یارو
وہ زمیں ہٹتی ہے ہم پاؤں جدھر رکھتے ہیں

یہ خبر ہے کہ نہیں آئیں گے وعدہ کر کے
اُن کے آجانے کی اُمید مگر رکھتے ہیں

میرے اشعار پڑھے غیر نے اپنا کہہ کر
یہ سکوں دل کو ملا اچھا اثر رکھتے ہیں

مُنسلک جن سے ہو تم اے احتشؔام وہ تو
در پہ تاروں کو بلانے کا ہنر رکھتے

غم نہیں اس کا کوئی داد ہنر دیتا ہے
میرے ہونے کی اگر مجھ کو خبر دیتا ہے

نیند آتی نہیں اسکو بھی میری طرح
یہ صدا مرغ سحر وقت سحر دیتا ہے

کر کے برباد کئی گاؤں ہوا آباد
غور سے سُنیے تو آواز نگر دیتا ہے

آئینے لے کے چلا ہوں پتھروں کے شہر میں
ڈھونڈنے کو گھر چلا ہوں بے گھروں کے شہر میں

ہر طرف بربادیاں ہیں ہر طرف لاشوں کا ڈھیر
سر بچانے جا رہا ہوں خنجروں کے شہر میں

کیا لکھوں کیونکر لکھوں کیسے لکھوں میں احتشؔام
بے سر و ساماں پڑا ہوں راہبروں کے شہر میں

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: احتشام بٹ۔ ولدیت: صفدر علی بٹ۔ تاریخ پیدائش: یکم جون 1971ء۔ بمقام منڈی، پونچھ۔ تعلیم: انٹر میڈیٹ۔ پیشہ: کمپیوٹر آپریٹر۔ ذریعۂ اظہار: اُردو۔ پتہ: وارڈ نمبر 4 محلہ کھوڑی ناڑ۔ پونچھ۔ جموں و کشمیر

سردار بشیر احمد صدیقی

دنیا کو دیکھ تو اور ذرا اپنا حال دیکھ
اے بے خبر ہے کیسی زمانے کی چال دیکھ
اغیار جاگتے ہیں مگر سو رہا ہے تو
بے سُود کٹ رہے ہیں ماہ و سال دیکھ
ہاں دیکھ تیرے شہر میں کیسی ہے دھوم دھام
کیا کر رہی ہے خلقِ خدا قیل وقال دیکھ
پروانہ سوئے چرخ ہے وہ دیکھ کسی کا
کوئی ہے محوِ کسبِ علوم وکمال دیکھ
ہیں گامزن ہر آن سبھی تو بزعم خود
منزل سے بے خبر مگر جاہ و جلال دیکھ
ہر سُو ہے جھوٹ مکر و فریب اور جور و ظلم
حیوان سے انسان کا بدتر ہے حال دیکھ
کیا تجھ کو یاد ہے تیری مخلوق کی غرض
اب تجھ پہ چھا گیا ہے کیوں رنج و ملال دیکھ
اشرف تھا مخلوقات سے لیکن سوئے گناہ
ہردم رواں ہیں کیوں تیرے اہل وعیال دیکھ
ہاں دیکھ آج کس قدر اغیار کے در پر
اپنا دراز کرتا ہے دستِ سوال دیکھ

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: سردار بشیر احمد صدیقی۔قلمی نام: صدیقی۔ولدیت: منشی غلام حسین خان۔پیدائش: 2جون 1934۔تعلیم: ایم اے بی ایڈ ایم او ایل۔تصنیفات: دیوان صدیقی، جوق در جوق(ناول) مثنوی کارواں، تاریخ مغل قبائل، بنتِ کشمیر(ناول) ننھا مجاھد(ناول) ناقوس(ڈرامہ) وغیرہ۔موجودہ پتہ: سہڑہ، ضلع پونچھ۔پاکستانی کشمیر۔

بشیر بٹ

قریۂ جاں میں جسے ہم نے بسا رکھا ہے
دیکھو اُس کو کہ کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے
ہم نے سینے میں دلِ زار چھپا رکھا ہے
تم کو کیا ہے، یہ بھلا ہے کہ بُرا رکھا ہے
شامِ غم آج بدلتی شبِ عشرت میں
مسئلہ کل کے لئے اُس نے اٹھا رکھا ہے
ظلمتیں سیخ بپا ہو کے تڑپ اٹھی ہیں
کس نے ہر موڑ پہ اِک چاند سجا رکھا ہے
اپنے محبوب کی دل جوئی کو حسبِ توفیق
ہم فقیروں نے بھی اک تاج بنا رکھا ہے
یہ الگ بات زمیں مل نہ سکی ہم کو کہیں
آسمانوں کو مگر سر پہ اُٹھا رکھا ہے
کج ادائی، ستم پروری وشوخ نگہ
اور اُس چشمِ فسوں کار میں کیا رکھا ہے
ہے جنوں صاحبِ اِدراک بقولِ اقبالؒ
ہم نے یہ پیغام سبھی کو سُنا رکھا ہے

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: بشیر حسین۔ قلمی نام: بشیر بٹ۔ پیدائش: یکم اکتوبر 1947ء۔ تعلیم: ایم اے اُردو۔ بی ایڈ۔ ادبی زندگی کا آغاز: کشمیری شاعری کے ساتھ۔ پیشہ: لیکچرر۔ ذریعۂ اظہار: اُردو۔ کشمیری موجودہ پتہ: وارڈ نمبر 3 محلہ کماں خان، پونچھ (جموں وکشمیر)

غلام حسین شاہ عاصیؔ

دین و دنیا کی سب نعمتیں مل گئیں
جن کو قسمت سے خیر الوریٰ مل گئے

اس سے بڑھ کر اُنہیں اور کیا چاہیے
جن کو دو جگ کے شاہ شہا مل گئے

اُن کو تاجِ سکندر ملا کہ جنہیں
اصل میں وہ شہِ دوسرا مل گئے

کیا بتاؤں میں کتنے ہیں وہ خوش نصیب
جن کو ہیں خاتم الانبیا مل گئے

مشکلوں میں اُنہیں غم ہے کس بات کا
جن کو مشکل میں مشکل کشا مل گئے

ہو گئے دُور سب دُکھیوں کے آزار
جب سے وہ رحمتِ بے بہا مل گئے

اندھی آنکھیں تھیں لاکھوں ہوئیں دیدہ ور
جن کو اک بار نورِ خدا مل گئے

دشمنوں کی تجھے عاصیؔ کیا فکر ہے
گر تجھے اب وہ شیرِ خداؑ مل گئے

حبیبِ خدا مصطفیٰ آرہے ہیں
شہنشاہِ ہر دوسرا آرہے ہیں

مچایا ہے غُل عرش پر قدسیوں نے
مُبارک حبیبِ خدا آرہے ہیں

ملائک صفیں باندھ کر منتظر تھے
کہ باعثِ ارض و سما آرہے ہیں

وہ صاحبِ طٰہٰ وہ صاحبِ یٰسین
شہِ دوسرا مرحبا آرہے ہیں

خبر جنکی موسیٰؑ و عیسیٰؑ نے دی تھی
وہ اب رحمتِ بے بہا آرہے ہیں

ہزاروں برس جو ہوئے قبلِ آدم
اِدھر خاتم الانبیاؐ آرہے ہیں

بدولت ہے جن کی دو عالم یہ جگمگ
عجب ہے کہ نُورِ خدا آرہے ہیں

ہیں مشتاق جن کے سبھی حُور و غلماں
وہ محبوبِ ربِ العلیٰ آرہے ہیں

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: غلام حسین شاہ ولدیت: سید لعل حسین شاہ قلمی نام: عاصیؔ پیدائش: 1945ء بمقام موضع سانگلہ، سرنکوٹ تعلیم: انٹر میٹرک پیشہ: زمینداری ذریعۂ اظہار: اُردو، فارسی، پنجابی موجودہ پتہ: ساکن سانگلہ، سرنکوٹ، پونچھ (جموں و کشمیر)

زخم ۔ دل بھر گیا اب نیا دے مجھے
درد پہلے سے بھی کچھ سوا دے مجھے
کھل اٹھیں پھر سے زخموں کے تازہ کنول
کوئی پیغام ایسا صبا دے مجھے
میں ہوں تیشہ بکف حوصلہ دے مجھے
عقل کی زد میں عہد ۔ وفا آ گیا
اے جنوں کوئی کچا گھڑا دے مجھے
دار کے راستے جس کو معلوم ہوں
اے زمانے تو ایسی انا دے مجھے
میرے پیچھے بھی لشکر ہے فرعون کا
وقت کے نیل اب راستہ دے مجھے
آگ نمرود کی ہو کہ نوک ۔ سناں
آگہی کی جو چاہے سزا دے مجھے
آگ میں ڈال یا کربلا دے مجھے
درد نے یہ کہا ہے بنام ۔ خدا
اپنے دل میں تو خاورؔ جگہ دے مجھے

ذوالفقار خاورؔ نقوی

پھول چہرے پہ ہیں نزہتوں کے بھنور
گرم سانسوں میں ہیں نکہتوں کے بھنور
کچھ قباحت نہیں ڈوبنے میں مجھے
گہری آنکھوں میں ہیں چاہتوں کے بھنور
یاد کی سیج پر تو رہا رات بھر
آنکھ میں ہیں گلابی رُتوں کے بھنور
عشق نوخیز کو گھیر لیں نہ کہیں
واہموں کے یہ طوفاں نفرتوں کے بھنور
ناخدا اب ذرا بادباں کھول دے
رہ میں پڑنے لگے تہمتوں کے بھنور
تجھ کو خاور ملا دوستی کا صلہ
یاد کی تلخیاں ہجرتوں کے بھنور

کچھ شاعر کے بارے میں

نام: ذوالفقار نقوی۔ قلمی نام: خاورؔ نقوی۔ سکونت: ہجیرہ، پاکستانی کشمیر۔ خاور نقوی صاحب کے مکمل کوائف سرحدی تقاضوں کے باعث دستیاب نہیں ہوئے۔ ان کا کلام ان کے ایک شعری مجموعے سے لیا گیا ہے جنہیں ادبیات پونچھ کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۹۴۷ء سے قبل

پونچھ کے گمنام اُردو شعرا کا کلام

مندرجہ ذیل انتساب و دیباچہ معہ غزلیات 1947ء سے قبل کے اُن شعراء کا ھے جن کے متعلق آج کوئی کچھ نہیں جانتا۔لیکن مرحوم دیانند کپور صاحب نے اس وقت اس کلام کو اپنے ھی پریس میں "خیاباں" کے عنوان سے چھاپ کر کتابچہ کی شکل میں حکمرانِ وقت کو پیش کیا تھا۔اور اس طرح یہ ایک تاریخی اثاثہ بن چکا ھے۔ادبیاتِ پونچھ کے آئیندہ اوراق میں ھم معہ انتساب و پیش لفظ ان غزلیات کو پیش کررھے ھیں۔افسوس ہے کھنا پڑتا ھے کہ ان شعراء کی زندگی کے شب و روز کے بارے میں باوجود کوشش خاطر خواہ معلومات دستیاب نہیں ہو سکیں۔

دیباچہ

پونچھ ایک ایسا دور دست مقام ہے جہاں ادب وشعر کے ان ہنگاموں کی صدا ابھی نہیں پہنچی جن سے لکھنو، دہلی، لاہور، حیدرآباد کی محفلیں گرم ہیں۔لیکن پہاڑوں سے گھری ہوئی یہ سرزمین ایسی خصوصیات رکھتی ہے جن کی بدولت شعر کا جذبہ خود بخود دل میں پیدا ہوتا ہے۔اس کی معطر فضاؤں، سرسبز وادیوں، شاداب میدانوں، بلوریں جھرنوں، اور برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کو دیکھ کر طبیعت مین بے اختیار وہ لطیف اور پاکیزہ جذبات پیدا

ہوتے ہیں۔ جو اگر موزوں ہو جائیں تو ان پر شعر کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ طغرا، ایک ایرانی نژاد شاعر، جب کوہستانی منازل قطع کرتا، میدانوں اور وادیوں سے گزرتا، اس نزہت آفریں زمین تک پہنچا تو اسے یہاں کی خاک میں آتش کدۂ نو بہار اور رکن آباد مصفا کا حسن نظر آیا، چنانچہ اُس نے جی کھول کے پونچھ کے مناظر کی تعریف کی۔ اس مختصر تمہید سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ اہل ذوق سمجھ لیں کہ یہ سرزمین اگر ادب و شعر کی دنیا میں گمنام رہی تو اسکا باعث محض یہ چیز تھی کہ یہاں کے اہل سخن کو اُردو پر جو بھارت کی قومی زبان ہے۔ قدرت حاصل نہ تھی۔ ورنہ فطرت کی فیاضی نے، ذوق سخن کی متاع گراں مایہ عطا کرنے میں کوتاہی نہیں کی تھی۔ یہ چند اوراق پونچھ کے نوجوان شعرا کے نتائج افکار پر مشتمل ہیں۔ ممکن ہے ان میں ارباب نظر کو خامیاں اور اسقام نظر آئیں لیکن ان خامیوں کے پردے میں فطرت کا حسن اور شاعری کا صحیح ذوق نظر آئے گا۔ اگر آپ خامیوں سے قطع نظر کر کے صرف اسی پر اپنی ساری توجہ مرکوز کرنا چاہیں تو غالب کا یہ شعر آپ کی رہنمائی کرے گا۔

نالہ پابند نے نہیں ہے　　　فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

سیکریٹری بزم مشاعرہ، پونچھ

انتساب

ہم اس مجموعہ کو شری حضور ہائی نس راجہ جگ دیو سنگھ بہادر، والیٔ پونچھ کی بارگاہِ عالی میں پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ جن کے سحاب بخشش کی گہر پاشیاں کشت ادب کی کفیل ہیں۔ اور جن کے دریائے عطا کی ایک موج پونچھ سے نکل کر لاہور کے شعرستان کو بھی شاداب کر رہی ہے۔

گذارندہ

دیانند کپور

سیکریٹری بزم مشاعرہ، پونچھ

ستارے کیوں پریشاں ہیں یہ ذرّوں میں تڑپ کیوں ہے
شہیدِ جستجو عالم ہے رازِ دلربائی کا
فسوں ہے بزم میں تیری کہ جادو ہے نگاہوں کا
لبِ سائل پہ رہ جاتا ہے شکوہ بے وفائی کا
وفا کی آرزو اے دردِ تمہیدِ جفا نکلی
نتیجہ خار ہی نکلا جنوں کی آشنائی کا

یارب ہو خیر دلِ بیقرار کی
بیٹھے ہیں زُلفِ ناز پریشاں کئے ہوئے
مضمونِ حالِ دل تھا سرشکِ [illegible]
خاموشی زباں، مگر عنواں کئے ہوئے
خرمن کے جمع ہوتے ہی ٹوٹی جو بجلیاں
چرخِ کہن تھا دیر سے ساماں کئے ہوئے
اُن کو جو سیرِ گُل کی ہے عادت ہم اس لئے
دامن ہیں اشکِ خوں [illegible] کئے ہوئے
دعوت کو برقِ [illegible] بادہ ہائے دل
رکھتے ہیں طشتِ سینہ [illegible] عریاں کئے ہوئے
ایفائے عہدِ قتل پہ [illegible] اکتفا کیا
تھے ورنہ اس نے اور بھی پیماں کئے ہوئے
کچھ کھل سکا نہ رازِ دلِ زار بزم میں
جاتے ہیں دردِ سینہ میں پنہاں کئے ہوئے

طرزِ جنوں میں طُرفہ ہیں ساماں کئے ہوئے
آوارہ دشت، چاک گریباں کئے ہوئے
نکلے تلاشِ یار میں تا کے سبھی مکاں
وہ لامکاں میں ذات ہے پنہاں کئے ہوئے

ہر نقشِ پا پہ جھک گئے کتنے سرِ نیاز
سجدوں کے سے نشاں ہیں تری رہگزار میں
کیوں ہو رہا ہے زیست کا دھوکہ لحد میں آج
کس کا گزر ہوا ہے اس اُجڑے دیار میں
کچھ آرزوئیں خون شدہ، کچھ مردہ حسرتیں
رکھا ہی اور کیا ہے کسی کے مزار میں
آنکھیں ہیں در پہ دل میں تصور نگاہ میں شوق
کتنی مسرتیں ہیں ترے انتظار میں
آخر کو جھک گیا درِ پیرِ مغاں پہ شیخ
کیا چاشنی ہے کثرتِ مئے کے خمار میں
یہ بے سمجھ ہے مجرمِ تقصیر میں ہی ہوں
کچھ کہہ دیا ہے آپ کو فصلِ بہار میں
کوئی نہ کوئی ڈھونڈ ہی لی صورتِ نیاز
کیا سوجھتی ہے شیخ کو فصلِ بہار میں
زخموں نے ہنس کے اب وہ ناصرؔ کھلائے گل
موسم بہار کا ہے دلِ داغدار میں

نخلِ بریدہ سر ہوں میں، فصل بہار میں
بے برگ وگل شجر ہوں چمن کے حصار میں
نے عندلیب گل ہوں، نہ پروانہ گردِ شمع
اُس بت کا نقش پا ہوں سرِ رہگذار میں
کس برق وش نگاہ سے دو چار ہو گیا
بجلی کی سی تڑپ ہے دل بے قرار میں

ہیں دشت میں کبھی تو کبھی کوہسار میں
اچھی گزر رہی ہے ترے انتظار میں
ذرّوں میں کیوں ہے تابش خورشید جلوہ گر
کیا جل رہے ہیں یہ بھی ترے انتظار میں
رضواں سے ہوگی گفتگو میری یہ بعدِ مرگ
جنت ہے کیا؟، رہیں گے یہیں کوئے یار میں
اک کھلبلی سی بزم میں آتے ہی مچ گئی
ناکام حشر تھا کہیں انداز یار میں
نا آشنا یہ گوش حقیقت نیوش ہیں
ورنہ بھرا ہے نغمۂ حق تار تار میں
تکلیف و عیش لازم ملزوم ہیں مگر
کس طرح گل کی کٹتی ہے پہلوئے خار میں
آباد پھر ہوا مرا کاشانۂ قلوب
تشریف لائے آپ جو اجڑے دیار میں

گاہے امید وصل گہے کاوش فراق
اچھی گزر رہی ہے ترے انتظار میں
دردِ دل حزیں کی دوا اور ہی تو ہے
احقرؔ عبث دوا کے تو ہے انتظار میں

ہو تیرے قدِ راست سے کس کا مقابلہ
یہ شان تنگ میں ہے نہ ہے دیودار میں
میرا دماغ عرش بریں تک ہے جا چکا
تم جانتے ہو جا رہا ہوں کوئے یار میں
دیکھو قدم سنبھل کے رکھو بزم شعر میں
ہدہدؔ بھی آرہا ہے اُڑا اپنے ڈار میں

آثارِ انتشار تھے مضمر بہار میں
گل کو خلش تھی خار کی بو اضطرار میں
خاکِ رہِ وفا ہوا مرنے کے بعد بھی
تھا شوق کس قدر دلِ اُلفت شعار میں
ابھرے جبین شوق سے سجدے ہزار ہا
سر بے خودی میں جھک گیا جب پائے یار میں
دست جنوں تھا درد کی تصویر سربسر
لپٹے ہوئے تھے پارۂ دل خارخار میں
لے جاؤں اپنے ساتھ میں سرمایۂ حیات
یاں دفن کردو حسرتیں میرے مزار میں
فریاد ہے نہ نالہ، بس اک آہ سرد ہے
بادِ سحر تو لے جا اسے بزمِ یار میں
اٹھتا ہے ساتھ آہ کے اے درد دودِ دل
ہے قلبِ نیم سوختہ اپنے کنار میں

حاصل ہوا وصال ِ صنم انتظار میں
چمکا ہے چاند غم کی شب ِ تیرہ وتار میں
سوکھے چمن میں آج وہ آئی ہے تازگی
گویا خزاں بدل گئی فصل ِ بہار میں
کاشانہ دل اپنا ہوا طور سے سوا
مسکن کیا جو آپ نے آ کے دیار میں
انجان بن کے پوچھتے ہیں حال دل وہ یوں
کٹتی ہے عمر کس طرح اب کوہسار میں
کیا کیا خیال اور تصور ہیں اے رفیق
اچھی گزر رہی ہے ترے انتظار میں

حلقۂ گیسوئے خم دار کو بل کھانے دو
گرۂ مشکل دل اور بھی الجھانے دو
تابشِ حسن سے بیتاب ہے محفل ساقی
زُلف کو چہرۂ روشن پہ بکھر جانے دو
چھا گئی ہیں دل ِ مضطر پہ گھٹائیں غم کی
اشکِ خوں چشم کو اے دوستو برسانے دو
نہ اٹھاؤ ستم ایجاد کے در سے ہرگز
پائے نخوت سے سرِ شوق مسل جانے دو
جور ہے چرخ کے مٹتا دل ِ ناشاد نہیں
جس قدر چاہے اسے بجلیاں برسانے دو
سر ہے اک بارِ گراں گردن ِ بے مایہ پر
خنجر ِ ناز سے اس کو بھی اُتر جانے دو

آہ نے بن کے خزاں اپنا اجاڑا گلشن
شکوۂ جور ِ فلک ذکر ِ جفا جانے دو
دم ِ آخر ہے کشاکش میں تڑپتا بسمل
آپ آتے جو نہیں تیر ِ قضا آنے دو
کنج ِ صحرا کو ہی اے دردؔ بنا لو مسکن
"خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو"

کسی سے بے وفا نے کب وفا کی
عبث فریاد ہے لب پر جفا کی
نگاہ ِ ناز نے سمجھایا جو کچھ
زباں میں تاب کب اس کے ادا کی
جو الجھے اور بھی شانۂ گیسو
میری مشکل پسندی نے دعا کی
ترے تقویٰ کے سب قائل ہیں واعظ
مگر آتی ہے بُو تجھ سے ریا کی
یہ منظر دیدنی تھا آخرِ شب
تن بسمل نے جاں کیوں کر رہا کی
عیاں ہے داغ ِ لالہ رنگ گل سے
چمن ہے داستاں اہلِ وفا کی
وفور ِ غم ہے تمہید ِ مسرت
خزاں تقریب ہے باد ِ صبا کی

نہ چھوڑا دشت ِ تنہائی میں بھی ساتھ
اگر کی درد نے مجھ سے وفا کی
تھا چارہ ساز ہر خار ِ بیاباں
مریض ِ عشق پر رحمت خدا کی
کلام ِ دردؔ ہے اک قصۂ درد
کہاں رنگینیاں طبع ِ رسا کی

دل وہ ہے جس میں شوق حسن وزیبائی نہ ہو
حسن کیا جس میں کہ شوخیٔ ناز و رعنائی نہ ہو
بے نیازی حد سے گزری اب نہیں تاب ِ عتاب
کاش خوداری ہو تجھ میں اورخود آرائی نہ ہو
ترک ِ آبادی میں لذت ہے جنوں میں عیش ہے
شوق ِ لیلیٰ ہے عبث جب دشت ِ پیمائی نہ ہو
دیکھ پاتے ہیں کہیں تصویر ِ روئے شوخ جو
پھر نہ کہتے تم مجھے اے دردؔ سودائی نہ ہو

شب ِ فرقت تصور سے کئی اک کام لیتے ہیں
رقیبوں سے نہاں بوسے رخ ِ گلفام لیتے ہیں
رسائی کب میسر ہے تری محفل میں اے جاناں
دل ِ محزوں کی تسکیں کو ترا ہی نام لیتے ہیں
بیان ِ دردِ دل غیروں کا سن سن مسکراتے ہیں
میری نوبت جو آتی ہے کلیجہ تھام لیتے ہیں
گل ِ مقصود تک کانٹوں نے میری دستگیری کی
گلوں سے خار بہتر ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں

تھے رشک ِ باغ دل ِ داغدار کے
آئینے ہم بنے ہوئے ہیں حسن ِ یار کے
لو پھر چلے ہیں در پہ ہم اس نو بہار کے
لو پھر ہیں مہمان کسی گلعذار کے
لو پھرہمارے چاند میں کھجلی ہے عشق کی
لو پھر وہی جوتے ہیں کسی کفش کار کے
تھا اعتبار تم پہ بھروسے میں آ گئے
واقف تو ہم بھی تھے ترے اس کاروبار کے
افشائے راز ِ عشق بھلا کس طرح نہ ہو
چیخیں نکال دے کوئی جب مار مار کے
بھاگا کبھی پھنسا کبھی زخمی ہوا کبھی
احوال اور کیا ہیں دل ِ بیقرار کے
اک مختصر سی بات تھی افسانہ کر دیا
اعجاز دیکھو ہدہدؔ افسانہ کار کے

کیا کیا نہیں ستم سہے اس نو بہار کے
بندے بنے جو اس کے تو نوکر ہزار کے
گر جانتے کہ جھوٹ میں مشاق خوب ہو
دھوکے میں آتے ہم نہ کبھی اعتبار کے
اے دل نہ بیقرار ہو راحت ہے رنج میں
کھلتا ہے گل ہمیشہ ہی پہلومیں خار کے
بلبل کے نالے ڈھونڈ رہی ہے شمیم ِ گل
اب کے بھی دن یونہی گئے فصل ِ بہار کے

دردِ دروں کا وعدۂ درماں کئے ہوئے
ثابت غلط ہوئے ہیں وہ پیاں کئے ہوئے
افسوس جمع ہو نہ سکا مایۂ حیات
اب سوچتا ہوں سر بہ گریباں کئے ہوئے
طبع حریص مائلِ عصیاں ہے رات دن
تاراجِ مال و دولت و ایماں کئے ہوئے
تیرے فراق میں جو میری آنکھ سے گرا
وہ قطرہ ہی ہے وسعتِ طوفاں کئے ہوئے
یہ غم ہی میرا یار ہے اور غم ہی غمگسار
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
آتا نہیں ہے باز مچلتا ہے رات دن
یہ طفلِ اشک دستِ بداماں کئے ہوئے
احقرؔ اسی زمیں میں غزل اورایک لکھ
کچھ سن تو لے خیال کو جولاں کئے ہوئے

وہ اُن کا رعب حسن اور کم زبانی کا یہ عالم ہے
زباں تک حالِ دل کولاتے لاتے تھام لیتے ہیں
کوئی حشمت کا دیوانہ کوئی شوکت کا شیدائی
یہ ہم ہیں آپ سے جو دردِ دل انعام لیتے ہیں
دلِ محزوں کا مونس اور رفیقِ کنجِ تنہائی
تصور سے تیرے اے عشق اتنے کام لیتے ہیں
کوئی کہتا ہے دیوانہ کوئی کہتا ہے سودائی
تمہارے عشق میں دنیا کے سب الزام لیتے ہیں
موثر جذبہ کیسا ہے تڑپ کتنی موثر ہے
وہ اپنی بزم میں احقرؔ تمہارا نام لیتے ہیں

دیارِ عشق میں ہم سا نہ ہوگا مشتری کوئی
عوض اک بوسہ کے ہم سینکڑوں دشنام لیتے ہیں
وفا کی آرزو ممکن نہیں ہے اس جفا جو سے
عبث ہم مول سودائے خیالِ خام لیتے ہیں
گھسیٹا جاتا ہے دیوانہ تیرا دشتِ وحشت میں
''گلوں سے خار بہتر ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں''
لٹایا مال و دولت اور دنیا میں ہوئے رُسوا
تمہاری عشق بازی میں یہی انعام لیتے ہیں
ہماری فاقہ مستی داد کے قابل نہ ہو کیونکر
نہیں روٹی میسر پھر بھی مئے کے نام لیتے ہیں
گلوں سے کیسی ہمدردی ہے ہدہدؔ تیری گلشن میں
جھکا گل شاخ سے منقار میں وہ تھام لیتے ہیں

KRISHAN CHANDAR

Phone 537500

THE NICHE,
ST. FRANSIS AVENUE,
SANTACRUZ (WEST),
BOMBAY—400 054.

کرشن چندر کا عکسِ تحریر

14. 4. 75

مکرمی محمد ایوب شبنم۔ آداب۔ عرصہ ہوا پونچھ سے آپ کا [illegible]

"ستاروں سے آگے" کے دو نمبر شمارے ملے تھے۔ پھر ایک

لمبا وقفہ۔ اب تارک رام آنند کا خط جموں سے آیا ہے۔ کہ یہی

رسالہ اب جموں سے شائع ہوگا۔ مجھ سے کوئی نئی یا پرانی تخلیق

مانگی ہے۔ نئی تخلیق تو کوئی حاضر نہیں ہے۔ پرانی تخلیق چاہتے

[illegible] بھجوا دوں گا۔ تارک رام آنند کو خط لکھ رہا ہوں۔

Kotli Colony Jammu-5 کے پتے پر۔ اگر یہ پتہ صحیح نہ ہو۔

تو صحیح پتہ لکھیے۔ خط دوبارہ لکھ دوں گا۔

میں دوبارہ پونچھ آنا چاہتا ہوں۔ میرا [illegible] مرحوم مہندر ناتھ کی

اچانک وفات نے راستہ بند کر دیا۔ مگر اب پھر ارادہ

ہے [illegible] دو چار ماہ پونچھ اور سورن کوٹ

میں رہنا چاہتا ہوں۔ پونچھ جب [illegible] کا ارمان

۱۴ اپریل ۱۹۷۵ء کو تحریر کردہ کرشن چندر کا ایک خط

محبی محمد ایوب شبنم۔

آداب!

عرصہ ہوا پونچھ سے آنے کے بعد "ستاروں سے آگے" کے دو ایک شمارے ملے تھے۔ پھر ایک لمبا وقفہ۔ اب مالک رام آنند کا خط جموں سے آیا ہے۔ کہ یہی رسالہ اب جموں سے شائع ہوگا۔ مجھ سے کوئی نئی یا پرانی تخلیق مانگی ہے۔ نئی تخلیق تو کوئی حاضر نہیں ہے۔ پرانی تخلیق کا انتخاب کر کے بھجوا دوں گا۔ مالک رام آنند کو خط لکھ دیا ہے۔ Kotli Colony Jammu-5 کے پتے پر۔ اگر یہ پتہ صحیح نہ ہو۔ تو صحیح پتہ لکھیں۔ خط دوبارہ لکھ دوں گا۔

میں دوبارہ پونچھ آنا چاہتا ہوں۔ برادرِ مرحوم مہندر ناتھ کی اچانک وفات نے اب تک نہ آنے دیا۔ مگر آنے کا ارادہ ہے اگر زندگی نے وفا کی۔ دو چار ماہ پونچھ اور سورن کوٹ میں رہنا چاہتا ہوں۔ پونچھ میں تو پروین کمار مینی کا مکان ہے مگر میں زیادہ عرصہ سرن کوٹ میں قیام کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ارادہ ہے وہاں کچھ ماہ رہ کر پونچھ کے ادیبوں کی ایک کوآپریٹو بنا کر ایک پریس اور اشاعت گھر بنانا ہے جس کے ذریعے پونچھ کے علاقے کے ادیبوں کا رسالہ چھپ سکے اور ان کی کتابیں منظرِ عام پر آسکیں۔ اس سلسلے میں کشمیر گورنمنٹ سے بھی مدد حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کروں گا۔ 18 اپریل کو شیخ محمد عبداللہ صاحب بمبئی آرہے ہیں۔ پانچ دن کے لئے۔ ان سے ذکر کروں گا۔

اس کے علاوہ سرن کوٹ میں رہ کر اپنی سوانح عمری بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے اگر کہیں سے کرائے پر دو یا تین کمروں کا مکان حاصل ہو سکے تو بہت بہتر ہوگا۔ لکھیں کہ کرایہ کیا ہوگا۔ دو کمروں اور تین کمروں کا۔ ماہانہ۔ اور اگر سورن کوٹ میں کسی صاحب سے زمین Lease پر لے کر ایک کچا کوٹھا تعمیر کیا جائے تو اس کی لاگت کیا ہوگی۔ ٹھیک ٹھیک معلوم کر کے صحیح صورتِ حال سے واضح کریں۔ کسانوں جیسا کھلا گھر، پھر باتھ روم اور ٹائلٹ کے مسئلے کا کیا حل ہوگا۔ کیا سرن کوٹ میں جمعدار بھنگی وغیرہ ملتے ہیں؟ میں ایک ایسی جگہ چاہتا ہوں جہاں میں الگ سکون سے بیٹھ کر لکھ سکوں اور پونچھ کے ادیبوں کو اکٹھا کر کے ان کی انجمن کی بنیاد رکھ سکوں۔ زندگی کے آخری چند ماہ و سال باقی ہیں اپنے ہم وطن دوستوں کے لئے کچھ کام کر جاؤں۔ تمام کوائف سے مطلع کریں۔

مخلص

کرشن چندر

سید میر قاسم (وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر) کا ایک خط صدر کرشن چندر میموریل بزم ادب سرنکوٹ کے نام

CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR

نمبر CMS(Genl)/21/73
سری نگر،
۳۰ مئی ۱۹۷۳ء

شمیم صاحب، تسلیم،

آپ کا ۲۱ مئی کا خط ملا۔

یہ جان کر مسرت ہوئی ہے کہ بزم ادب سرن کوٹ ایک کل ہند ادبی کانفرنس کا اہتمام کر رہی ہے اور میں آپ لوگوں کے اس ارادہ اور ولولے سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ سورن کوٹ ایسے پسماندہ علاقے میں شمع ادب فروزاں کرنے کا کام لائق صد تحسین ہے۔

میں دعا کرتا ہوں کہ آپ اس عظیم مقصد میں کامیاب ہوں۔

کچھ اہم سرکاری مصروفیات کی وجہ سے میں کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ بہر حال میری نیک خواہشات آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔

پیار کے ساتھ۔

آپ کا مخلص
میر قاسم

جناب [illegible]
جنرل سیکرٹری [illegible]
سرنکوٹ [illegible]

جناب محمد ایوب شبنم کو ''افسانہ نگار'' اور صحافی کے طور پر جانتا ہوں، شعر و ادب کے حوالے سے پونچھ کی ایک پوری نسل کی تعمیر میں اُن کا اہم کردار رہا ہے، تاہم ان کا نیا جنون ''ادبیات پونچھ'' پونچھ کے نئے پرانے ادبی ناموں کو اس اہتمام، نفاست اور بصیرت کے ساتھ یکجا کرنے کی سعی قابل ستائش اور غیر معمولی کام ہے۔ اس صبر آزما اور طویل مرحلے سے گذرتے ہوئے انہوں نے انصاف کے تقاضوں کو حتی الامکان ملحوظ رکھا ہے۔

شبنم صاحب کی یوں تو ساری زندگی ہی ہنگامہ خیز گذری ہے۔ خاص کر گذشتہ ایک دہائی جس میں وہ شعر و ادب سے دور رہے ہیں، تاہم ''کوئے یار'' اور ''سوئے دار'' کے مراحل طے کرنے کے بعد اُن کو جو مقام راس آیا ''ادبیات پونچھ'' اسی کا منفرد نتیجہ ہے۔ اس مشقت کا انہیں ثمر ضرور ملے گا۔ ریاست کے ادبی حلقوں میں ان کی اس کاوش کو خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی اس کا مجھے یقین ہے۔

شیخ خالد کرّدآر

Printed at: JK Offset Printers, Jama Masjid Delhi-6.